ہماری ویب ای بُک

محمد فیصل شہزاد

MUHAMMAD FAISAL SHAHZAD

ہماری ویب پر شائع شدہ تحریروں کا مجموعہ

E-BOOK SERVICES

Collection of Published Articles
By "Muhammad Faisal Shahzad"
at Hamariweb.com

جمعرات 11 مارچ صبح دس بجے میں اپنے ڈھائی سالہ بیٹے احمد سدلیس کے پیر کی سرجری کے سلسلے میں عباسی ہسپتال کراچی کے برنس وارڈ میں تھا جب اچانک دور سے آتی ایمبولینسوں کی مکروہ آوازوں نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کروالی۔ یوں تو ہسپتالوں میں ایمبولینسوں کا آنا جانا خلاف معمول بات نہیں، لیکن خلاف معمول وہ سوگوار مجمع تھا جو ایمبولینسوں کے جلو میں ٹراما سینٹر کے ایمرجنسی وارڈ میں کھنچا چلا آیا تھا۔ مجمع کو دیکھ کر یکایک میرے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی اور سارے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ یہ عام مجمع نہیں تھا، پیش منظر بہت واضح تھا.... دل کو کچھ ہونے لگا، یا الٰہی اب کیا ہوا؟ اب کس کے مبارک لہو سے عدو نے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ یکدم نگاہوں میں کئی مبارک ہستیوں کے چہرے گھوم گئے۔ اسی وقت حواس باختہ حافظ ذیشان نظر پڑے جو ہمارے محلے کے ہی ساتھی ہیں۔ انہوں نے مجھے دیکھا تو تیر کی طرح آئے اور گلے لگ گئے۔ "بھائی! حضرت بہت زخمی ہیں اور معاویہ شہید ہوگیا۔" یوں لگا کسی نے زور سے دل پر گھونسا مارا ہو۔ ایک لمحے سے پیشتر میں سمجھ گیا تھا کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے، وہ مولانا عبدالغفور ندیم کو ہی حضرت

کہتا تھا، جو اہلسنت والجماعت کے مرکزی رہنما اور سیکریٹری اطلاعات تھے اور جو ہمارے محلے کی مسجد صدیق اکبر ناگن چورنگی کے ہر دلعزیز امام اور میرے استاد بھی تھے۔

تھوڑی دیر پہلے دل میں آنے والے بدترین اندیشوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔ چند جاں گسل لمحات کے بعد جب بولنے کے قابل ہوا تو اس سے مولانا کی حالت دریافت کی، اس نے اٹکتے ہوئے بتایا کہ حضرت شدید زخمی ہیں اور انہیں لیاقت نیشنل لے جایا گیا ہے جب کہ مولانا کے دو بیٹے جو نسبتاً کم زخمی تھے، انہیں بھی ابھی لیاقت نیشنل لے جایا جا رہا ہے اور مولانا کے چھوٹے صاحبزادے معاویہ ندیم موقع پر ہی شہید ہو گئے ہیں۔ پھر اس کی زبانی تفصیل یہ سامنے آئی کہ مولانا عبدالغفور ندیم اپنے تین صاحبزادوں اور دو ساتھیوں کے ساتھ ہائی کورٹ اپنی پیشی پر تشریف لے جا رہے تھے۔ جب ان کی گاڑی تقریباً نو سوا نو بجے ناظم آباد چھ نمبر سے ذرا آگے پہنچی تو پہلے سے تیار تین موٹر سائیکلوں پر سوار چھ سے زائد بدبختوں نے ان پر شدید فائرنگ شروع کر دی۔ جس سے موٹر سائیکل پر سوار مولانا کے ایک فرزند معاویہ ندیم تو موقع پر ہی جان ہار گئے اور خود مولانا عبدالغفور ندیم، ساتھ موجود دو بیٹے راشد ندیم اور صہیب ندیم اور دو گن مین ندیم اور وصی شدید زخمی ہو گئے۔ بعد ازاں حضرت کی نازک حالت کے پیش نظر ڈاکٹروں نے آئندہ اڑتالیس گھنٹے اہم قرار دے دیے۔ مولانا شوگر اور ہائی بلڈ پریشر کے مریض بھی تھے اور زخمی حالت میں خون ٹیسٹ ہونے پر ان کو ہیپاٹائٹس سی کی تشخیص بھی ہوئی تھی، یہی وجہ تھی کہ

ڈاکٹر زیادہ پر امید نہیں تھے۔

جمعرات کا یہ افسردہ دن ابھی ڈھلا ہی تھا کہ آنے والی رات اپنے جلو میں ایک اور قیامت لیے نازل ہوئی۔ معلوم ہوا کہ اسی رات دس بجے دہشت گردوں نے عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کراچی کے امیر، مولانا محمد یوسف لدھیانوی شہید کے جانشین مولانا سعید احمد جلال پوری، ان کے سولہ سالہ فرزند محمد حذیفہ ، دو شاگرد اور ایک خادم پر شدید فائرنگ کی، جس کے نتیجے میں مولانا، ان کا بیٹا حذیفہ اور ساتھ موجود و علماء موقع پر ہی شہید ہو گئے اور ایک عقیدت مند زخمی ہو گئے تھے۔ بارہ گھنٹوں سے بھی کم وقت میں یہ دوسرا بہت بڑا سانحہ تھا۔ اگلے دن جمعہ کو نماز جمعہ میں جامعہ بنوری ٹاؤن میں حضرت جلال پوری شہید اور باقی شہداء کی نماز جنازہ ہوئی اور اسی دن مسجد صدیق اکبر میں معاویہ ندیم شہید کی بھی نماز جنازہ ہوئی۔

اگلے دو دن عجب کرب میں گزرے۔ جانے والے تو چلے گئے تھے لیکن مولانا عبدالغفور ندیم ہنوز موت وزیست کی کشمکش میں تھے۔ چاہنے والے مسلسل دعاؤں میں لگے رہے لیکن پھر وہی ہوا جو خالق کائنات کو مولانا کے لیے منظور تھا اور جو خود اُن کی بھی زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ شہادت کی خواہش۔ وہ بھلا اپنے پیش رووٴں سے پیچھے کہاں رہ سکتے تھے، انہی سے جا ملے جن کے مشن

کو لیے وہ برسوں سے اپنی ضعیفی اور بیماریوں کے باوجود تن دہی سے مصروف عمل تھے۔ وہ جس قافلے کے مسافر تھے اس قافلے کے اگلے سارے مسافر اسی طرح اپنے لہو میں غسل کرکے منزل مقصود تک پہنچے تھے۔

حضرت جلال پوری کی شہادت کا بھی دل پر بڑا اثر تھا کہ وہ بے شک بہت بڑے بزرگ اور جامع اوصاف کے حامل تھے، لیکن مولانا عبدالغفور ندیم کی شہادت کا سن کر نڈھال ہوگیا جو شاید ان سے قریبی قلبی تعلق کی بنا پر تھا۔ وہ ہماری مسجد صدیق اکبر کی رونق تھے۔ وہ ہمارے امام وخطیب ہونے کے علاوہ مجھ سمیت اکثر اہل محلّہ کے استاد بھی تھے کہ ہم نے ان سے قرآن اور اس کا ترجمہ پڑھا تھا۔

وہ پچھلے کم وبیش اٹھارہ سال سے اس مسجد میں اپنی خطابت سے لوگوں کے دلوں کو گرماتے رہے۔ ہر جمعہ کو ان کا بیان سننے دور دور سے لوگ اہتمام سے آیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر اتوار کو بعد عشاء ان کا درس قرآن اور ہر پیر کو بعد عشاء ان کا درس حدیث بھی احباب میں بہت مشہور تھا۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ حاضرین مجلس میں سے اکثر ماڈرن نوجوان ہوا کرتے تھے جن کی زندگی حضرت کی برکت سے دنوں میں بدل جایا کرتی تھی۔ اللہ نے ان کی زبان میں جو تاثیر رکھی تھی اس کا سب سے بڑا ثبوت خود راقم ہے کہ میں نے چھ سال پہلے

رمضان شریف میں ایسی ہی ایک مجلس میں ان کے بیان میں داڑھی رکھنے کا پکا عزم کیا تھا۔

بوٹا سا قد' مگر انتہائی متناسب چھریرا جسم' خوبصورت گلگوں چہرہ' اوراس پر مولانا کی خوش لباسی.... سفید کاٹن کے کلف لگے سوٹ پر جب جمعہ کے روز سندھی ٹوپی پہنے اپنے حجرے سے جلوہ افروز ہوتے تو کئی نگاہیں جھپکنا بھول جاتیں۔ منبر پر بیٹھتے تو مجمع پر رعب طاری ہو جاتا.... پھر زور دار مگر مدلل انداز میں ایسا پرتاثیر بیان فرماتے کہ اکثر شرکاء توبہ کرکے ہی مسجد سے باہر آتے۔ بیان اکثر فضائل صحابہ پر مبنی ہوتا۔ اور کیوں نہیں ہوتا کہ بچپن سے ہی اصحاب رسول کی محبت ان کے دل میں رچ بس گئی تھی۔

وہ ضلع خانیوال کے ایک گمنام قصبہ سرائے سدھو میں پیدا ہوئے، سند فراغت دارالعلوم کبیر والا سے حاصل کی اور صحابہ سے انتہائی محبت کے باعث 1988ء میں سپاہ صحابہ میں شامل ہوگئے۔ پھر چند سال بعد ہی تحفظ ناموس صحابہ کا مشن لیے کراچی چلے آئے۔ پہلے کچھ عرصہ ملیر بیت المکرم مسجد میں رہے۔ ان دنوں مولانا اعظم طارق شہید مسجد صدیق اکبر میں امامت وخطابت کے فرائض انجام دیتے تھے لیکن جب آپ کو جھنگ تشریف لے جانا پڑا تو اپنے پیچھے مولانا عبدالغفور ندیم کو صدیق اکبر مسجد میں اپنا نائب مقرر کر گئے اور مولانا نے

بھی نیابت کا حق ادا کر دیا۔ ان کی بے شمار خوبیوں میں سے ایک خوبی کا ذکر اہتمام سے کرنا چاہتا ہوں جو بہت کم جگہ میں نے دیکھی، وہ ہے حضرت لدھیانوی کی طرح دین کے تمام کام کرنے والوں پر یکساں شفقت کا معاملہ کرنا اور وسعت قلبی کا مظاہرہ کرنا۔ شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بندہ ان کے قریب ہوا.... مثلاً ان کی مسجد صدیق اکبر میں دعوت و تبلیغ کا کام بہت عروج پر ہے اور ظاہر ہے، مولانا کی سرپرستی کے بغیر یہ بہت مشکل تھا۔ غرض سب پر بہت شفقت فرمایا کرتے تھے۔

بہر حال دشمنوں نے انہیں ہم سے چھین لیا۔ وہ اپنے احباب، اہل محلّہ بلکہ اہل شہر میں کتنے مقبول تھے اس کا اندازہ ان کے جنازے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ بلا مبالغہ ہزاروں عقیدت مندوں کے جلو میں انہیں سپرد خاک کیا گیا۔ نماز جنازہ امیر.... حضرت مولانا احمد لدھیانوی مدظلہ نے پڑھائی اور تدفین مسجد صدیق اکبر کے ہی بغلی صحن میں ہوئی۔ قابل ذکر بات یہ تھی کہ حضرت ممدوح کی مظلومانہ شہادت اور ان سے انتہائی عقیدت رکھنے کے باوجود کسی قسم کی بدامنی اور اشتعال انگیزی نہیں ہوئی۔ بار بار سب کو پرامن رہنے کی تلقین کی جاتی رہی۔ جس سے اندیشوں کے برعکس فضا پرسکون رہی۔

ہم سمجھتے ہیں کہ حکومت سے شہداء کے قاتلوں کا مطالبہ کرنا کارِ عبث ہی ہے۔

اللہ خود ہی ان بد بختوں کو عبرت کا نشاں بنائیں گے۔ اسلام کی سربلندی، ناموس رسالت اور ناموس صحابہ کی حفاظت کی خاطر ان شہیدانِ ناموس رسالت و صحابہ نے اپنے خون کا نذرانہ پیش کرکے ایک بار پھر چمن اسلام کی آبیاری کی ہے۔ یہ خوش قسمت لوگ ہمارے ماتھے کا جھومر تھے اور رہیں گے۔ فردوس بریں بازو پھیلائے محبوب کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان محبوبوں کی منتظر ہے۔ حور و غلمان ایسے ہی قدسیوں کی راہ تکتے ہیں۔ انشاء اللہ ان حضرات کی قربانیاں ضرور رنگ لائیں گی

ہم نے رسمِ محبت کو زندہ کیا، زخم دل جیت کر نقدِ جاں ہار کر
ہم سے بزمِ شہادت کو رونق ملی، جانے کتنی تمناؤں کو مار کر
کچھ نے دعوے محبت کے کیے اور متاعِ دل وجاں بچالے گئے
کوئی لایا دلیلِ محبت مگر خون کی ایک اک بوند کو وار کر

اصلی اور نقلی شہد کی پہچان

ہمارے ملک میں اصلی شہد ایک پراسرار سی شے بن چکی ہے۔ نہ جانے کیوں لوگوں کو یقین نہیں آتا کہ اصلی شہد بھی مل سکتا ہے۔ دراصل شہری علاقوں کے رہنے والوں کے دماغ میں یہ بات بیٹھی ہوئی ہے کہ اصلی شہد کا حصول بہت مشکل ہے اور اگر مل بھی جائے تو وہ بہت مہنگا اور کم ہوتا ہے۔ اس لیے جب کہیں شہد بڑی مقدار میں دیکھتے ہیں تو انہیں یہ یقین کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے کہ یہ سارا شہد واقعی اصلی ہے۔ ایسے لوگوں کی خدمت میں عرض ہے کہ ان کے خیالات کے برعکس دنیا بھر میں شہد کی سالانہ پیداوار بہت زیادہ ہے۔ ڈاکٹر خالد غزنوی صاحب اپنی صدارتی ایوارڈ یافتہ کتاب 'طب نبوی' کے باب شہد میں رقم طراز ہیں کہ "اندازہ لگایا گیا ہے کہ آج کل دنیا میں ہر سال پچاس کروڑ کلو سالانہ شہد پیدا ہوتا ہے۔" یاد رہے کہ ان کی یہ تحریر پچیس سال پرانی ہے جب کہ آج جدید تحقیق کے مطابق شہد کی سالانہ پیداوار اس مقدار سے کئی گنا زیادہ ہے۔ ملک عزیز پاکستان میں ہر سال کئی ہزار ٹن شہد پیدا ہوتا ہے جس کی بڑی مقدار یورپ اور بیرون ملک ایکسپورٹ کی جاتی ہے۔

شہد کے متعلق غلط فہمیاں

شہد کا جم جانا:

اصلی شہد کے متعلق عوام الناس کے ذہنوں میں کئی غلط فہمیاں موجود ہیں، جو دراصل شہد کے بارے میں صحیح علم کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ پہلی بڑی غلط فہمی لوگوں کو شہد کے متعلق یہ ہے کہ اصلی شہد کبھی جمتا نہیں ہے۔ جب کہ درحقیقت شہد کا جم جانا ایک سردی کے اثر سے جلد منجمد ہو جاتی (Glucose) فطری عمل ہے۔ دراصل انگوری شکر ہے اس لیے جس شہد میں انگوری شکر کی مقدار زیادہ ہوگی وہ جلدی منجمد ہو جاتا ہے زیادہ ہوگی وہ کافی عرصہ تک مائع (Lactose) جب کہ جس شہد میں پھلوں کی شکر ہوا کے بلبلے اور ،(Pollen) حالت میں رہتا ہے۔ اس کے علاوہ شہد میں موجود زرگل موم کے ذرات بھی شہد کے جمنے کا باعث ہوتے ہیں۔ نیز جس شہد میں پھلوں کی شکر کا تناسب زیادہ ہوتا ہے، وہ جمنے کے بعد گھی یا جمے ہوئے ناریل کے تیل کی طرح ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح جس شہد میں انگوری شکر کا تناسب زیادہ ہوتا ہے تو وہ جم کر دانے دار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح جس شہد میں گنے کی شکر کا تناسب زیادہ ہوتا ہے تو وہ جم کر قلمی شکر اختیار کر لیتا ہے اور بالکل سادہ شکر جیسا محسوس ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ لوگ شہد کے قلمی شکل میں جمنے پر غلط فہمی کا شکار ہو جاتے ہیں کیوں کہ وہ ناواقفیت کی بنا پر اُسے چینی کی ملاوٹ والا سمجھتے ہیں۔

E.P اس سلسلے میں نیویارک سے شائع شدہ انسائیکلوپیڈیا آف بی کیپنگ کے رائٹر Dutton اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ شہد مختلف شکروں کا گاڑھا محلول ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ شہد میں پانی کا جو تناسب ہوتا ہے اس کے مقابلے میں اس میں شامل قدرتی گلوکوز کی مقدار اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ وہ اس پانی میں حل نہیں ہو سکتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ شکریات پانی کی قید سے آزاد ہو کر جمی ہوئی قلمی شکر میں نمودار ہو جاتی ہیں، اسے ہم شہد کا جمنا کہتے ہیں۔

جما ہوا دانے دار شہد (Granulated Honey) کہلاتا ہے۔ یہ پگھلے ہوئے شہد کی بہ نسبت زیادہ صحت بخش اور توانائی سے بھرپور ہوتا ہے۔ اور اس میں (H.M.F) ہائیڈروکسی میتھائل فرفل ڈی ہائیڈ کا عنصر بھی کم ہوتا ہے۔ یہ ایک ایسا عنصر ہے جو ابھی حال ہی میں دریافت ہوا ہے اور یہ ہر شہد میں 1% لازمی ہوتا ہے۔ امریکن اسٹینڈرڈ کے مطابق جس شہد میں یہ عنصر 3% سے زیادہ ہو تو شہد کا معیار متاثر ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے کئی ممالک میں جما ہوا شہد زیادہ پسند کیا جاتا ہے۔

ایک اور مسئلہ جمے ہوئے شہد کی رنگت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ دراصل ہوتا یہ ہے کہ جمنے کے بعد شہد کی رنگت تبدیل ہو جاتی ہے مثلاً جمنے سے پہلے شہد براؤن کلر کا تھا تو جمنے کے بعد کریم کلر کا ہو جاتا ہے۔ اگر جمنے سے پہلے گولڈن

کلر کا تھا تو جمنے کے بعد سفید رنگ کا دکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو کر اسے چینی کا سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر جمے ہوئے شہد کو گرم کیا جائے تو وہ پگھل کر دوبارہ اپنی پرانی رنگت میں آجاتا ہے۔

ہمارے ملک میں عموماً سرسوں، بکیڑ اور پھلائی کے پھولوں کا شہد بہت بڑی مقدار میں حاصل ہوتا ہے اور بالعموم ان ہی پھولوں کا شہد مارکیٹ میں فروخت کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ اور در حقیقت سرسوں کا شہد تقریباً دو ماہ میں، بیکڑ چار ماہ میں اور پھلائی کا شہد آٹھ ماہ میں جم جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں بیری، شفتل اور مالٹے کے پھولوں سے حاصل شدہ شہد نسبتاً کافی عرصہ تک نہیں جمتا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ بیرون ملک سے درآمد شدہ تقریباً تمام شہد مصنوعی پراسیس سے گزارے جاتے ہیں، اسی وجہ سے یہ امپورٹڈ شہد نہیں جمتے۔

مشکل یہ ہے کہ نقلی اور اصلی شہد دونوں جم جاتے ہیں اور عوام کے لیے یہ تمیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ جو شہد جما ہوا ہے وہ اصلی ہے یا نقلی؟ تو قارئین یاد رکھیں کہ اصلی شہد کی پہچان یہ ہے کہ وہ ہمیشہ تہہ کی جانب سے جمنا شروع ہوتا ہے۔ اگر شہد اوپر کی جانب سے جمنا شروع ہو تو وہ نقلی یا ملاوٹ شدہ ہوتا ہے۔

شہد کی پہچان کے معروف فرسودہ طریقہ کار:

ڈاکٹر خالد غزنوی اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ لوگوں نے شہد کی پہچان کے کئی طریقے مشہور کیے ہوئے ہیں لیکن اس میں سے اکثر مستند نہیں ہیں۔ مثلاً ایک طریقہ اصلی شہد کی پہچان کے لیے یہ معروف ہے کہ ایک نمک کی ڈلی شہد میں ملاتے ہیں اگر شہد نمکین ہو جائے تو کہتے ہیں کہ شہد ملاوٹ والا ہے کیوں کہ ان کے خیال کے مطابق خالص شہد میں نمک حل نہیں ہوتا۔ یہ طریقہ یکسر تو غلط نہیں ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ شہد میں پچیس فی صد پانی بھی ہوتا ہے جس میں نمک حل ہو سکتا ہے۔ اس لیے یہ کوئی کنفرم بات نہیں ہے کہ ذائقہ نمکین ہونے پر شہد خالص نہیں ہو سکتا۔

اسی طرح کہتے ہیں کہ خالص شہد روٹی پر لگا کر کتے کو کھلایا جائے تو کتا اسے نہیں کھاتا کیوں کہ مشہور ہے کہ کتا شہد نہیں کھاتا لیکن شیرہ کھا لیتا ہے۔ یہ بھی اصلی نقلی کے پہچان کا کوئی معیار نہیں ہے کیوں کہ ہو سکتا ہے کہ کتا کسی وقت کھانے کے موڈ میں ہی نہ ہو، جس کی وجہ سے نقلی شہد کو اصلی سمجھ لیا جائے۔

ہماری تحقیق کے مطابق شہد کی پہچان کے جو ٹیسٹ کتابوں میں لکھے ہیں، ان سب میں کوئی نہ کوئی ایسی کمی ہے جن کی وجہ سے اصلی نقلی کا سو فی صد فیصلہ

نہیں کیا جا سکتا۔ کیوں کہ اکثر ان طریقوں پر عمل کرنے سے اپنے سامنے درخت سے اتارے ہوئے خالص شہد بھی فیل ہو جاتے ہیں اور اکثر شیرے سے تیار شدہ نقلی شہد پاس ہو جاتا ہے۔ دراصل ہوتا یوں ہے کہ نقلی اور اصلی شہد کی بعض خصوصیات ایک جیسی ہوتی ہیں مثلاً پندرہ سے بیس فی صد تک پانی کا تناسب اور ستر فی صد مختلف قسم کے گلوکوز وغیرہ.... یہی وجہ ہے کہ طریقے کی خامی کی وجہ سے نتیجہ اکثر کچھ کا کچھ نکلتا ہے۔

:شہد کی پہچان کے مستند طریقے

اصلی شہد کی پہچان کے لیے ہم چند آسان ٹپس اور ایک مستند طریقہ درج کر رہے ہیں، انشاء اللہ اس سے بہت فائدہ ہو گا۔

:☆ دیکھ کر چیک کرنا

قدرتی شہد نقلی شہد کی بہ نسبت زیادہ پتلا اور دھندلا ہوتا ہے اور پولن کے ذرات شہد کی سطح پر نظر آتے ہیں۔

:☆سونگھ کر چیک کرنا

ہر شہد کی اپنی الگ خوشبو ہوتی ہے جو پھولوں کی بھینی بھینی مہک سے مہک رہا ہوتا ہے، جب کہ شیرے اور گلوکوز سے تیار شدہ شہد سونگھنے پر صاف پتہ چل جاتا

ہے کہ یہ شیرہ ہے۔

:☆شہد کو چکھ کر چیک کرنا

ہر علاقہ کا شہد اپنا ایک مخصوص ذائقہ رکھتا ہے، کبھی بھی ایک علاقے کا شہد دوسرے علاقے کے شہد جیسا نہیں ہوگا چاہے کسی ایک مخصوص پھول کے باغات سے حاصل شدہ ہی کیوں نہ ہو۔ مثلاً اجوائن، مالٹے اور سرسوں کا شہد یاد رکھیں۔ شہد کا ذائقہ موسمی درختوں، پھلوں، پھولوں علاقوں کے حساب سے تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اگر کسی کمپنی کا شہد ہمیشہ ایک جیسی رنگت، خوشبو اور ذائقہ والا ہو تو سمجھ لیں کہ یہ قدرتی نہیں ہے بلکہ فارمولے کے تحت شدہ ہے۔ یاد رکھیں کہ شہد کی مکھی کو جس موسم کے پھولوں کا رس یعنی غذا ملے گی ویسے ہی اس کا ذائقہ ہوگا۔

:☆شہد کا پتلا ہو جانا

قدرتی شہد میں ایک خاص طرح کا سسٹم ہوتا ہے جسے اوسموٹک پریشر کہا جاتا ہے۔ اس پریشر کے تحت شہد ہوا میں موجود نمی کو جذب کر لیتا ہے۔ ایک کھلے منہ کی بوتل میں تقریباً پچیس گرام (۲ چمچ) شہد رکھ کر چند دنوں کے لیے چھوڑ دیں، اگر شہد اصلی ہوا تو پتلا ہو جائے گا اور نقلی ہو تو سطح پر خشک ہو جائے گا اور ایک باریک جھلی سطح پر آ جائے گی۔

:خالص شہد کو چیک کرنے کا جدید ترین طریقہ

ہم نے قدرتی اور نقلی شہد کو چیک کرنے کا سہل ترین اور جدید سائنٹفک طریقہ ایجاد کیا ہے جو آپ کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ اس ٹیسٹ کے لیے مندرجہ ذیل سامان کی ضرورت ہوتی ہے۔

میتھائیل اسپرٹ۔ (۲) ٹیسٹ ٹیوب کیپ کے ساتھ (۳) شہد کا نمونہ (۱)

ٹیسٹ ٹیوب میں پانچ گرام میتھائیل اسپرٹ اور پانچ گرام شہد لے کر زور سے ہلانا شروع کر دیں۔ اگر شہد اصلی ہو گا تو فوراً حل ہو جائے گا اور دودھیا کلر کے جھاگ سے بن جائیں گے اور اگر نقلی ہوا اور بالخصوص لیکوئڈ گلوکوز کی ملاوٹ والا شہد ہوا تو بہت مشکل سے حل ہو گا۔ اب ٹیسٹ ٹیوب کو لگا کر چھوڑ دیں۔ تین سے سات دن کے بعد چیک کریں، اگر اصلی شہد ہوا تو اس کی سطح پر شکری روغنیات (Mucilage) آ جائے گی، جو کہ دیکھنے میں بالکل بادل کی طرح محسوس ہو گی۔ اگر شہد نقلی ہوا تو سطح بالکل صاف ہو گی اور جو شہد مکس کیا گیا تھا وہ دوبارہ تہہ میں بیٹھا ہوا دکھائی دے گا۔ جب کہ اصلی شہد مکمل طور پر حل ہو چکا ہو گا۔

دارالعلوم صفّہ کے قرآنی کمپیوٹرز

آپ کسی ایسے بچے کا تصور کریں کہ وہ قرآنِ مجید کا حافظ ہو اور آپ اس سے یہ سوال کریں کہ فلاں سورۃ کی آیت نمبر فلاں سنائے تو وہ بچہ بغیر کوئی وقت ضائع کیے کمپیوٹر جیسی تیزی کے ساتھ نہ صرف آپ کو وہ آیت سنا دے بلکہ یہ بھی بتائے کہ وہ کونسی منزل میں ہے اور اس منزل میں کتنے سپارے، رکوع، صفحات اور سورتیں ہیں اور پھر اس مطلوبہ سورۃ میں کتنی آیات، کلمات اور حروف ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی کہ سورہ مکی ہے یا مدنی، یقیناً آپ کو حیرت ہوگی کہ کیا ایسا ممکن ہے اور آپ کو حیرت زدہ ہونا بھی چاہیے کہ ایسا ممکن ہے۔ حیرت کا اظہار اس لیے بھی زیادہ ہو کہ اس بچہ یا بچوں میں یہ صلاحیت پیدائشی نہ ہو بلکہ انہوں نے یہ مہارت اللہ کے فضل، اپنی محنت اور اساتذہ کی شفقت سے حفظ کرنے کے بعد حاصل کی ہے۔ یہی حیرت ہمیں کراچی کی ایک دور دراز بستی سعید آباد بلدیہ ٹاؤن کے مدرسہ دارالعلوم صفہ لے گئی جہاں ہم نے قرآن کمپیوٹر کہلانے والے طلبہ اور مدرسہ کے مہتمم کے اعلیٰ جناب قاری حق نواز صاحب، ان کے صاحبزادوں مفتی زبیر (منتظم اعلیٰ) اور مفتی محمد شعیب (استاذ و منتظم شعبہ قرآن) سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔

کچھ عرصہ پہلے مولانا اسلم شیخوپوری صاحب کے مضمون میں ان بچوں کا ذکر پڑھ کر ہمیں خوشگوار حیرت ہوئی تو اس وقت ہی ان بچوں سے ملاقات کے لیے بے چین ہو گئے لیکن رمضان المبارک اور مدارس کی چھٹیوں کے سبب تاخیر ہو گئی۔ قاری حق نواز صاحب نے اپنے صاحبزادے اور شعبہ قرآن کے منتظم سے ہمارے تعارف کے بعد کہا کہ انہیں دارالعلوم کا وزٹ کرائیں نوجوان مفتی شعیب صاحب نے ہمیں وقت کی کمی کے باعث مختصر تاہم جامع دورہ کروایا۔ جہاں خاص طور پر شعبہ حفظ و ناظرہ کے طلبہ اور اساتذہ کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا اور بغیر کسی ڈنڈے یا سختی کے طلبہ کو مکمل یکسوئی کے ساتھ حفظ کرتے دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔

شعیب صاحب نے بتایا کہ اس سال 2100 درخواستیں حفظ کے لیے موصول ہوئیں لیکن سخت طریقہ انتخاب اور معیار کی وجہ سے صرف 140 طلباء کو پہلے مرحلے میں تین ماہ کے ٹرائل پر داخلہ دیا گیا ہے۔ اگر طلبہ شوق اور یکسوئی کے ساتھ مطلوبہ معیار پر پورا اترے تو ٹھیک ورنہ داخلہ خارج.... کچھ عرصہ پہلے جنید جمشید ان بچوں کا سن کر یہاں آئے تو ان کے پاس قرآنی سوفٹ ویئر موجود تھا جس میں آیت نمبر ڈالنے پر وہ اس آیت کی پوری تفصیل بتاتا تھا۔ انھوں نے ایک آیت اس میں لکھی اور وہی آیت ایک بچے سے پوچھی، موبائل کے سرچ کرنے سے پہلے ہی وہ بچہ وہ تمام تر تفصیل کے ساتھ بتا چکا تھا جس پر وہ بھی حیرت زدہ رہ گئے۔

اس سلسلے کا آغاز کیسے ہوا؟ اس سوال کے جواب میں مفتی شعیب صاحب نے ایک دلچسپ بات بتائی کہ ہمارے ایک استاد نے امتحان کے دوران شعبہ بنات کی ایک طالبہ سے ایک سوال پوچھا تو اس نے متعلقہ جواب کے ساتھ روانی سے دیگر تفصیل بھی بتا دی، جس پر بعد میں مشورے کے بعد ایک ہونہار طالب علم اسد اللہ کو ان کے استاد نے راغب کیا اور پوچھا کہ کیا وہ ایسے کر سکتا ہے تو اس نے جواب دیا بالکل۔ چنانچہ اس طرح اساتذہ کی سرپرستی سے اسد اللہ نے ایک ایسے راستے پر قدم رکھا جو اسے ایک ایسی منفرد منزل تک لے گیا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے اسد اللہ کے ساتھ اس مختصر کارواں میں محمد احسن، امیر حمزہ، عبدالحمید اور محمد بلال بھی شامل ہیں، مذکورہ طلبہ سے ہماری ملاقات دارالعلوم صفہ کی لائبریری میں کروائی گئی اور مکمل آزادی کے ساتھ ان سے سوالات اور بات چیت کرنے کا موقع فراہم کیا گیا۔ بات چیت کے دوران پتا چلا کہ تمام طلبہ نے دو سال میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا اور اب قرآنی معلومات پر مہارت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اپنا پورا وقت مدرسہ کو دیتے ہوئے میٹرک کی تیاری بھی کر رہے ہیں، مفتی شعیب صاحب نے یہ انکشاف کرکے ہمیں مزید حیران کر دیا کہ کراچی کے ایک مشہور نجی ہسپتال میں طالب علم عبدالحمید (جو ہمارے سامنے موجود تھے) کی ناک کا آپریشن تھا۔ آپریشن کے بعد جب ڈاکٹر باہر آئے تو انہوں نے بتایا کہ دوران آپریشن بے ہوشی کی حالت میں مذکورہ طالب علم بائیسویں اور تیئسویں پارے کی تلاوت کر رہا ہے۔

طلبہ کے والدین کے بقول رات کو آنکھ کھلے تو یہ قرآن مجید کھولے مزید غور و خوض کرتے نظر آتے ہیں، 14 سالہ طالب علم اسد اللہ سے، جو عالم اور مفتی بننے کے خواہش مند ہیں ہم نے سوالات کی ابتداء کی۔ ان سے پوچھا کہ پارہ نمبر اکیس کا نصف کونسی سورہ کی کونسی آیت پر ہوتا ہے؟ تو بغیر توقف کے ان کی طرف سے جواب آیا سورۃ لقمان آیت نمبر 19، دوسرا سوال تھا کہ کونسی سورہ الف سے شروع ہو کر ب پر ختم ہوتی ہے، فوراً جواب آیا سورۃ الرعد پارہ نمبر 13، بلاشبہ ہماری ملاقات کا مقصد ان کا امتحان لینا نہیں تھا کیونکہ بڑے نامور علماء اور مفتیان کرام اور سینکڑوں لوگوں کے سامنے وہ اپنی اس صلاحیت کو منوا چکے ہیں۔ صرف قارئین کی دلچسپی کی خاطر ہم نے کچھ سوالات کیے۔

سالہ بلال سے ہم نے سوال کیا وہ کونسی آیت ہے جس میں لفظ اللہ ایک ہی ساتھ 10 دو مرتبہ آیا تو حیرت انگیز طور پر انہوں نے تمام تر تفصیلات کے ساتھ بتایا کہ پارہ نمبر 8، سورۃ الانعام آیت نمبر 124 اور فوراً وہ آیت تلاوت کی۔

سالہ امیر حمزہ سے سوال کیا گیا کہ سورۃ بنی اسرائیل کا ساتواں رکوع کونسی آیت 11 نمبر پر ختم ہوتا ہے؟ سوال پورا ہوتے ہی جواب موجود تھا" آیت

نمبر 70 سورہ نمبر 17 سپارہ نمبر 15 کل آیات 111 اور رکوع کی تعداد 12 "اور ساتھ ہی وہ آیت بھی تلاوت فرمائی۔

محمد احسن سے سوال پوچھا گیا کہ سورۃ ھُود کون سے پاروں میں ہے اور کتنی آیات ہیں؟ شیطان سے پناہ مانگتے اور اللہ کے نام سے شروع کرکے انہوں نے فوراً جواب دیا: " سورۃ ھُود کی کل 123 آیات ہیں، 5 آیات پارہ نمبر 11 اور بقیہ 118 پارہ نمبر 12 میں ہیں۔" ہم اپنی حیرتوں کو سمیٹتے اور ان طلبہ اور اساتذہ کی خوش بختی پر رشک کرتے رہے۔

عبدالحمید نامی طالب علم جن کا آپریشن کے حوالے سے اوپر ذکر کیا گیا تھا، شاید اپنے سوال کے منتظر تھے، ان نے سوال پوچھا "بتایئے قرآن کریم میں کتنے مقامات پر لفظ ذال "کے اوپر دو پیش آئے ہیں؟

روایت کو برقرار رکھتے ہوئے عبدالحمید نے فوراً جواب دیا۔ "صرف ایک دفعہ اور "ساتھ ہی آیت تلاوت کی اور مزید بتایا کہ سورۃ ھُود آیت نمبر 56 پارہ نمبر 12۔

اچانک اسد اللہ سے ہم نے سوال پوچھ لیا، بتائیں:

"وکم من ملک فی السموٰتکے بعد والارضِ ہے یا والارضَ"

انہوں نے ایک لمحہ سوچے بغیر بتایا کہ نہ تو ولارضِ ہے اور نہ ولارضَ۔ (واضح رہے کہ (یہ واحد آیت ہے جس میں فی السمٰوت کے بعد ولارض نہیں آتا

بچوں کی قرآنی مہارت کا سن کر گوجرانوالہ سے ایک صاحب آئے تھے، انہوں نے سورۃ رحمٰن کو الٹا (آخری آیت سے پہلی آیت کی طرف) سننے کی فرمائش کی اور یہ شرط بھی رکھی کہ (فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ) کو نہیں پڑھنا۔ یہ یہی سوال جب ہم نے پوچھا تو اسد اللہ نے بغیر کسی جھجک کہ فوراً بسم اللہ پڑھ کر سورہ رحمٰن کی آخری آیت کی تلاوت کی اور (فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ) چھوڑتے ہوئے آیت نمبر 74،76، 72 تلاوت کرتے ہوئے ہمیں حیران کر دیا۔

ہمیں قرآن مجید دیا گیا اور کہا گیا کہ جہاں سے مرضی ہے کھولیں اور جو پوچھنا ہے پوچھیں قرآن کھولا تو سورہ نور سامنے تھی ہم اسد اللہ سے سورہ نور کی آیت 61 سنانے کو کہا۔ بسم اللہ پڑھ کر وہ بولے منزل نمبر 4 میں سوا چار پارے نو سو تین آیات، 70 رکوع، صفحہ اور 9 سورتیں ہیں۔ اس منزل میں 7 سورت مکی اور 2 سورت مدنی ہیں۔ 76 پارہ نمبر 18 میں 202 آیات، 17 رکوع 18 صفحہ اور 3 سورتیں ہیں اس پارے کی دو سورت مکی اور 1 سورت مدنی ہے۔ سورۃ نور مدنی

سورۃ ہے اس سورۃ میں 64 آیات 9 رکوع 142 کلمات، 641 حروف ہیں، رکوع
نمبر 8 میں 4آیات ہیں۔ آیت نمبر61، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم اور اس کے بعد انہوں
نے آیت نمبر61 کی تلاوت فرمائی ابھی انہوں نے آیت نمبر 61 مکمل نہیں کی تھی کہ
مفتی شعیب صاحب نے کہا آیت نمبر 60 سنائیں۔ انہوں نے فوراً کمپیوٹر جیسی مہارت
کے ساتھ آیت نمبر 60 سنانی شروع کردی ابھی آیت جاری تھی کہ انہوں نے کہا
آیت 59 سنائیں اور اسد اللہ نے آیت نمبر 59 کی تلاوت شروع کردی۔

سبحان اللہ! یہ ثبوت تھا اس بات کا کہ یہ بچے واقعی قرآنی کمپیوٹر ہیں۔ اللہ تبارک
وتعالٰی ان بچوں کے والدین اور اساتذہ کو جزائے خیر دے جنھوں نے ان بچوں پر ایسی
محنت کی کہ بلاشبہ اسلام کی حقانیت کو ثابت کرنے کے لیے غیروں کے سامنے ان بچوں
کو فخر کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔

کینسر زدہ پاکستان

اس سال پاکستان اپنی عمر کے تیرسٹھویں سال میں ہے۔ اور ذرا بھی مبالغہ نہ ہوگا اگر یہ کہا جائے کہ اس وقت پاکستان اپنی تریسٹھ سالہ زندگی کے سب سے بدترین حالات سے گزر رہا ہے۔ بڑھاپے والے سارے عوارض اس کو چمٹ چکے ہیں۔ اِس کے بوڑھے وجود کے اندر جھانکیں تو معلوم ہوگا کہ سارے نظام درہم برہم ہو چکے ہیں، تعمیر و ترقی تو عرصہ ہوا 'ہوّا ہو چکی' اب تو ہر سمت صرف تخریب کا دور دورہ ہے۔ اس کے انفیکشن زدہ وجود میں دشمن آرام سے دندناتے پھر رہے ہیں اور اس کی بے پناہ دفاعی صلاحیت بجائے دشمنوں کو مارنے کے اپنے ہی وجود کے درپے ہو چکی ہے۔ اس کے کئی حصے کینسر زدہ بھی ہو چکے ہیں، جو آکٹوپس کی طرح تیزی سے پورے وجود کو جکڑ رہے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی ریاست کی ساٹھ سالہ عمر کچھ بڑی نہیں، یہ تو ریاست کی جوانی کا دور ہوتا ہے۔ آخر دنیا میں اور بھی تو کتنے ہی ملک ہیں جو دو تین سو سال سے قائم ہیں، اور اُن کے وجود کو کوئی بڑا خطرہ نہیں.... پھر ہمارے ساتھ ہی ایسا کیوں ہے کہ کوئی ہمارے ملک کے ٹوٹنے کے لیے چھ مہینے کی ڈیڈ لائن دے رہا ہے تو کوئی دو سال کی پیشگوئی کر رہا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ

ہم خود اپنے وطن سے مخلص نہیں.... ہماری اپنی صفوں میں اتحاد نہیں....ہماری اپنی نیت میں کھوٹ ہے.... ہم میں سے جسے جب موقع ملا اس نے بہتی گنگا میں خوب اشنان کیا.... کسی نے اپنی ذات سے ہٹ کر دوسروں کے لیے اپنی زمین کے لیے کچھ نہیں سوچا.... یہی وجہ ہے کہ آج ہم بے سر و ساماں ساری دنیا میں ایک مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ ہمیں کچھ ملا نہیں.... نہیں دینے والے نے تو ہمیں اتنا اور ایسا دیا کہ کسی اور کو ملا ہوتا تو وہ اب تک جانے کہاں پہنچ چکا ہوتا.... ہمیں آزادی کی نعمت ملی....ہم پر پانی برسایا گیا، چمکیلی دھوپ تقسیم کی گئی، یہاں بہترین موسم اور زرخیز زمینیں عطا کی گئیں.... غرض بے شمار نعمتیں ہمیں ایسی دی گئیں، جو دوسروں کو بالکل نہیں ملیں یا بہت کم ملیں۔ ایک نظر ان نعمتوں پر ڈالتے چلیے جو اللہ رب العزت نے محض اپنے فضل کی وجہ سے ہمیں عنایت کیں۔

☆پاکستان میں تین سو ملین ٹن پر مشتمل کھیوڑہ سالٹ مائینز دنیا کا سب سے بڑا ذخیرہ نمک ہے جو آنے والے چھ سو سال کی ضرورتوں کے لیے کافی ہے۔

☆چار سو بلین بیرل تیل کے برابر اور تقریباً آٹھ سو پچاس ٹریلین کیوبک فٹ پر مشتمل کوئلے کے ذخائر، دنیا کے دوسرے بڑے ذخیرے کے طور پر پاک سرزمین کے سینے میں دفن ہیں۔

☆پاکستان دنیا کا چوتھا بڑا کاٹن پروڈیوسر ملک ہے اور تیسرا بڑا کاٹن

کنزیومر بھی ہے۔
☆پاکستان مین تانبے اور سونے کے دنیاکے پانچواں بڑا عالمی ذخیرہ موجود ہے۔ "ری کوڈک" کے مقام پر ان کی دریافت ہو چکی ہے۔ جسے "ٹینٹو فاگسٹا" اور "بیریکس" جیسے اداروں نے "Giant Copper and Gold" Project قرار دیا ہے۔ یہ ذخیرہ ایران کے سرچشمہ پراجیکٹ سے بھی بڑا ہے۔ سینڈک پراجیکٹ اس کے علاوہ ہے۔
☆پاکستان اسلامی دنیا کا پہلا اور گلوبل ویلج کی ساتویں ایٹمی طاقت ہے۔
☆پاکستان کے پاس دنیا کی بڑی چوٹیوں میں سے سات بڑی چوٹیاں ہیں، قطبین کو چھوڑ کر سب سے بڑا گلیشیر ہے، اور دنیا کے خوبصورت ترین علاقے ہیں۔
☆سرسبز پاکستان دنیا کا پانچواں بڑا دودھ پروڈیوسر ملک ہے اور پاکستان دنیا بھر میں گندم پیدا کرنے والے ممالک میں گیارھویں نمبر میں آتا ہے اس کے علاوہ دنیا بھر میں چاول پیدا کرنے والے کامیاب ترین ملکوں میں پاکستان کا نمبر بارھواں ہے۔
یہ اللہ کے وہ انعامات ہیں، جن میں ہماری محنت اور صلاحیتوں کا کچھ حصہ نہیں.... یہ صرف اس مالک الملک کی فیاضی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وقت کسی کو اتنی رعایت نہیں دیتا جتنا اس ملک اور اس کے لوگوں کو دی گئ، مگر ہم نے سارا وقت گیتوں میں مست رہنے میں ناچنے کودنے، کھانے اور کھیلنے میں گزار

دیا۔ اس لیے اب ہم کسی اور رعایت کی امید نہ رکھیں۔ ملک پر نزع کا عالم طاری ہے یہ وقت ہاتھ سے نکلنے کے آثار ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اچانک ہی ہماری طنابیں کھینچ دی گئیں، بلکہ کبھی زلزلے کے ذریعے سے تو کبھی کسی اور ذریعے سے ہمیں بار بار تنبیہ کی جاتی رہی مگر ہم خوبصورت موسموں میں بیٹھ کر اپنے شاندار ماضی کے گیت گاتے رہے اور ایک دوسرے سے الجھتے رہے۔

اس لیے اگر ہمت باقی ہے تو جاتے وقت کو کسی طور گرفت میں لے آیئے ورنہ زمین نیچے سے کھسکنے کو ہے اور خلا میں پناہ گاہوں کا ابھی رواج نہیں ہوا.... اب بھی اگر ہم سنجیدہ ہو جائیں تو بہت کچھ بچا سکتے ہیں، اپنا وطن، اپنی آزادی، اور سب سے بڑھ کر اپنی عزت .... اور اس کے لیے کچھ زیادہ کرنے کی ضرورت بھی نہیں، سب سے پہلی ضرورت نیتوں کی درستگی ہے۔ ہماری نیت کا کھوٹ دور ہو جائے اور توبہ استغفار اور رجوع الی اللہ کے ذریعے ہم اپنے رب سے اپنا ٹوٹا تعلق جوڑ کر اللہ تعالیٰ کی نصرت اپنے ساتھ لے لیں تو حالات برعکس بھی ہو سکتے ہیں۔ بے شک بدترین حالات اپنی جگہ، گوناگوں امراض اپنی جگہ، باہر سے دشمنوں کی یلغار بھی تسلیم .... لیکن ایک خوش آئند بات یہ ہے کہ ابھی پاکستان کے وجود میں تازہ خون بننا بند نہیں ہوا۔ تازہ اور جوان خون اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ اس کا بہاؤ صحیح ہو جائے تو یہ وجود کے کونے کھدرے میں چھپا سارا فساد سمیٹ کر باہر پھینک دیتا ہے اور وجود میں ایک نئی

روح پھونک دیتا ہے۔ بس ضرورت اس جوان خون کی درست سمت میں رہنمائی کی ہے، پھر انشاء اللہ یہ اپنی راہیں خود متعین کرے گا۔

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

جو دم گزر گیا پھر ہاتھ آتا نہیں

وقت پر لگا کر اڑا جا رہا ہے۔ سال مہینوں میں، مہینے دنوں میں، دن گھنٹوں میں گھنٹے منٹوں، سیکنڈوں اور لمحوں میں تحلیل ہوتے چلے جا رہے ہیں، ادھر مہینے کی ابتداء ہوتی ہے ادھر پتہ چلتا ہے کہ کیلنڈر پچیس تاریخ سے تجاوز کر گیا ہے۔ ابھی ہفتے کا آغاز ہی ہوتا ہے کہ جمعرات سر پر آ کھڑی ہوتی ہے، اس مشینی دور میں پتہ ہی نہیں چلتا کہ دن کا آغاز کب ہوا تھا اور شام کب ہو گئی.... بقول کَسے

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے

عُمر یونہی تمام ہوتی ہے

وقت کو ایک پل بھی قرار نہیں، ایک وقت تھا کہ جب.... "وقت بہت نازک ہوتا ہے".... "گیا وقت ہاتھ نہیں آتا".... "وقت کو غنیمت جانئے".... "آیا وقت ٹلتا نہیں".... "جاہل وقت گنواتا ہے".... قسم کے محاورے بڑے عجیب لگتے۔ اب جب خود واسطہ پڑا تو خواہش ہوتی ہے کہ کاش ! وقت کو اپنی مٹھی میں بند کر لیتے، مگر ایسا ممکن نہیں۔ اس مشینی دور میں گلی محلے کی سطح سے لے کر کرۂ ارضی پر بسنے

والی مخلوق میں پیدا ہونے والے انقلابات کا جائزہ لیں تو لگتا ہے وقت کی رفتار ہماری سوچ سے زیادہ تیز ہو چکی ہے۔ یہ سائنس کا دور کہلاتا ہے، جدھر جاؤ سائنس کی حکمرانی اور مشینوں کی فراوانی ہے۔ ایک وقت تھا کہ لوگ نامہ و پیام کے لئے خط و کتابت کا سہارا لیتے، مہینوں میں ڈاک ملتی اور ایک دوسرے کے احوال معلوم ہو پاتے، پھر فون آگیا، بہت سی دوریاں، دُور ہو گئیں، اس کے بعد فیکس آگیا، چند لمحوں میں ہزاروں صفحے ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہو جاتے، اب اس کی جگہ انٹرنیٹ نے لے لی ہے بس ایک بٹن کلک کرنے کی دیر ہے کہ پاکستان بیٹھے بیٹھے کینیڈا جیسے بعید ترین ملک میں اپنے عزیزوں سے رابطہ ہو جاتا ہے، محض یہی نہیں بلکہ چاہیں تو آپ ایک دوسرے کو دیکھ بھی سکتے ہیں.... اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کر سکتے ہیں۔

چند سال پیشتر جب یہ نظریہ سامنے آیا کہ کچھ عرصے بعد جنگوں کے لئے بڑی بڑی فوجوں کی ضرورت نہیں ہوگی بلکہ ہزاروں میل دور بیٹھ کر بھی "قتل عام" کیا جاسکے گا تو بہت عجیب محسوس ہوتا تھا مگر اب تو یہ سامنے کی حقیقت ہے کہ امریکا نے بحیرہ عرب میں بیٹھ کر افغانستان کو کھنڈر بنا دیا.... اب اسے سائنس کی ترقی کہا جائے....

انسانی ہنر کا کمال سمجھا جائے یا اسے وقت کی تیز رفتاری قرار دیا جائے؟.... آج زندگی کی دوڑ میں جو شخص سست رو ہے، ناکام ہے جو تیز خرام ہے کامیاب ہے۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ یقین کر لیا جائے....

انسان کھو کے وقت کو پاتا نہیں کبھی

جو دم گزر گیا پھر ہاتھ آتا نہیں

ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ وقت کی رفتار ہمارے قیاس و گمان سے بھی تیز ہو چکی ہے۔ ابھی تھوڑے دن قبل ہمارے ایک محترم بزرگ ملکی اور عالمی صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے ارشاد فرمارہے تھے "دنیا بھر میں رونما ہونے والے انقلابات سے معلوم ہو رہا ہے کہ منشاء الٰہی کے مطابق دنیا کی بساط لپیٹی جا رہی ہے۔ حدیث شریف میں قرب قیامت کی جتنی نشانیاں بیان کی گئی ہیں ان میں سے اکثر پوری ہو چکی یا اس وقت پائی جا رہی ہیں، چند بڑی نشانیاں باقی ہیں جن کا وقوع ہونا ابھی باقی ہے۔ عالم اسلام اور عالم کفر کے مابین جاری کشمکش سے اندازہ ہو رہا ہے شاید آخری معرکہ قریب ہے جس کی قیادت امام مہدی اور سیدنا عیسٰی علیہ السلام کریں گے۔ تفصیلات میں جایا جائے تو ان کے بیان کے لئے کئی صفحات چاہئیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ ہر انسان اپنی جگہ حیران و ششدر ضرور ہے۔ ایک غیر مرئی طاقت بار بار ذہن کے دروازے پر آکر دستک دیتی ہے کہ کچھ ہونے والا ہے۔ آج کل جس قسم کے بے شمار علمی و عقلی فتنے رونما ہو رہے ہیں ان باتوں کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ قرب قیامت میں فتنے اس طرح برسیں گے جیسے بارش کے قطرے پے در پے برس رہے ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں کیا ہوگا ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ قرب قیامت میں انسان صبح اٹھے گا تو مسلمان ہوگا اور شام اس حالت میں آئے گی کہ وہ کفر اختیار

کرچکا ہوگا اور ایسا بھی ہوگا کہ شام کو دن بھر کی مسموم فضا کے باعث وہ کفر اختیار کرچکا ہوگا لیکن صبح ایمان کی حالت میں اٹھے گا۔ مطلب یہ کہ اس دور میں ایسے ایسے فتنے سر اٹھائیں گے کہ ایمان و کفر میں تمیز کرنا مشکل ہوجائے گا۔ ممکن ہے جس بات کو انسان عین ایمان سمجھ رہا ہو وہ حقیقت میں کفر ہو اور جسے کفر خیال کر رہا ہو وہ عین ایمان ہو، اس کا عملی مشاہدہ ہم روز مرہ کی زندگی میں کر رہے ہیں۔ ان حالات میں ایک مسلمان کے لئے فکر کرنے کی سب سے بڑی بات یہی ہے کہ وہ اپنے ایمان کی فکر کرے۔ ایمان کی فکر یہ نہیں کہ کلمہ طیبہ پڑھ لیا اور سمجھ لیا کہ ہم پکے ٹھکے مومن بن گئے۔ نہیں ! اس کلمے کے تقاضوں کو بھی پورا کیا جائے اور اس مختصر زندگی کو قیمتی بنالیا جائے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ کی عطا کردہ دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں لوگ دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں ایک نعمت "فراغت" ہے اور دوسری "صحت" ہے، کہ انسان سوچتا ہے ابھی تو وقت ہے پھر کسی وقت فلاں کام کرلوں گا، مگر یہ ایک دھوکہ ہوتا ہے۔ اس سے بھی واضح انداز میں ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے قبل غنیمت جانو ! بڑھاپے سے قبل جوانی کو، بیماری سے پہلے صحت کو، مال داری کو محتاجی "سے پہلے، اور فرصت کو مشغولی سے پہلے اور اپنی زندگی کو موت سے پہلے۔

آج ہمارے معاشرے میں سب سے زیادہ بے قیمت چیز "وقت" ہے۔ جہاں چاہا کھو دیا، جہاں چاہا برباد کردیا، اسے لہو و لعب میں، بے معنیٰ اچھل کود میں، دنیا بنانے کی تگ و دو میں، ٹی وی کے سامنے گھنٹوں بیٹھنے میں، غیبتوں کا انبار لگانے میں، اور نہ جانے کن کن خرافات میں برباد کیا جارہا ہے۔ اللہ کرے ہمارے دلوں میں وقت کی قدر و قیمت کا احساس پیدا ہوجائے ورنہ تو یہ حال ہوگا....

مجھ کو غفلت نے خبر ایامِ فرصت کی نہ دی
آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

کینسر

۴ فروری ورلڈ کینسر ڈے

ڈاکٹر رفیق خانانی

ہر سال پوری دنیا میں ۴ فروری کا دن ورلڈ کینسر ڈے کے طور پر منایا جاتا ہے۔ سب سے پہلے ۴ فروری سن 2000ء کو پیرس میں cer World summiet against can نے کینسر کی روک تھام کے لیے ' چارٹر آف پیرس' منظور کیا تھا۔ اس وقت سے ہر سال ۴ فروری کو پوری دنیا میں ماہرینِ صحت کینسر کی روک تھام اور عوام الناس میں کینسر سے متعلق آگاہی کے لیے مختلف سیمینارز اور پروگرام منعقد کرتے ہیں۔

کینسر کیوں ہوتا ہے؟ اس کا حقیقی جواب تو شاید کسی کے پاس نہیں ہے لیکن ماہرینِ صحت اس بات پر متفق ہیں کہ اس کی بنیادی وجہ جینز (Genes) میں رونما ہونے والے تغیرات ہیں۔ غذا میں پائے جانے والے چند عناصر مثلاً ذخیرہ شدہ اجناس میں پائے جانے والے افلا ٹوکسن (Aflatoxins)، الیکٹرو میگنٹک تاب کاری اثرات، وائرل انفیکشنز وئیوز (HIB, HCV,EBV,H Pylori,HTLV)، آبی اور فضائی، غذائی آلودگی، فوڈ کیمیکلز مثلاً کھانے کے رنگ، جینیاتی طور پر

سگریٹ نوشی، شیشہ کا نشہ، زہریلا دھواں، (GM food) تبدیل کی جانے والی غذائیں اور زرعی ادویات شامل ہیں۔(Dioxins)

اس کے علاوہ بھی چند وجوہات ایسی ہیں جو خاص حالتوں میں کینسر کی وجہ بنتی ہیں مثلاً نامی کیمیکل سے کینسر ہو سکتا(Asbestos) سیمنٹ انڈسٹری سے متعلق لوگوں کو سے بھی کینسر کا خطرہ(HRT) ہے۔خواتین میں سن یاس روکنے کے لیے ہارمون تھراپی ہو سکتا ہے۔اس کے علاوہ کینسر کی ایک وجہ سورج کی تاب کار شعاعیں ہیں جن سے وہ لوگ جو دھوپ میں زیادہ بیٹھتے ہوں خصوصاً سفید جلد والوں کو جلد کے کینسر کا خدشہ لاحق رہتا ہے۔

کینسر کی مختلف اقسام ہیں اور دنیا کے مختلف حصوں میں اس کی مختلف اقسام کے کیسز پائے جاتے ہیں مثال کے طور پر اگر ملک عزیز پاکستان کی بات کی جائے تو بریسٹ کینسر، منہ ہونٹ اور حلق کے سرطان کی تعداد خطے کے دوسرے ممالک کی نسبت بہت کے کیسز کی تعداد دوسرے ممالک کی (Cervix)زیادہ ہے۔جب کہ کینسر آف سروکس نسبت پاکستان میں بہت کم ہے۔ بلکہ یہ کینسر کی ایسی قسم ہے جو غیر مسلم ممالک کی نسبت مسلم ممالک میں بہت کم ہے۔اس کی اہم وجہ ان ممالک میں ختنے کا رواج ہے (ختنہ کی وجہ سے ایڈز اور جنسی امراض کا خطرہ بھی بہت کم ہو جاتا ہے)۔

:پاکستان میں سب سے زیادہ پائے جانے والے کینسرز
چھاتی کا کینسر (2)منہ اور ہونٹ کے کینسر (3) جگر اور پتے کی نالیوں کا کینسر (4) (1)
.بڑی آنت کا کینسر (5) پروسٹیٹ کینسر (6) .برین کینسر (7) مثانہ (8) ہوچکنز
کینسر (9) نان ہوچکنز کینسر (10) جلد کا کینسر (۱۱)اووری کا (Hodgkins disease)
کینسر (۲۱) پھیپھڑوں کا کینسر (۳۱) کولون کینسر

کینسر کی اقسام

:بریسٹ کینسر

کینسر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ دوسری بیماریوں کی بانسبت اس میں مردوں کے مقابلے میں عورتیں نہ صرف زیادہ مبتلا ہوتی ہیں بلکہ مردوں کی بانسبت کم عمری میں ہی اس کا شکار بھی ہو جاتی ہیں۔اس کا اندازہ پاکستان میں موجود ٹاپ ٹین کینسرز کی ٹیبل کا ملاحظہ کرکے بھی بخوبی ہو سکتا ہے کہ پاکستان میں سب سے زیادہ پائے جانے والے کینسرز میں پہلے نمبر پر چھاتی کا کینسر ہے۔ اور خاص ہمارے ملک میں تو یہ کینسر اور بھی زیادہ ہلاکت خیزی کا مؤجب ہے کہ یہاں دنیاکے دوسرے ممالک کی نسبت خواتین .بریسٹ اور اووری کینسرز میں نسبتاً دس سال پہلے ہی مبتلا ہو جاتی ہیں۔یعنی عام طور پر خواتین اس مرض میں پچپن سال کی عمر میں مبتلا ہوتی ہیں لیکن پاکستان میں عام طور پر خواتین دس سال

پہلے یعنی پینتالیس سال کی عمر میں ہی.بریسٹ اور اووری کینسر کا شکار ہو جاتی ہیں۔
.بریسٹ کینسر کے پاکستان میں آبادی کے تناسب سے دنیا میں سب سے زیادہ کیسز پائے جاتے ہیں۔ ایک تخمینہ کے مطابق تقریباً 50,000 سالانہ اموات اس کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ ان خواتین میں نسبتاً اس کا تناسب کم پایا جاتا ہے جو بچوں کو دو سال کی عمر تک اپنا دودھ پلاتی ہیں۔ چھاتی کے کینسر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ جس خاندان میں اس کے دو تین کیسز ہو اس خاندان کی دوسری خواتین میں اس کینسر میں مبتلا ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں۔ بہرحال اگر اس کی تشخیص ابتدا میں ہی ہو جائے تو یہ مکمل طور پر قابل علاج ہوتا ہے۔ اس کے لیے خواتین کا خود تشخیصی عمل بہت ضروری ہے۔ یعنی خواتین ہر ماہ خود اپنی چھاتیوں کا ہاتھوں سے ٹٹول کر معائنہ کریں کہ کوئی گلٹی تو نمودار نہیں ہو رہی۔ اگر کوئی گلٹی محسوس ہو تو فوراً اپنی لیڈی ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ ہر گلٹی سرطان کا پیش خیمہ ہو .... بے ضرر گلٹیاں اور غدود بھی ہو جاتے ہیں لیکن اس کی تشخیص ماہر ڈاکٹر سے کروانا بہرحال بہت ضروری ہے۔

پھیپھڑوں کا کینسر:

سگریٹ نوشی کرنے والوں میں پھیپھڑوں کے کینسر کا تناسب بہت زیادہ ہوتا ہے۔

سگریٹ نوشی سے نہ صرف سگریٹ نوش کو نقصان پہنچتا ہے بلکہ اس کے آس پاس کے بھی بالواسطہ طور پر اس سے متاثر ہوتے ہیں۔(Passive smoking) لوگ اسموکنگ کے علاوہ سیمنٹ کے ذرات سے اور کان کنی کے کام سے متعلق افراد کو بھی کئی سالوں کے بعد پھیپھڑوں کے کینسر میں مبتلا ہونے کا اندیشہ رہتا ہے۔

جگر کا کینسر :

ہیپاٹائٹس بی اور سی سے متاثرہ لوگوں میں یہ کینسر زیادہ پایا جاتا ہے۔ چوں کہ پاکستان میں ایک کروڑ سے زیادہ لوگ ہیپاٹائٹس بی یا سی کا شکار ہیں اس لیے یہ کینسر بھی ہمارے ملک میں بہت عام ہے۔ اس سے بچاؤ کے لیے ہیپاٹائٹس بی کے حفاظتی ٹیکے نہایت مؤثر ہیں۔ ہیپاٹائٹس بی یا سی سے متاثرہ لوگ اگر ابتدائی اسٹیج پر اپنا علاج کروا لیں تو اس کینسر سے بچا جا سکتا ہے۔

کولون کینسر :

اس کا تناسب بھی ہمارے ملک میں بڑھتا جا رہا ہے۔ اس کی علامت کے طور پر مقعد سے بلیڈنگ، وزن میں کمی، تھکان وغیرہ ہیں۔ متناسب غذا جس میں خوب ریشہ ہو اور قبض سے بچنا جیسی عادات اس کینسر سے بچنے میں معاون ثابت ہوتی ہیں۔

بچوں میں کینسر :

جس طرح ہر سال ۴ فروری کو' ورلڈ کینسر ڈے 'منایا جاتا ہے اسی طرح ہر سال ۱۵ فروری کو 'چائلڈ ہوڈ کینسر ڈے' منایا جاتا ہے۔بڑوں کی بانسبت بچوں میں پچیس فی صد کینسرز خون کے کینسر (Leukemia) ہوتے ہیں اور تقریباً تیس فی صد برین کینسر ہوتے ہیں ۔ اس کے علاوہ پائے جانے والے کینسرز میں گردوں ، آنکھوں اور ہڈیوں کے کینسرز ہوتے ہیں۔اہم بات یہ ہے کہ تشخیص اور علاج کی فوری اور بہترین سہولت کی وجہ سے ترقی یافتہ ممالک میں کینسر سے متاثر بچوں کے زندہ رہنے کی شرح 75% ہے جب کہ پس ماندہ ممالک میں 80% فی صد کینسر کے شکار بچے موت کا شکار ہو جاتے ہیں۔

کینسر کی علامات:

کینسر کی علامات کا دارومدار اس بات پر ہے کہ کینسر کس عضو میں ہے۔ عام طور پر کینسر کی علامات میں جسم میں کسی بھی قسم کے خلیات کا تیزی سے بڑھنا ہے جو کہ رسولی کی شکل میں نمودار ہوتا ہے۔اس کے علاوہ کینسر کی علامات میں بغیر کسی ظاہری وجہ کے وزن کا گھٹنا اور بخار کا رہنا، قے اور فضلے میں خون کا آنا، جسم کے کسی بھی حصے میں غدود کا بڑھنا وغیرہ ہے۔

تشخیص:

تشخیص کا دارومدار بھی اس بات پر ہوتا ہے کہ کینسر کس عضو میں ہے۔ گر جسم

کے بیرونی حصوں میں کینسر زدہ خلیات ہوں تو عموماً جلد تشخیص ہو جاتی ہے لیکن اگر اندرونی طور پر کینسر کی رسولی ہو تو دیر سے تشخیص ہوتی ہے۔عام طور پر خون کا ٹیسٹ (CBC)، جگر کے کینسر کے لیے الفافیٹو پروٹین، (PSA) پروسٹیٹ کینسر کے لیے، (CEA)، اینڈوسکوپی،ایکسرے، الٹراساؤنڈ، سی ٹی اورایم آر آئی وغیرہ کیے جاتے، ایک بنیادی اور انتہائی (Biopsy) ہیں۔اس کے علاوہ کینسر کی تشخیص کے لیے بایوپسی اہم ٹیسٹ ہے۔

علاج:

گزشتہ تین دہائیوں میں کینسر کے علاج میں خاطر خواہ پیش رفت ہوئی ہے۔مثلاً بچوں میں 80-90% بچے علاج سے مکمل (ALL) میں پائے جانے والے خون کے سرطان صحت یاب ہو جاتے ہیں۔اسی طرح بریسٹ کینسر کی اگر جلد تشخیص ہو جائے تو اسے بھی آپریشن کے ذریعے قابو میں لایا جا سکتا ہے۔جدید طریقوں سے کینسرز کے خلیات کو اور پروجیسٹون (ER) تشخیص کرکے ان کے لیے مؤثر ادویات مثلاً ایسٹروجن پازیٹو کے لیے مختلف ادویات استعمال کرکے ان کے بڑھنے (HER-2) اور ہرٹو، (PR) پازیٹو کی رفتار کو روکا جا سکتا ہے۔پروسٹیٹ کینسر کی تشخیص اور علاج میں بھی پہلے کی نسبت کے ذریعے (Radiation) بہت ترقی ہوئی ہے۔ مؤثر ادویات کے علاوہ ریڈی ایشن علاج میں بھی نسبتاً کافی جدت اور پیش رفت ہوئی ہے۔

'Personalized cancer vaccine' کینسر کے علاج میں ایک جدید طریقہ علاج کہلاتا ہے۔اس طریقہ علاج میں کینسر زدہ حصے سے مواد لے کر ایک مخصوص طریقے سے مریض کے جسم میں ڈالا جاتا ہے جس سے مریض کی قوتِ مدافعت کینسر کے خلاف قوت پکڑ لیتی ہے۔ اس طریقہ علاج میں ماہرین کو خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی ہے لیکن ابھی اس میں بہت تحقیق کی ضرورت ہے اور فی الحال ماہرین اس طریقہ علاج کو پروسٹیٹ کینسر کے خلاف ہی استعمال کر رہے ہیں۔

کینسر سے بچاؤ کے طریقے:

کینسر سے بچاؤ کے لیے سب سے اہم اصول فطری، متوازن اور سادہ زندگی گزارنا ہے اور غیر فطری طرزِ زندگی سے بچنا ہے۔ طرزِ زندگی میں سادگی، مرغن غذاؤں کے زیادہ استعمال سے بچنا، ورزش، ہر طرح کا نشہ خصوصاً پان، چھالیہ، تمباکو اور گٹکے وغیرہ سے بچنااور خصوصاً جگر کے کینسر سے بچاؤ کے لیے ہیپاٹائٹس بی کے حفاظتی ٹیکے وغیرہ ہیں۔ خواتین کا خود تشخیصی عمل بھی بریسٹ کینسر کے مکمل علاج میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

ترقی پذیر ممالک میں کینسر کے کیسز کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے۔اب تک تو ترقی یافتہ ممالک اور ترقی پذیر ممالک میں کینسر کے کیسز کی تعداد برابر ہے لیکن آئندہ دس سالوں میں ایک محتاط اندازے کے مطابق ترقی پذیر

کی ایک رپورٹ کے WHO ممالک میں ان کیسز کی تعداد 75% تک بڑھ جائے گی۔
مطابق 2005-2015 کے عشرے میں آٹھ کروڑ چالیس لاکھ افراد کینسر کی وجہ سے
موت کے منہ میں چلے جائیں گے۔ اگر مناسب تدابیر برائے تشخیص اور علاج مہیا کر دی
جائیں تو اس میں خاطر خواہ کمی لائی جا سکتی ہے۔

اردو کی درست املا

یہ اردو زبان کی وسعت قلبی ہے کہ بہت سی دوسری زبانوں کے الفاظ اپنے اندر یوں سمو لیتی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اردو ہی کا ہے۔ اردو زبان میں عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ بکثرت مستعمل ہوتے ہیں، لیکن انگریزی زبان کا معاملہ ذرا مختلف ہے۔ اردو میں انگریزی الفاظ کی پیوندکاری آج تک بار نہیں پا سکی.... بات کہیں اور نکل گئی ہم اردو میں املا کی غلطیوں کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتے تھے، آج کل اردو تحریر میں املا کی غلطیاں بہت عام ہیں کچھ لوگ تو جانتے ہی نہیں کہ وہ کہاں غلطی کر رہے ہیں اور کچھ لوگ احتیاط سے کام نہیں لیتے۔ حالانکہ املا کی صحت نہایت ضروری ہے اس لئے کہ املا کی غلطی سے بعض اوقات عبارت کا مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک لفظ ہے "خاصا" جس کے معنی ہیں "امراء و سلاطین کا کھانا" اگر الف کی بجائے "ہ" سے لکھا جائے تو خاصہ پڑھا جائے گا جو خاصیت کے معنی میں آتا ہے۔

جہاں تک ممکن ہو تحریر کرتے وقت، خط لکھتے وقت قواعد املا کا لحاظ رکھنا چاہئے۔ املا کے بعض قاعدے یہ ہیں:

ا۔ دھوکا، بھروسا، چکما وغیرہ جتنے ہندی الفاظ ہیں ان سب کے آخر میں الف ہے

ہ" نہیں اس لئے انہیں دھوکہ، بھروسہ، چکمہ وغیرہ لکھنا غلط ہے۔"

۲۔ اصل لفظ "پروا" ہے پرواہ نہیں، اس کے آخر میں "ہ" نہیں لکھنی چاہئے۔

۳۔ نون غنہ جب لفظ کے آخر میں آئے تو اس میں نقطہ نہیں لگانا چاہئے اور اگر بیچ میں آئے تو اس پر الٹا جزم لگانا چاہئے۔

۴۔ یائے معروف کو گول (ی) لکھنا چاہئے جیسے گولی اور یائے مجہول کو لمبی (ے) سے تحریر کرنا چاہئے جیسے گولے لیکن جب کسی لفظ کے درمیان آئے تو اس سے پہلے حرف کے نیچے زیر یا زبر لگانا چاہئے جیسے تِیر، تَیرنا۔

۵۔ جو حرف واؤ معروف سے پہلے ہو، اس پر پیش (ُ) ضرور لگانا چاہئے جیسے طُور، حُور، نُور وغیرہ۔

۶۔ وہ عربی الفاظ جن کے آخر میں ہمزہ آتا ہے، وہ الفاظ اردو میں ہمزے کے بغیر لکھے جاتے ہیں جیسے انبیا، اولیا، ادبا، دعا وغیرہ مگر مضاف ہونے کی صورت میں ہمزہ لکھا جائے گا جیسے اولیاء کرام۔

۷۔ چودھری کو بعض لوگ چوہدری لکھتے ہیں یہ غلط ہے، صحیح املا چودھری ہے۔

۸۔ معمّا کو تقریباً سب ہی لوگ معمّہ ہی لکھتے ہیں جو غلط ہے، صحیح لفظ معمّا ہے۔

۹۔ عربی الفاظ کی تانیث عموماً آخر میں "ہ" بڑھانے سے بنتی ہے جو اردو میں "ہ" پڑھی جاتی ہے جیسے سلیم سے سلیمہ، سلطان سے سلطانہ، عاقل سے عاقلہ وغیرہ، لیکن ہندی یا فارسی الفاظ کی تانیث میں یہ قاعدہ برتنا غلط ہے جیسے

خورشید سے خورشیدہ، ہمشیر سے ہمشیرہ، خورشید اور ہمشیر ہی صحیح لفظ ہیں، بعض لوگ بھاوج کو بھاوجہ بھی کہہ دیتے ہیں حالانکہ بھاوج خود مؤنث ہے۔

افیون ایک دوا یا نشہ

منشیات کے نقصانات

افیون

انسانی تاریخ افیون سے متعلق کہانیوں سے بھری پڑی ہے ان میں سے کچھ کہانیاں مبنی برحقائق اور کچھ تصوراتی ہیں،البتہ یہ ایک دلچسپ حقیقت ہے کہ افیون کے استعمال کی کڑیاں ہمیں زمانہ قبل از مسیح میں بھی ملتی ہیں ۔اور اس بات کے ثبوت موجود ہیں کہ پرانی تہذیبوں میں افیون بطور دوائی اور سُرور و نشہ دونوں شکلوں میں استعمال کی جاتی رہی ہے۔

انیسویں صدی کے شروع میں چند اہم پیش رفت ہوئی ۔۵۰۸۱ئ،۳۰۸۱ءجب ایک جرمن سائنسدان نے افیون سے مارفین علیحدہ کی۔مارفین کو بعد ازاں افیون کے استعمال کی عادت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے متعارف کیا جانے لگا۔

اس ایجاد نے منشیات کے استعمال کی جدید بنیاد رکھی جو کہ موجودہ صورت میں ہمارے سامنے ہے،جس کے بعد کوڈین ۲۳۸۱ء میں افیون سے نکالی گئی ۔اور اس کے کچھ عرصہ بعد افیون کے مختلف دوسرے سالٹ Alkaloids علیحدہ کئے گئے۔شروع شروع میں افیون اور اس کے اخذ شدہ سالٹ Alkaloids کے متعلق عام خیال یہ تھا

کہ یہ ایک مختلف بیماریوں کا ایک بہتر علاج ہے، لیکن جسم پر ان کے اثرات اور بطور نشہ آور ان کے اثرات پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔ابتداء میں بعض لوگ انفرادی طور پر ان ادویات کے سُرور آور اثرات کی وجہ سے انہیں استعمال کرنے لگے، لیکن بہت جلد عام لوگوں نے ان ادویات کا استعمال نشہ کے طور پر شروع کردیا،ان ادویات کے مسلسل اور آزادانہ استعمال کی وجہ سے یورپ میں منشیات کے عادی افراد کی تعداد میں بہت تیزی سے اضافہ ہونا شروع ہوگیا۔ ۱۸۵۳ء میں سراخ دار سوئی کی ایجاد سائنس کی دنیا میں ایک بہت بڑی ایجاد خیال کی جاتی تھی،اس سوئی کی وجہ سے منشیات براہ راست دوران خون میں داخل کرلی جاتی تھی۔

جس کی وجہ سے دوائی کا ضیاع کم ہوگیا اور اس کے ساتھ ساتھ دوائی کا اثر بھی فوراً محسوس کیا جاتا تھا،کیونکہ دوائی زیادہ سے زیادہ جسم میں جذب ہوجاتی تھی۔

جہاں تک افیون سے اخذ کی گئی ادویات کے استعمال کا تعلق تھا بعض لوگوں کا یہ اعتقاد تھا کہ منشیات کو براہ راست جسم میں داخل کرنے سے انسان ادویات کے بعض ایسے اثرات سے محفوظ ہوجاتا ہے جو کہ ان ادویات کے کھانے سے رونپذیر ہوتے ہیں۔

کی ۔لہٰذا Develop مارفین Diacetyle ۱۸۵۷ء میں دو انگریز سائنسدانوں نے یورپ میں اس کے اثرات پر تحقیق شروع ہوئی ۔چنانچہ ۱۸۹۸ء میں ایک ادویہ ساز کمپنی Bayer، نے مارکیٹ میں اسے ہیروئن کے نام سے متعارف کروایا Bayercom کمپنی نے ہیروئن کو ایسی دوائی کے طور پر متعارف کروایا جو کہ افیون اور مارفین کی عادت سے چھٹکارے کے لئے بہترین علاج ہے ،اور یہ کہ یہ دوائی یعنی ہیروئن بذات خود انسان کو اپنے نشے کا عادی نہیں بناتی ۔۱۹۲۳ءاور۱۹۴۰ءکے درمیانی عرصہ میں کئی ایسی ادویات بنائی گئی جن کا ماخذ افیون تھی ،اس کے علاوہ ان کے نعم البدل مصنوعی طور پر تیار کئے گئے جو کہ ابھی تک ڈاکٹر مختلف بیماریوں کے علاج کے لئے استعمال کر رہے ہیں ،ان ادویات میں سب سے اہم میتھاڈون تھی اور یہ بھی جرمنی میں بنائی گئی تھی ۔یہ بھی ہیروئن ہی کے علاج کے لئے استعمال کی گئی ۔بہت سے ملکوں نے ۱۹۱۲ء تک ہیروئن کے مہلک اثرات سے روشنائی حاصل کر لی تھی اور اس کے استعمال کو کنٹرول کرنے کے لئے قوانین وضع کرنے شروع کر دئے تھے ،تاہم ان کوششوں کو کچھ کامیابیاں بھی ملیں لیکن اس وقت تک امریکہ اس دوائی کے استعمال کا بہت بڑا مرکز بن چکا تھا ،جہاں لوگ اسے نشہ کے لئے استعمال کرتے تھے ،یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ دنیاکے بہت سے ممالک بین الاقوامی سیاست اور موثر بین الاقوامی کنٹرول کے نہ ہونے کی وجہ سے ہیروئن اور ہیروئن سے متعلقہ دوسری مشکلات سے بُری

طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ صرف ایران میں اس وقت تقریبًا ایک لاکھ ہیروئن کے نشہ کے عادی موجود ہیں، اس کے علاوہ یکنڈے نیون ممالک اٹلی، جرمنی، فرانس، سپین تھائی لینڈ اور برطانیہ جیسے ممالک میں ہیروئن کا نشہ ایک بہت بڑی پرابلم بن چکا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک ایکڑ میں افیون کی پیداوار تین سے پانچ کلو گرام تک حاصل کی جاتی ہے۔

مارفین.... خام افیون میں تقریبًا دس فیصد مارفین، ڈیڑھ فیصد کوڈین، 2/1 فیصد تھیبین، اور ایک فیصد پاپورین پایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ افیون میں تقریبًا ۵۳ مزید بہت تھوڑی تھوڑی مقدار میں پائے جاتے ہیں، لفظ مارفین یونانی نیند کے Alkaloids جواب دیوتا مارفین سے اخذ کیا گیا ہے۔ افیون سے مارفین علیحدہ کرنے کے لئے پانی کو گرم کرکے اس میں افیون کو اچھی طرح حل کیا جاتا ہے، حل شدہ افیون والے پانی کو باریک کپڑے سے چھانا جاتا ہے اور جو افیون غیر حل شدہ باقی بچ جاتی ہے اور دوبارہ پانی میں حل کیا جاتا ہے، اور یہ عمل پانچ یا چھ مرتبہ دہرایا جاتا ہے، اب اس افیون حل شدہ پانی کو دوبارہ گرم کیا جاتا ہے اور پھر اس میں کچھ کیمیکل ڈالے جاتے ہیں جو کہ اس پانی میں موجود مارفین کو ایک غیر حل شدہ سفید سفوف کی شکل میں پانی کی سطح

کے نیچے جمع کر دیتا ہے ،اب اسے ایک دوسرے برتن میں ڈال کر ایک کپڑے کی مدد سے اسے فلٹر کیا جاتا ہے جس میں سے پانی علیحدہ ہونے کے بعد مارفین کپڑے پر جمع ہو جاتی ہے۔

اس طرح مارفین کو خشک کرکے اسے بلاک کی شکل میں پیک کیا جاتا ہے ،ان بلاکوں کا اور وزن فی بلاک دس سے بارہ اونس تک ہوتا ہے ،اور بعض اوقات "x3x4 سائیز 1 وغیرہ وغیرہ۔ " AAA" ان پر برانڈ مارکہ کا نشان بھی لگا دیا جاتا ہے۔مثلاً 999۔

دس کلو گرام خام افیون سے تقریباً ایک کلو گرام مارفین حاصل ہوتی ہے اس مرحلہ تک حاصل ہونے والی مارفین کو مارفین بیس کہا جاتا ہے ،اور یہ پانی میں حل پذیر نہیں ہوتی ،اس مارفین بیس کو پانی میں حل پذیر بنانے کے لئے اسے سلفیورک ایسڈ یا ہائیڈروکلورک ایسڈ کے ساتھ ملا کر مارفین سلفیٹ یا مارفین ہائیڈرویٹ بنایا جاتا ہے۔

اب مارفین کی یہ کوالٹی رنگت میں سفید اور پانی میں حل پذیر ہوتی ہے۔بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ یہ مارفین زیادہ خالص ہے ،اس کے علاوہ مارفین بیس کو ہیروئن میں تبدیل کرنے کے لئے اسے ایک باقاعدہ لیبارٹری میں لے جایا

جاتا ہے۔اور اس میں مختلف دوسرے کیمکلز ڈال کر اسے ہیروئن بیس میں تبدیل کر دیا

جاتا ہے۔

کی گئی ہوتی ہیں، مختلف Produce ایسی مارفین کو اور کوڈین کو جو کہ قانونی طور پر

بیماریوں کے علاج کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

(جاری ہے)

ہیروئن کی ہلاکت خیزیاں

ہیروئن

ہیروئن نشہ کے لئے سب سے زیادہ استعمال ہوتی ہے ،ہیروئن بنانے کے لئے مارفین بیس اور Acetic Akhydirde کو تقریبًا برابر مقدار میں اکٹھا کرکے تقریبًا چھ گھنٹے تک 185 فارن ہیٹ ٹیمپریچر پر گرم کیا جاتا ہے اس طرح مارفین اور ایسڈ کیمیائی طور پر یکجان ہوجاتے ہیں ،اس کے بعد اس کمپاؤنڈ میں سے پانی اور کلوروفارم کی مدد سے کثافتوں کو علیحدہ کیا جاتا ہے جس سے ایک بہتر کوالٹی کی ہیروئن حاصل ہوجاتی ہے ،اس حلول کو فلٹر کرکے ہیروئن کے ذرات کو علیحدہ کیا جاتا ہے۔

اب الکوسل اور تارکول کی مدد سے ہیروئن کی کوالٹی کو مزید بہتر بنایا جاتا ہے، اس مکسچر کو اس طرح گرم کیا جاتا ہے کہ الکوسل بھاپ کی صورت میں اڑنا شروع ہوجاتی ہے اور برتن میں ایک خاص قسم کی ہیروئن بچ جاتی ہے ،اب آخری مرحلہ کے لئے ایک بہت ماہر کیمسٹ کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ اس تمام Process کو کامیابی سے سرانجام دے سکے۔اس مرحلہ میں ہیروئن کو الکوسل میں حل کیا جاتا ہے ،اس کے بعد جونہی اس محلول میں ہائیڈروکلورک ایسڈ اور ایتھر ڈالا جاتا ہے تو اس محلول میں چھوٹے چھوٹے سفید Flakes نمودار ہونا شروع ہوجاتے

ہیں، جنہیں فلٹر کرنے کے بعد خشک کرلیا جاتا ہے۔اور یہ سیفد سفوف ہی ہیروئن کہلاتا ہے جو کہ ۸۰ سے ۱۰۰ فیصد خالص ہوتا ہے۔عام طور پر ہیروئن کو لیبارٹری سے نشہ کے عادی لوگوں تک پہنچنے کے لئے کئی درمیانی واسطوں سے گزرنا پڑتا ہے،ہر ایک مرحلہ پر لوگ اس کاروبار سے زیادہ منافع حاصل کرنے کے لئے ہیروئن میں Mixing کرتے رہتے ہیں۔یہ مکسنگ بھی ایک بنیادی فارمولوں کے تحت کی جاتی ہے جو کہ نیچے دیا گیا ہے۔

ایک کلو۱۰۰ فیصد خالص ہیروئن ۔ Lactose x ۱۔ایک کلو
کلو ہیروئن جو کہ پچاس فیصد خالص ہے۔ 2
کلو پچاس فیصد خالص ہیروئن ۔ Lactose x 2 ۲۔ دو کلو
.کلو ہیروئن جو کہ 25 فیصد خالص ہے 4
4کلو 25فیصد خالص ہیروئن ۔ Lactose x ۳۔ 6کلو
کلو ہیروئن جو کہ 2/1 12-فیصد خالص ہے۔ 8
کلو ساڑھے بارہ فیصد خالص ہیروئن ۔ Lactise x 8 ۴۔ 8 کلو
کلو ہیروئن جو کہ 2/1-16 فیصد خالص ہے۔16

نارکوٹکس کی تعریف

: لفظ نارکوٹکس کی تعریف کچھ اس طرح سے ہے کہ
۱۔ ہر درد سے آرام پہنچائے گی۔

۲۔ جب بہت زیادہ استعمال کرنے والا اس استعمال کو یکدم روک دے تو اس کے ظاہر ہونگے۔ ....withdrawelsynptoms

۳۔ یہ نیند لائے گی۔

عام طور پر اس تعریف میں افیون اور اس سے اخذ شدہ اشیاء آتی ہیں، لیکن اس میں کوکین شامل نہیں کی جاتی۔ جبکہ کچھ قانونی تعریفات کے تحت یہ نارکوٹکس کے زمرہ میں آتی ہے لیکن حقیقتًا یہ ایک صرف ہیجان انگیز دوائی ہے۔ عام طور پر زیر استعمال آنے والے نارکوٹکس مندرجہ ذیل ہیں:

نارکوٹکس جن کا ماخذ افیون ہے مصنوعی نارکوٹکس

(۱) افیون ا۔ ڈیمرال :Deperdine

(۲) مارفین ۲۔ میتھاڈون

(۳) کوڈین ۳۔ Phentazocane

(۴) ہیروئن۔ ۴۔ Darvon

میتھاڈون ایک مصنوعی نارکوٹکس ہے، اور اس کے استعمال کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اسے ہیروئن کا نعم البدل تصور کیا جاتا ہے۔ یہ صرف پیا جاسکتا ہے، اور استعمال کرنے والا انجکشن کی تکلیف سے بچا رہتا ہے۔ اس کے اثرات ۲۴ گھنٹے تک محسوس کئے جا سکتے ہیں، میتھاڈون کو ہیروئن کی عادت سے چھٹکارا پانے کے

لئے استعمال کرنے کی تھیوری کو بہت کم کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں۔ کوڈین کافی عرصہ ڈرگ تھی۔ ہیروئن کے مقابلے Dnalgesic تک ڈاکٹروں کے نزدیک ایک آئیڈیل میں کوڈین کا نشہ کرنے والے لوگ بہت کم ہیں، اور یہ صرف ایسے لوگوں کے نزدیک پسندیدہ ڈرگ ہے جنہیں ہیروئن میسر نہیں ہو سکتی۔ نشہ باز ہیروئن کو استعمال کرنے کے لئے مختلف قسم کے آلات یا سامان استعمال کرتے ہیں، جن میں عام طور پر ایک چمچہ کسی بوتل کا لوہے کا ڈھکنا یا اس سے ملتی جلتی کوئی چیز جیسے ککر Cooker کہا جاتا ہے Cooker۔ اس کا نام ککر اس لئے رکھا گیا ہے کہ ہیروئن پاؤڈر میں حل کرکے اسی ککر میں گرم کیا جاتا ہے، پھر اس محلول کو سرنج کے ذریعے استعمال کیا جاتا ہے، اس کے علاوہ زیادہ نشہ کرنے والے نشہ باز ڈراپر کے آگے ٹیکہ والی سوئی لگا کر بطور سرنج استعمال کرتے ہیں۔ سرنج کے ساتھ عموماً روئی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا بھی رکھا جاتا ہے جو کہ حل شدہ ہیروئن کے محلول کو فلٹر کرنے کے کام آتا ہے، جو کہ اکثر بار بار استعمال سے گندھا ہو چکا ہوتا ہے۔ مندرجہ بالا سامان کے ساتھ ساتھ ایک باریک اور مضبوط رسی کا ٹکڑا بھی رکھا جاتا ہے تاکہ بازو پر باندھ کر شریان کو انجکشن کے لئے ابھارا جاسکے بعض مواقع پر رسی کے بجائے ٹائی بھی استعمال کی جاتی ہے، نشہ بازوں کے خیال کے مطابق اس طرح انجکشن لگانے سے ہیروئن کا اثر زیادہ تیزی سے ہوتا ہے، اس سارے سامان کو رکھنے کے لئے چمڑے کا پرس یا کٹ بیگ یا کوئی ٹین کا خوبصورت ڈبہ استعمال کیا جاتا ہے، لیکن

اکثر اوقات یہ چیزیں کسی ماچس کی ڈبیہ میں رکھی ہوئی نظر آتی ہیں ،جو کہ نشہ باز کے گھر کی کسی غلیظ سی جگہ پر چھپائی گئی ہوتی ہیں تاکہ کسی کو شک نہ ہو اور اگر پولیس آئے گی تو ہو سکتا ہے پولیس مین یا تفتیشی آفیسر تلاشی کے دوران اپنے ہاتھ غلاظت میں نہ ڈالیں۔

نشہ باز نشے کے لئے ہیروئن کو ککر میں ڈال کر اسے پانی میں حل کرتا ہے اور پھر اسے اس وقت تک گرم کرتا ہے جب تک کہ اس میں بلبلیں پیدا ہونے شروع ہو جائیں جونہی پہلا بلبلہ پیدا ہوتا ہے اسے روئی کے ٹکڑے سے فلٹر کرکے سرنج میں بھر لیا جاتا، ہے ، سرنج کی سوئی کو شریان میں داخل کرکے یہ دیکھا جاتا ہے کہ شریان سے خون سرنج میں آنا شروع ہو جائے ،اس کے بعد ہیروئن کے محلول کو شریان میں داخل کیا جاتا ہے ،جب نشہ باز بہت زیادہ تجربہ کار ہو تو اکثر وہ پہلے ہیروئن کی تھوڑی سی مقدار اس کے اثرات کو جاننے کے لئے استعمال کرتا ہے ، یہ اکثر اس وقت بھی ہوتا ہے جب نشہ باز کسی نئے آدمی سے خریدتا ہے یا جب اسے پہلے سے ہیروئن کی کوالٹی معلوم نہیں ہوتی ۔ ہیروئن ہمارے اعصابی نظام پر اثر انداز ہو کر اس کے کام کرنے کی صلاحیت کو ست کردینے والی دوا ہے۔

اور اعصابی نظام کے کام کرنے کی صلاحیت کو ست کرنے والی دواؤں سے طاقتور

انسان پر عام طور پر اس کا اثر بہت جلد ہوتا ہے۔اور جسم کے تمام اجزاء اس دوا سے متاثر ہو کر سست ہو جاتے ہیں۔نشہ باز اس دوا کے استعمال کے بعد فوراً ایک سُرور اور راحت محسوس کرتا ہے۔یہ معمولی درد کے احساس کو ختم کرتی ہے۔اور شاذ و نادر ہی سانس کی تکلیف کا باعث بنتی ہے۔کوڈین کھانسی کی علاج کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔جو کہ ایک سیرپ کی صورت میں استعمال کی جاتی ہے،لیکن یہ پلز کی صورت میں بھی دیکھنے میں آئی ہے۔ہیروئن نہ ملنے کی صورت میں ہیروئن کے عادی کوڈین نمبر ۴ کوالٹی کی ۵ یا ۶ پلز بیک وقت استعمال کرتے ہیں،جو کہ ان کی ہیروئن کی طلب کو پورا کرتی ہیں۔کوڈین پلز کی کوالٹی نمبر ۱ تقریباً 8/1 گرین کے برابر ہوتی ہے،جبکہ کوالٹی نمبر ۲ 1/8 گرین۔کوالٹی نمبر ۳ 2/1 گرین،کوالٹی نمبر ۴،ایک گرین کے برابر ہوتی ہے۔

ہیروئن کے استعمال کے طریقے :

ہیروئن عام طور پر ہر ممکنہ طریقہ سے استعمال کی جاتی ہے۔مثلاً کھانے سے یا سونگھنے سے،سگریٹ کی طرح پینے سے اور بذریعہ سرنج وغیرہ وغیرہ اس کے علاوہ ایسے افراد جو کہ کوکین کا نشہ کرتے،کوکین کا ہیجان انگیز اثر ختم کرنے کے لئے بھی ہیروئن استعمال کرتے ہیں۔

بہت مقبول ہو رہی ہے۔کیونکہ بعض Smoking دنیا کے بعض حصوں میں ہیروئن کی

لوگوں کا خیال ہے کہ اگر اس طریقہ سے ہیروئن استعمال کی جائے تو انسان ہیروئن کا نشہ کا نسبتاً کم عادی ہوتا ہے۔

یورپ اور امریکہ میں ہیروئن استعمال کرنے کا سب سے مقبول طریقہ سرنج ہے۔ سرنج کے ذریعے ہیروئن براہ راست شریان میں داخل کی جاتی ہے۔ ہیروئن کے نشہ کے عادی عموماً بازوؤں کے اندرونی طرف سرنج کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب شریانیں زیادہ زخمی ہوجائیں یا خراب ہوجائیں تو نشہ باز اپنی ہتھیلیوں پر بھی سرنج کا استعمال شروع کردیتا ہے۔ اور پھر جب بازوؤں پر مزید انجکشن لگانے کی گنجائش نہ رہے یا نشہ باز انجکشن کے نشانات کو چھپانا چاہے، تو پھر وہ ٹانگوں، پاؤں اور پیٹھ پر بھی انجکشن لگانا شروع کردیتا ہے۔ بعض نشہ باز تو گردن کی شریانوں میں بھی ہیروئن کا انجکشن لگاتے ہیں۔ نشہ باز عورتیں اپنی چھاتیوں پر انجکشن لگا لیتی ہیں، بعض دوسرے نشہ باز منہ میں زبان کے نیچے والے حصہ میں بھی سرنج کا استعمال کرتے دیکھے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ کچھ اپنے آلہ تناسل کی بڑی شریان میں ہیروئن کا انجکشن لگاتے ہوئے پائے گئے ہیں یہ احساسات جنسی لذت سے مشابہ محسوس ہوتے ہیں) جو کہ چند منٹ تک محسوس کئے) جاتے ہیں۔ اس حالت میں کئی دوسرے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ جن کا بالآخر یہ اثر پیدا ہوتا ہے کہ انسان پر ایک سرور کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔۔ اس کیفیت کا تعلق دوا کی مقدار پر بھی ہے اگر ایک انسان 5% ہیروئن

استعمال کرنے کا عادی ہے،اور اسے 1% ہیروئن میسر ہو تو وہ اوپر بیان کی گئی کیفیت کو محسوس نہیں کرتا۔اور اگر نشہ باز 1% سے 3% تک خالص ہیروئن استعمال کرنے کا عادی ہے اور اب وہ 5% ہیروئن استعمال کرتا ہے۔تو اس پر زیادہ طاقتور اثرات ظاہر ہونگے۔تمام نشہ باز جو کہ ہیروئن کا استعمال کرتے ہیں،انہیں درد سے آرام ہوتا ہے چند لوگ ہیروئن کے استعمال سے جب اپنے آپ کو آرام دہ حالت میں محسوس کرتے، ہیں توزیادہ باتیں کرنے لگتے ہیں۔اور خود کو ایک آزاد فضاء میں محسوس کرتے ہیں۔

ہیروئن کے جسم پر اثرات

:انسان کو نشہ کا عادی بنانے والے تین عناصر ہیں

Tolerance :.برداشت ....:۱

Physical Dependence : جسمانی انحصار ....: ۲

Psychological Dependence : نفسیاتی انحصار ....: ۳

.برداشت کی تعریف

یہ ہے کہ انسان ایک چیز کو بار بار استعمال کرے،تو اس کا اثر کم ہوتا چلا جائے،چنانچہ پہلے جیسے اثرات حاصل کرنے کے لئے خوراک کی مقدار بڑھانے کی ضرورت ہوتی ہے

۔

جسمانی انحصار :.... ایک ایسی جسمانی حالت ہے جو کہ کسی دوا کے ایک عرصہ تک ریگولر استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

نفسیاتی انحصار :.... کو ہم ایک جذبات سے مشروط ضرورت کو کہتے ہیں، جو کسی دوا کے استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔اور اسے عام طور پر" عادت " کہا (Drug) جاسکتا ہے مندرجہ ذیل اثرات ہیروئن کے استعمال کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں:

سوئی کے نشانات .... : ١

آنکھ کی پتلی کا سکڑنا .... : ٢

جسمانی حرکات کا سُست ہونا۔ .... : ٣

بول چال میں ربط نہ ہونا۔ .... : ٤

بے رنگت .... : ٥

جلد خشک اور ناخن بے رنگ اور بُھر بُھرے۔ .... : ٦

خشک منہ .... : ٧

خون میں آکسیجن کی کمی .... : ٨

جلد پر خارش ہونا .... : ٩

جلد کا ٹیمپریچر کم ہونا .... : ١٠

نمدار چہرہ .... : ۱۱

قبض .... : ۲۱

پیشاب کا بار بار آنا .... : ۳۱

دل کی دھڑکن سُست ہونا .... : ۴۱

پھیپھڑوں میں ہوا کی کمی .... : ۵۱

نبض کا متواتر نہ چلنا .... : ۶۱

جسم میں شوگر کا زیادہ ہونا۔ وغیرہ وغیرہ .... : ۷۱

کئی بار بار Sterile ہیروئن کا نشہ کرنے والے افراد سرنج کو بغیر صفائی اور بغیر استعمال کرتے ہیں، جس کی وجہ سے ان کے بازوؤں پر نمایاں زخموں کے نشانات چھوڑے اور شریانوں پر زخموں کے نشانات واضح طور پر ملتے ہیں۔ نشہ باز جونہی سرنج کا استعمال کرتا ہے، تو اس جگہ پر فوراً ایک ابھار پیدا ہوتا ہے جس کے منہ کی رنگت گلابی ہوتی ہے۔ عام طور پر ایسی سوزش پر ایک سوراخ بن جاتا ہے۔

عذابِ الٰہی سے بچنے کا نسخہ

سیلاب.... ایک عذاب.... ایک سخت تنبیہ

"کیا ایمان والوں کے لیے ابھی وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد سے ڈر جائیں اور اس حق کے آگے جھک جائیں جو نازل ہو چکا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی، پس ان پر طویل مدت گزر گئی، بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں بہت سے لوگ نافرمان ہیں۔" (الحدید ۱۶)

قتل و غارت، چوری ڈکیتی، اغوا، مہنگائی، بے روزگاری، ظالمانہ ٹیکس، لاعلاج نفسیاتی اور جسمانی بیماریاں، بے سکونی، بدامنی، ظالم و جابر اور سفاک حکمران آخر ہمارا مقدر کیوں؟

کہیں یہ سب ہمارا ہی کیا دھرا تو نہیں؟

"خشکی اور تری ہر جگہ لوگوں کے اعمال کے نتیجے میں فساد چھا گیا ہے، تا کہ اللہ ان کے بعض کرتوتوں کا مزا چکھائے تا کہ یہ رجوع کریں۔" (سورہ روم۔ ۱۴)

اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنی کون سی نعمت سے نہیں نوازا۔ دریا، پہاڑ، سرسبز وشاداب خطے، لہلہاتے کھیت، قیمتی معدنی ذخائر، بہترین موسم اور سب سے بڑھ کر ایمان واسلام کی نعمت.... مگر ہم نے ان نعمتوں کا کفران کیا۔ ہم نے یہ خطہ اسلام کے نام پر حاصل کیا اور پھر نہ صرف اللہ سے کیے ہوئے وعدے کو پس پشت ڈالا بلکہ اللہ سے بغاوت پر اتر آئے۔ شریعت کے نفاذ کے لیے اٹھنے والی ہر آواز کو بزورِ طاقت دبایا۔ قدرت کی طرف سے ہمیں مہلت ملتی رہی مگر ہم اپنی ہٹ دھرمی پر قائم رہے۔

یاد کیجیے ہم میں اور اہل سبا میں کس قدر مماثلت ہے!

اور اہل سبا کے لیے ان کے مسکن میں بہت بڑی نشانی موجود تھی۔ دائیں بائیں دونوں "جانب باغات کی دو قطاریں، اپنے رب کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہوتے رہو، اس کے شکر گزار رہو! زمین شاداب وزرخیز اور پروردگار بخشنے والا ہے، تو انہوں نے (اللہ کے نازل کردہ احکام سے) اعراض کیا تو ہم نے ان پر بند کا سیلاب بھیج دیا اور ان کے باغوں کو ایسے باغوں میں بدل دیا جن میں بدمزہ پھل والے درخت اور جھاؤ اور بیری کی کچھ جھاڑیاں رہ گئیں، یہ ہم نے ان کی ناشکری کا بدلہ دیا اور ہم ناشکروں کو برا بدلہ دیا ہی کرتے ہیں۔" (سورہ

(سبا: ۱۷،۱٦،۱۵

:ہمارے جرائم کی ایک ادنی جھلک جن میں ہم بتبلا ہیں

اللہ کے غضب کو دعوت دینے والے بعض عمومی گناہ

شرک کرنا، فرض نماز ترک کرنا، روزہ نہ رکھنا، زکوۃ ادا نہ کرنا، فرض حج ادا نہ کرنا، جان دار کی تصویر بنانا، کسی کی آبرو خراب کرنا، داڑھی منڈوانا یا ایک مشت سے کم کتروانا، بلا کسی شرعی عذر کے میت کی میراث فوری تقسیم نہ کرنا، شرعی پردہ نہ کرنا، نہ اپنے گھر والوں کو توجہ دلانا، ناحق قتل کرنا، بد نظری کرنا، کافروں فاسقوں اور بے حیاؤں والا لباس پہننا، دینی شعائر کی توہین کرنا، زنا کرنا، غیبت کرنا یا سننا، گھر میں ٹی وی اور کیبل لگوانا، ثواب سمجھ کر ٹی وی پر نام نہاد اسلامی پروگرام دیکھنا، گناہوں کے روکنے پر قدرت ہونے کے باوجود نہ روکنا، امر بالمعروف و نہی عن المنکر نہ کرنا، ماں باپ کی نافرمانی کرنا، رشوت لین، جوا کھیلنا، سٹہ لگان، سودی کاروبار کرنا، بینکوں کے ساتھ معاملات کرنا، کافروں کے طور طریقے اور رسم ورواج پسند کرن، اولیاء علماء اور صالحین کو برا بھلا کہنا، صحابہ کرام کو گالی دینا، غیر شرعی تقریبات میں شرکت کرنا مخلوط تعلیم حاصل کرن، مخلوط تقریبات میں شریک ہونا، ایسی مجالس میں شرکت کرنا، جہاں اللہ کی کھلی نافرمانی ہو رہی ہو مثلاً ویڈیو اور تصویر سازی وغیرہ، بینک میں ملازمت کرنا

انشورنس/تکافل کروانا، فلموں، تھیٹر اور سینما وغیرہ میں کام کرنا، کسی گناہ کو گناہ نہ سمجھنا، مجاہدین کو برا بھلا کہنا، حکومتی ظلم کا شکار مجاہدین کو پناہ نہ دینا، مجاہدین کی جاسوسی کرنا، جہاد کو دہشت گردی کہنا، اللہ کے غیر سے مانگنا، قانون شرعی کے خلاف فیصلے کرنا، ڈاکہ مارنا، ٹیکس لگانا، ملازمین سے زائد از وقت کام لینا اور اجرت نہ دینا، جمہوریت کو درست سمجھنا اور ووٹ لینا یا دینا، گانے سننا، ظالم حکمرانوں کی حمایت کرنا، علماء کا حکمرانوں سے میل جول رکھنا، علماء کا کتمان حق کرنا، وقتی مصلحتوں کی خاطر شریعت کو بدلنا، بے دین سیاسی جماعتوں میں شامل ہونا، لسانیت صوبائیت اور فرقہ واریت کے بدبودار نعروں پر جمع ہونا، دنیا کمانے کے لیے علم دین حاصل کرنا، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونا، میڈیا کی پھیلائی من گھڑت باتوں پر یقین کرنا، عالم یا عالمہ کا اپنے علم پر عمل نہ کرنا۔

عذابِ الٰہی سے بچنے کا نسخہ

اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے مجرم ہونے کا اقرار۔

ایسی توبہ جس کے بعد تمام چھوٹے بڑے گناہوں سے بچنے کا سچا وعدہ شامل ہو۔

نماز باجماعت کا اہتمام اور ہر دعا میں گناہوں سے بچنے کی توفیق مانگنا۔

علماء مشائخ اور صلحاء امت کی مجالس میں شرکت کا اہتمام۔

قرآنی احکام سیکھنے پر توجہ اور ان پر عمل کرنے کا عزم۔

کامل توبہ کی ایک نشانی یہ ہے کہ فوری طور پر اپنے گھر کو ٹی وی کی نجاست سے پاک کرنے کا اہتمام کریں۔

یاد رکھیں! جب تک آپ کے گھر میں ٹی وی ہے محض توبہ اللہ تعالٰی کے غضب کو ٹال نہیں سکتی۔

دعوت فکر!

اس وقت ہم جس نظام کے تحت اپنی زندگی گزار رہے ہیں ہرگز اسلامی نہیں بلکہ اس وقت کافرانہ جمہوریت اور سرمایہ دارانہ نظام زندگی رائج ہے۔ شریعت عملی طور پر منسوخ ہے اور عدالتوں میں کفریہ قوانین کے مطابق فیصلے کیے جاتے ہیں۔ تمام تر ریاستی ڈھانچہ کافرانہ انداز و اطوار رکھتا ہے۔ حکمران ظالم سفاک اور لٹیرے ہیں۔ مہنگائی، بے روزگاری عام ہے۔ آئے روز ٹیکس لگائے جاتے ہیں۔ بینکوں میں شرح سود میں اضافہ ہو رہا ہے حالاں کہ سود کے بارے میں اللہ تعالٰی نے واضح طور پر اپنا اعلان جنگ فرمایا ہے۔ ان حالات میں ہمارا فریضہ بنتا ہے کہ مشرکانہ جمہوری نظام میں پناہ ڈھونڈنے کی بجائے اللہ کی نازل کردہ شریعت میں اپنے لیے جائے پناہ ڈھونڈیں۔ ہماری تمام پریشانیوں کا حل شرعی احکام کے مطابق اپنی زندگیوں کو ڈھالنے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرنے میں ہے۔ آج ہمیں اس بات کا ادراک کر لینا

چاہیے کہ کفریہ نظاموں کے تحت زندگی گزارنے کے کتنے بھیانک نتائج نکلتے ہیں۔
ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کافرانہ نظاموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے کمر ہمت کس لیں اور نفاذِ اسلام کے لیے اپنی جان و مال تک کی قربانی سے دریغ نہ کریں۔
آیئے عہد کریں کہ اسلامی ریاست کے قیام کے لیے اپنا تن من دھن لٹا دیں گے ان شاء اللہ!

پاجا سراغِ زندگی

مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ کی طلبہ کے سامنے کی گئی تقریروں سے چند مفید اور فکر انگیز اقتباسات۔

پہلی بات یہ ہے کہ انسان جو کچھ بچپن میں سوچتا ہے بعینہ ان چیزوں کو اللہ تعالیٰ کسی نہ کسی موقع پر پورا کردیتا ہے، لہٰذا جو خیال کرو، جو آرزو و تمنا کرو بہت سوچ سمجھ کر کرو، ایسا نہ ہو کہ بعد میں تمہیں افسوس کرنا پڑے۔ یہ بڑے تجربے کی بات ہے بچپن کا خیال حقیقت بن کر سامنے آتا ہے۔ ابھی سے تم یہ ارادہ کرو کہ اسلام کا نام روشن کروگے، اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچاؤ گے، اسلام کے سچے اور مخلص داعی بنوگے، ایسا نہ سوچو جیسے بعض بچے سوچتے ہیں کہ ہم ٹی ٹی آئی بنیں گے اور مفت سفر کیا کریں گے یا تھانیدار یا اسی طرح کی اور بہت سی باتیں، یہ باتیں بری نہیں ہیں بلکہ تم کو اس سے بھی اونچا سوچنا چاہیے....

اللہ تعالیٰ کو بچپن کی کچھ معصومیت اتنی پسند ہے کہ اس وقت بچہ جو سوچتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو پورا کرتا ہے، تم اونچے سے اونچا ارادہ کرو اور اچھی سے اچھی آرزو کرو اور تم یہ آرزو کرو کہ اللہ نے جو پیغمبروں سے کام لیا وہ

ہم کریں گے، اللہ کے ولی اور دوست بنیں گے، ہم بہت بڑے عالم و فاضل بنیں گے اور اللہ کے بندوں کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچائیں گے۔

دیکھو! انسان کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ صلاحیت رکھی ہے کہ وہ سب کچھ بن سکتا ہے، فرشتہ بلکہ فرشتہ سے بھی بڑھ سکتا ہے اس لیے کہ انسان کے اندر بہت سی وہ صلاحیتیں ہیں جو فرشتوں میں نہیں ہیں، جب معاملہ یہ ہے کہ آدمی بہت کچھ بن سکتا ہے اور بہت بڑا بن سکتا ہے تو تم چھوٹی اور گری پڑی آرزوئیں کیوں کرو، تم ہمیشہ یہ آرزو کرو کہ اللہ ہمیں اپنے دین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے اور تم سے وہ کام لے جس کی زمانہ کو ضرورت ہے، ہماری آرزو تم سے یہی ہے اور خواہش اور تمنا بھی یہی ہے۔

آمین

(بحوالہ پاجا سراغ زندگی، ص 38)

ایک موقع پر فرمایا! آج کتنے بڑے بڑے فتنے ہیں جو اس وقت جہنم کے شعلوں کی مانند بھڑک رہے ہیں اور پورے پورے اسلامی ملکوں کو جلا کر خاکستر کر دینا چاہتے ہیں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی امیدوں پر پانی پھیر دینا چاہتے ہیں۔

آج قسم قسم اسلام سوز، ایمان سوز، اخلاق سوز، انسانیت سوز فتنے ابھر رہے

ہیں، مصر کی ناصریت، شام کی اشتمالیت اور اس کا کمیونزم ساری عرب دنیا کو اپنی آغوش میں لے لینے کے لیے بے چین ہے، مادیت، الحاد، قوم پرستی، نبوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے آنکھیں ملانے کے لیے تیار ہے، آج مسیلمہ کذاب نئے نئے روپ میں آرہا ہے اور نبوت محمدی کو چیلنج کر رہا ہے۔

آج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سرمایہ پر ڈاکا ڈالا جارہا ہے، آپ کے قلعہ میں .... شگاف پیدا کیے جارہے ہیں

خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہو، آج تمہارے لیے الحاد سے پنجہ آزمائی کا موقع ہے، تمہارے لیے دہریت اور مادیت سے آنکھ ملانے کا موقع ہے۔

ایک جگہ فرمایا: عزیز دوستوں! اس وقت کہنے کی باتیں بہت ہیں اور سب کو تفصیل سے بیان کرنا ممکن نہیں، لہٰذا ایک بات سنئے! اور کان کھول کر نہیں بلکہ دل کھول کر سنئے! اس لیے کہ اس میں آپ ہی کا فائدہ ہے، وہ بات یہ ہے آپ یہاں آئے ہیں تو اچھا بننے کی کوشش کیجیے، اگر کہے بغیر کام چل سکتا تو میں اپنا دل نکال کر آپ کے سامنے رکھ دیتا، لیکن خدا نے الفاظ کا محتاج بنایا ہے خود کلام الٰہی اس کی بیّن دلیل ہے۔ بہرحال میں یہی کہوں گا کہ قیمتی سے قیمتی بننے کی کوشش کیجیے اور یہی انسان کی فطرت ہے۔ اگر یہ جذبہ

انسان کے اندر نہیں تو وہ حیوان ہے۔ اسی جذبے کے تحت انسان وہاں تک پہنچ گیا جہاں تک فرشتے نہیں پہنچ سکے۔

عزیزوں ! ایک شخص کو کوئی چیز دفینہ ملی وہ اس کو لے کر جوہر شناس کے پاس آیا،

جوہر شناس نے کہا یہ ہیرا ہے اور بہت قیمتی ہے لیکن اس کی تین شرطیں ہیں۔

جب تک اس کو چمکایا نہیں جائے گا اور اس کے کونے برابر نہیں کیے جائیں گے اس (1) وقت تک وہ بے قیمت پتھر ہے۔

یہ بہت نازک ہے اگر کہیں سے چیخ گیا تو بیکار ہو جائے گا۔ (2)

....اگر یہ چیخ گیا تو پھر یہ درست نہیں ہو سکتا (3)

میرے عزیزوں ! میں خانہ خدا میں منبرِ مسجد کے پاس خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ ہیرا تمہارے پاس موجود ہے اور تم میں سے ہر شخص اس کا مالک ہے۔ وہ ہیرا تمہاری زندگی کی صلاحیت ہے، پڑھنے کی صلاحیت، فرمانبرداری کی صلاحیت اور بہتر ....بننے کی صلاحیت ہے، یہ وہ صلاحیتیں ہیں جن پر ملائکہ کو رشک آتا ہے

میں تم سے پوچھتا ہوں وہ کون بدنصیب ہوگا جو کامیاب بننا نہ چاہے، پتھر بھی

ترقی سے انکار نہیں کرتا، کائنات کا ذرہ ذرہ عروج و ترقی کا متمنی ہوتا ہے، ایک تخم کو دیکھو وہ ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا ایک درخت بن جاتا ہے اور ترقی کے آخری اسٹیج پر پہنچ جاتا ہے، لیکن تمہارا سفر ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا موت کے بعد تک جاری رہے گا اور تم ترقی کے مدارج طے کروگے، حتیٰ کہ تمہاری آسودگی دیدارِ الٰہی سے ہوگی اور یہ تمہاری آخری اور ابدی منزل ہے۔ تمہارا اولین فرض یہ ہے کہ تم دلوں میں عزم و ارادہ پیدا کرو، اس لیے کہ تم کو بہتر سے بہتر بننا ہے

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی
تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

(از پا جا سراغِ زندگی ص 59)

انگریزی پر عربی زبان کا اثر

انگریزی زبان میں عربی زبان کے بہت سے الفاظ پائے جاتے ہیں اور ان الفاظ سے نکلے ہوئے الفاظ علیحدہ ہیں۔ ان میں کچھ لفظ ایسے ہیں جو انگریزی زبان بولنے والے روزانہ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً زیرو، الکحل، صوفہ وغیرہ۔ عربی زبان کے جو الفاظ انگریزی زبان میں مستعمل ہیں ان میں سے زیادہ تر براہِ راست انگریزی زبان میں داخل نہیں ہوئے ہیں بلکہ دیگر زبانوں جیسے لاطینی، فرانسیسی اور ہسپانوی کے ذریعے داخل ہوئے ہیں۔ جو علمائے کرام بارھویں صدی عیسوی میں علم کیمیا، علم طب، علم نجوم اور علم الحساب کے متلاشی تھے انھوں نے عربی کتب کا ترجمہ لاطینی زبان میں کیا۔ قدیم اسپین میں عربوں کی بنائی ہوئی قرطبہ کی یونیورسٹی جس کی بنیاد نویں صدی میں پڑ چکی تھی، تمام یورپی ممالک کے طلبہ کی دلچسپی کا مرکز بنی۔ یہی صورت حال عرب اسپین کی دوسری یونیورسٹیوں میں پائی جاتی تھی۔

عرب فاتحین چھٹی صدی عیسوی سے لے کر پندرھویں صدی تک تقریباً آدھی دنیا پر حکومت کرنے لگے تھے اور ہر میدان میں چاہے وہ علمی ہو یا صنعتی، تجارتی ہو یا زراعتی، معاشی ہو یا سماجی ترقی کے ہر زینے پر پہنچ چکے تھے۔ یہی سبب ہے کہ دیگر اقوام کی تہذیب و تمدن اور زبان و فلسفہ پر عربی زبان اور عربی

تہذیب یعنی مسلم تہذیب کے اثرات نظر آتے ہیں۔ عربی زبان کے بعض الفاظ علم نباتات، علم نجوم، علم کیمیا، علم طبیعیات، علم الحساب، علم طب و جراحی، علم جغرافیہ، سیاحت، علم پارچہ بافی اور رنگ سازی کی اصطلاحات گھلے ملے ہیں۔ انگریزی میں ان کی شکلیں اصل سے بہت مختلف ہو گئی ہیں۔

ان الفاظ کی اصل جاننے کے لیے ان کی مختلف اشکال اور تلفظ پر نظر کرنا ضروری ہے۔ عموماً عربی زبان کے وہ الفاظ جو سولھویں صدی سے پیشتر انگریزی میں داخل ہوئے ہیں وقت کے ساتھ ساتھ انگریزی تلفظ کی بنا پر خالص انگریزی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں جیسے جبرالٹر (Gibralter) یعنی جبل الطارق، اوسینا (Avicinna) یعنی ابو علی سینا وغیرہ۔ موجود علم کیمیا میں کئی لفظ عربی سے ماخوذ ہیں جیسے لفظ الکمی (Alchemy) کے معنی ہیں پگھلی ہوئی دھات، عربی (Chyma) یعنی کیمیا گری۔ یونانی زبان میں کیمیا بنا اور انگریزی میں عربی زبان سے داخل ہوا۔ اسی طرح لفظ Alchemy میں یہ ال اکسیر کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ اس کا اصل یونانی لفظ زیران (Elixir) الگزیر ہے جس کی کچھ خصوصیات تھیں۔ ان خصوصیات کی بنا پر یہ عربی میں "ال (Xerion) اکسیر" ہو گیا اور اس کے بعد لاطینی زبان سے ہوتا ہوا چاسر کے انگریزی کلام میں داخل ہوا۔

عربی لفظ ہے لیکن یہ مرکب شے عربوں کی پیدا کردہ نہیں ہے۔ (Alcohal) الکحل

اس کا پہلے پہل تذکرہ نویں یا دسویں صدی کی اطالوی زبان میں ملتا ہے۔ مسلمان الکحل کو ایک سفوف کی حیثیت سے جانتے تھے جو ابرں کو رنگنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔
کا ماخذ ہے۔ "انٹی "K" عربی لفظ القلی، پوٹاشیم کی کیمیائی علامت (Alkali) الکلی
منی" کا اصل عربی لفظ "التمد" ہے جو ایک دھات ہے۔ علم کیمیا کو باقاعدہ سائنس کی شکل دینے والے مسلمان ہیں کیونکہ اس میدان میں جہاں یونانی صرف صنعتی تجربات اور دھندلے نظریات رکھتے تھے وہاں عرب کے باشندے باقاعدہ مشاہدات اور مکمل
یعنی قرنبیق ایجاد کیا اور اس کا (Alembic) تجربات کیا کرتے تھے۔ انھوں نے المبک نام رکھا "المبک۔" یہ ایک ایسا برتن ہے جس کی مدد سے تجربہ گاہ میں بھپکا دیا جاتا ہے۔ آج بھی دنیا کی ایک مشہور دواساز کمپنی "المبک" کے نام سے موسوم ہے۔
جس کی (Zero) علم الحساب کے میدان میں عربی زبان کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ زیرو طاقت علم حساب میں سب سے زیادہ سمجھی جاتی ہے، عربی کے زیر اثر وجود میں آیا۔
میں محمد بن احمد اپنی کتاب "سائنس کی کنجیاں" میں لکھتے ہیں کہ اگر گنتی میں کوئی 976 عدد عشری جگہ پر نہ ہو تو ایک چھوٹا سا دائرہ استعمال کرنا چاہیے تاکہ اعداد کی قطار قائم رہے۔ مسلمانوں نے اس دائرے کو "صفر" یعنی خالی کہا۔ لاطینی علما نے صفر کو زیفرم
میں تبدیل کر دیا اور بعد میں اطالویوں نے اس کی تخفیف کر کے (Zepherum)
اسے زیرو بنا دیا، یہی زیرو آج

یعنی عربی "اعشاریہ" عہد مامون (Algorism) انگریزی میں مستعمل ہے۔ الگورزم
کے مشہور ریاضی داں محمد بن موسیٰ الخوارزمی کی نسبت سے یہ لفظ بنا ہے۔ 813
میں الخوارزمی نے اپنے نجومی خاکوں میں ہندوستانی اعداد استعمال کیے۔ اس کے بعد
الگورزم کے معنی ہو گئے ہر وہ حسابی طریقہ جو عشری علامت پر منحصر ہوتا ہے اور یہی
نظریہ آج بھی مروج ہے۔

علم فلکیات اور علم نجوم میں بھی عربی زبان کے الفاظ انگریزی زبان میں در آئے ہیں
وغیرہ۔ (Almanac) المیانک (Zenith) زنت (Azimuth) مثلاً اریمت
اریمت" اس قوس آسمانی کو کہتے ہیں جو سمت الّراس سے افق تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ"
عربی لفظ سمت سے بنا ہے۔ "زنت" کے معنی سمت الراس کے ہیں یعنی آسمان میں وہ نقطہ
جو دیکھنے والے کے ٹھیک سر پر ہو۔ آج کل یہ لفظ عام زبان میں نقطہ عروج کی اصطلاح
(Lute) کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ آلات موسیقی اور ان کے نام جیسے لوٹ
وغیرہ عربی زبان (Guitar) گٹار (Rebeck) ریبک (Tamburine) تمبورین
سے بنا ہے۔ عربی ریبک (Al=Ud) کے رہین منت ہیں۔ "لوٹ" عربی لفظ ال۔اد
آلہ موسیقی ہسپانوی زبان میں ریبل (Rebible) یا ربائبل (Rebeck)
کہلانے لگا اور آج بھی یہ لفظ پرتگالی (Rebeca) اور پرتگالی میں ریبیکا (Rebel)
کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ (Violin) میں وائلن

فن تعمیر میں بھی عربی زبان کے بعض الفاظ مثلاً "مینار" جس کے معنی روشنی

سے بنا ہے یعنی وہ (Madhana) لفظ مدھانہ (Minaret) کے گھر کے ہیں۔ مینارٹ
اور جبرالٹر (Admiral) جگہ جہاں سے موذن کھڑے ہو کر اذان دیتا ہے۔ اڈمرل
عربی الفاظ سے بنے ہیں۔ "اڈمرل" یعنی بحری بیڑے کا افسر اعلیٰ (Gibralter) بھی
عربی زبان کے دو الفاظ امیر (سردار) اور البحر (سمندر) سے مل کر بنا ہے۔ اڈمرل اسی
امیر البحر" کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کپڑوں کی کئی قسمیں ان عرب ممالک کے نام سے"
کے زمانے میں فسٹیین (Chancer) موسوم ہیں جہاں وہ تیار کیے جاتے تھے۔ چانسر
کا بنا ہوا تھا جو مصر (Fustat) کے نام سے جو کپڑا مشہور تھا وہ فستات (Fustian)
نامی کپڑا پہلے پہل (Damask) کے مسلمان حکمرانوں کا اولین پایہ تخت تھا۔ دمسک
ململ)) (Muslin) دمشق میں جو کہ دنیائے تجارت کا بڑا مرکز تھا بنایا گیا۔ مسلن
اسے اطالوی تاجر موصل سے درآمد کیا کرتے تھے۔ بغداد اطالوی زبان میں بل ڈاکو
کہلاتا ہے۔اس طرح وہ ریشمی کپڑا جو بغداد میں بنایا جاتا تھا اور جو آج (Baldaco)
کے نام (Baldachino) کل گرجا گھروں میں زینت کے لیے لٹکایا جاتا ہے بل ڈاچنو
سے مشہور ہوا۔

کے نام سے مشہور ہے۔ بغداد کا اٹابیا (Taffeta) ٹفیٹا (Taftah) ایران کا تفتھا
یا "اتاب" محلّہ جہاں ایک صحابی کے خاندان والے رہتے تھے بارھویں (Atabiya)
صدی عیسوی میں ایک خاص قسم کے کپڑے کے لیے مشہور تھا جو اسپین میں پہنچ کر "اٹابی
سلک" کے نام سے مشہور ہوا۔ فرانس اور اٹلی میں یہ ٹابس

کے نام سے رائج ہوا اور آج بھی اسی نام سے پورے یوروپ میں معروف (Tabis) ایک قسم کا رنگ ہے جو ایران میں بھی اسی نام سے مشہور تھا۔ (Lilac) ہے۔ للاک یہی رنگ آج کل سلک کے کپڑوں کی رنگائی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اِملی کو انگریزی کہتے ہیں۔ ہندوستان میں عربوں نے جب پہلے پہل اِملی کے (Tamrind) میں ٹامرنڈ درختوں کی کثرت دیکھی تو انھوں نے اس کو "ثمرالہند" یعنی ہندوستان کا پھل کہا۔ لفظ ثمر کا حرف "ث" انگریزی میں "ت" یا "ٹ" بن گیا اور "الہند" کا مخفف "انڈ" ہو گیا۔ اس طرح ثمرالہند بگڑتے بگڑتے انگریزی زبان میں "ٹامرنڈ" بن گیا۔ اورنج بھی عربی سے ماخوذ ہے۔ اور "نارنج" سے بنا ہے۔ اصل لفظ "نارنج" (Orange) تھا جو "نارنج" میں بدلا اور بعد میں "اورنج" میں تبدیل ہو گیا اور یہی انگریزی میں مستعمل ہے۔

سوگر (Lemon) عربی لفظ "شراب" سے بنا ہے۔ اسی طرح لیمن (Syrup) سیرپ ٹیرف، (Cheque) صوفہ، چیک، (Matress) بازار، کارواں، میاٹرس (Sugar) (Tariff)، (Magazine) میگزین، (Risk) رسک، (Almameter) المامیٹر، اور کئی دوسرے الفاظ عربی زبان کے زیر اثر وجود میں آئے ہیں اور انگریزی، ہسپانوی، اطالوی اور دوسری یورپی زبانوں میں مستعمل ہیں۔ بہت سے مسلمان عرب علما کے نام بھی انگریزی زبان میں اس طرح گڈمڈ ہو گئے ہیں کہ وہ خالص انگریزی نام معلوم (Averoes) ہوتے ہیں جیسے ابن رشد (مشہور فلسفی) انگریزی میں اِوروس

اور (Avicinna) کے نام سے مشہور ہیں۔ ابن سینا مشہور فلسفی و سائنس داں اوِسنا

کے نام سے مشہور و معروف ہیں۔ (Avenzoa) عظیم طبیب ابن زہر

توکل علی اللہ اور عشق رسول

آپ نے اُس جنگ کا حال تو ضرور سن رکھا ہو گا کہ ایک طرف چھوٹا سا لشکر تھا، چند مرگھلے گھوڑے، چند ٹوٹی تلواریں، اور دوسری طرف ایک لشکر جرّار' ہاتھی گھوڑے' تیر وسناں اور اسلحہ کا انبار.... ساتھ ناچتی گاتی 'قومی حمیت کے جذبات ابھارتی میراثنیں بھی تھیں، مگر ہوا کیا؟ اس سب کے باوجود شکست بڑے لشکر کا مقدر بنی اور فتح چھوٹے لشکر کو نصیب ہوئی اور حریف کی ساری نفری میدان چھوڑ کر بھاگ نکلی یا نیست ونابود ہو گئی۔

ممکن ہے کبھی آپ نے اس کے اسباب وعلل پر بھی غور کیا ہو.... یہ اتنی گہری بات نہیں.... یقیناً چھوٹے لشکر میں زیادہ بے جگری، جوش وجذبہ ہوگا اور کوئی مثبت مقصد بھی کہ بے مقصد جنگ بجائے خود ایک کمزوری ہے، مگر صرف یہی عوامل وعناصر نہیں، اس کے سوا بھی اسباب ہوں گے۔ کم تعداد اور بے سروساماں لشکر میں آزمودہ کار' ہوش مند اور منصوبہ ساز ہوں گے۔ سپہ سالار سے عام سپاہی تک سب ایک زنجیر کی کڑیوں کی طرح آپس میں متحد ہوں گے، جوش وجذبہ کے ساتھ تحمل و تدبر کا بھی غیر معمولی مظاہرہ کیا گیا ہو گا۔ سپہ سالار کی جنگ کی بساط پر گہری نظر' مہروں کو آگے بڑھانے میں احتیاط، پیش نظر میدانوں

سے بہ خوب آگہی٬ بروقت فیصلے، دشمن کی کمزوریوں پر نگاہ٬ اس پر نفسیاتی دباؤ ڈالنے کے حربے.... یہ سب اسباب ہوں گے لیکن !.... لیکن تاریخ نے ازل سے جاری حق و باطل کی جنگ کے٬ اس سب سے خاص اور فیصلہ کن معرکہ کے ذکر میں ان تمام اسباب کا ذکر بہت سرسری انداز میں کیا ہے اور.... اس سے سوا اور کچھ اس سے بڑھ کر ایک اور سبب کا ذکر بڑے شد و مد سے کیا ہے اور وہ ہے محبت.... شدید محبت....جی ہاں وہی فاتح عالم محبت، جو ایک بار کسی دل کو اپنا مسکن بنالے تو پھر جان تو جاتی ہے لیکن محبت رسوا نہیں ہوتی.... اُن کے رگ و ریشے میں بھی اپنے رب اور اس کے پیمبر کی محبت کچھ طرح سرایت کر گئی تھی کہ ان کے نحیف و لاغر بدن٬ دشمنوں کے لیے سنگ و آہن کی وہ دیوار بن گئے جسے پار کرنا دشمنوں کے بس کی بات نہ رہی۔

اپنے سپہ سالار سے شدید محبت، اس کے وعدوں پر یقین اور اس کے فرمودہ ارشادات پر پختہ ایمان ہی وہ ہتھیار تھا جس کی وجہ سے کم نفری، کم وسائل لشکر کے اِن فدائی سپاہیوں نے اپنے آخری سپاہی تک جانبازی اور سرفروشی کے وہ لازوال مظاہرے پیش کیے٬ جو قیامت تک کے لیے اس باب میں ضرب المثل بن گئے۔

مذکورہ بالا ایمان و کفر کے عظیم الشان معرکے کے بعد امت مرحومہ پر پچھلے

چودہ سو انتیس برسوں میں کئی آزمائشیں آئیں' ایسی ایسی ہولناک آزمائشیں کہ ہم جیسے کم ظرفوں کو آج ان کا تذکرہ پڑھتے ہوئے بھی پسینہ آجائے اور پتہ پانی ہونے لگے.... مثلاً حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد جھوٹے نبی کا ظہور ہو یا سبائی منافقوں کی چیرہ دستیاں.... منگولوں کی یلغار ہو یا صلیبی جنگیں....!! ہر ہر آزمائش ایسی ہے کہ امت مسلمہ کے علاوہ کسی اور پر آتیں تو بلاشبہ آج اس کا روئے زمین پر کوئی نشاں نہ ملتا.... جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ یہ امت اللہ تعالیٰ پر کامل ایمان کے ساتھ تمام مصائب و مشکلات کو نہ صرف جھیلتی رہی بلکہ ہر محاذ، ہر میدان میں دیر سویر فتح کے جھنڈے گاڑتی رہی۔

دراصل اس امت کا خمیر ہی کچھ ایسی مٹی سے اٹھایا گیا ہے کہ مشقتیں اور سختیاں اس کے حق میں ؟؟ بن جاتی ہیں اور آسانیاں اور آسائشیں اس کے لیے سمّ قاتل.... اندلس کی مثال ہمارے سامنے ہے.... آٹھ سو سال کی شان دار حکومت اور یورپ میں مسلمانوں کا قائدانہ کردار لیکن جب مسلمانوں نے گھوڑے کی پشت چھوڑ کر شان دار محلات کو اپنا مسکن بنا لیا تو پھر وہ درگت بنی کہ انتہائی ذلت و رسوائی کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں اپنے گھر کی چابیاں صلیبیوں کے حوالے کرنی پڑیں۔ لیکن اس کے بانسبت جب مسلمانوں نے دنیاوی جاہ و حشم جھٹک کر توکل علی اللہ کو اپنا زادِ راہ بنایا اور آخرت کو اپنی منزل قرار دیا تو

اللہ جل شانہ نے انہیں کم وسائل کے باوجود ہر محاذ پر فتح یاب کیا۔

دور کیوں جائیں، ہمارے پڑوسی افغانستان کی سرزمین میں ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیسری "مدعی سپرپاور" کی درگت اور وہ بھی بوریا نشیں افغانوں کے ہاتھوں قرآن پاک کی آیت "کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ" کی شاندار تفسیر نظر آتی ہے۔ شروع کی سطور میں جس جنگ "غزوہ بدر" کا نقشہ پیش کیا گیا اس کا پرتو آج ہمیں افغانستان میں نظر آرہا ہے۔ بے سروساماں طالبان افغانستان کی سرزمین پر اتنے مضبوط ہو چکے ہیں کہ 150000 غیر ملکی فوجیوں کی موجودگی کے باوجود افغان انتظامیہ کا کٹھ پتلی سربراہ کابل کے قلب میں زمینی راستے سے سفر نہیں کر سکتا اور امریکی چھتری تلے اس کی حکومت چند صوبوں کے چند اضلاع تک محدود ہو کر رہ گئی ہے ۔صورت حال ان صلیبیوں کے حق میں اتنی مخدوش ہو چکی ہے کہ پچھلے دنوں قابض غیر ملکی فوج کا سپہ سالار جنرل میک کرسٹل دنیا بھر کے سامنے اپنے گلے میں رسوائی کا طوق ڈالے گھر سدھار گیا۔جب فوج کا سپہ سالار ہمت چھوڑ دے تو فوجیوں کی ذہنی واخلاقی حالت ہوگی ، یہ امریکی فوجیوں میں خودکشی کی شرح میں مسلسل اضافہ سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے ۔تازہ خبر ہے کہ کینیڈا اور اٹلی ایک سال کے اندر اپنے فوجیوں کو واپس بلانے کا عندیہ دے چکے ہیں۔ کیوں کہ اب جنگ جاری رکھنے کی استعداد ان میں نہیں رہی۔ صرف قابض فوجوں کے سرخیل امریکا کی بات لے لیں تو تازہ

ترین خبر کے مطابق رواں سال کے دوران امریکا کو ایک کھرب ڈالر سے زائد خسارے کا سامنا ہے۔ دس فیصد سے زیادہ بے روزگاری نے امریکی حکومت کی نیندیں اڑا دی ہیں۔ پھر امریکی فوجیوں کی ہلاکتوں میں بھی تیزی کی وجہ سے اسے خود اپنے ہی شہریوں کی تند و تیز تنقید کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

صورت حال کچھ ایسی ہو گئی ہے کہ امریکا اور اس کے حواریوں کو اب اپنے ماتھے پر شکست صاف لکھی نظر آ رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امریکا کی اب ہر ممکن کوشش یہی ہے کہ کسی طرح افغانستان سے باعزت واپسی ہو جائے۔ اسی لیے طالبان کے ہاتھوں میدانوں میں مسلسل بدترین ہزیمت اٹھانے کے بعد اب ان کے ساتھ مذاکرات کا ڈھونگ رچایا جا رہا ہے۔ طالبان کمانڈروں کے نام اقوام متحدہ کی بلیک لسٹ سے نکالے جانے کی بات ہو رہی ہے اور ۲۰۱۱ء تک امریکا اپنی افواج کو افغانستان سے نکالنے کا اعلان کر چکا ہے۔۔۔۔ یہ سب قدرت کے تماشے ہیں۔پڑوسی ملک کے خداترس بوریا نشینوں نے ثابت کر دیا ہے کہ اگر مقصد اعلیٰ اور نیت میں اخلاص ہو، صفوں میں اتحاد اور ہوش مند ومدبر سپہ سالار ہو اور سب سے بڑھ کر زادِ راہ توکل علی اللہ اور ہم راہ عشق رسول ہو تو بنی اسرائیل کا فرعون ہو یا آج کا بدمست فرعون ! ایک ضربِ کلیمی انہیں ذلت کے جوہڑوں میں غرق کرنے کے لیے کافی ہے۔

حسنِ خلق

مولانا محمد اسلم شیخوپوری

حسن خلق کا تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ بھی ہے اور بندوں کے ساتھ بھی، ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ حسن خلق یہ ہے کہ مذکورہ پورے شرح صدر کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی پر عمل کرے، محرمات تو کیا بعض مباحات کو بھی اللہ کی رضا کے لئے چھوڑ دے اور دوسری طرف اس کا حال یہ ہو کہ فرائض اور واجبات کے علاوہ نفلی عبادات بھی خوب رغبت اور محبت کے ساتھ ادا کرے۔

لوگوں کے ساتھ حسنِ سلوک یہ ہے کہ ہر کسی کے ساتھ نیکی کرنے کی کوشش کرے اور اپنے قول و عمل سے کسی کو تکلیف نہ دے، احسان کرنے والوں کو بہتر سے بہتر بدلہ دے اور زیادتی کرنے والوں کو معاف کردے اگر کوئی مسلمان بیمار ہو تو اس کی عیادت کرے، تنگدست ہو تو اس کی امداد کرے، مقروض ہو تو اسے مہلت دے، یہ نہ دیکھے کہ دوسرے میرے ساتھ کیا کرتے ہیں، یہ دیکھے کہ مجھے اللہ کی رضا کے لئے دوسروں کے ساتھ کیسا معاملہ کرنا چاہئے، اس کی گفتگو میں محبت اور اپنائیت کی خوشبو ہو، قرآن کریم کی وہ تمام آیات حسنِ اخلاق ہی سے تعلق رکھتی ہیں جن میں اعزاء و اقربا، یتیموں، مسکینوں، بیواؤ ں مسافروں اور عام انسانوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کا حکم دیا گیا ہے یا وہ آیات جن میں

ظلم کی مذمت اور عدل کی تعریف ہے، متکبرین کی برائی اور متواضعین کی مدح ہے، سیہ کے جواب میں حسنہ اور زیادتی کے جواب میں احسان کرنے کا حکم ہے، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی حسنِ اخلاق کی تاکید فرمائی ہے اور اس کے بے پناہ فضائل بیان فرمائے ہیں، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اہل ایمان میں سب سے کامل ایمان اس شخص کا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں اور تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے ساتھ سب سے زیادہ خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرے۔ (ترمذی)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھے اس لئے بھیجا گیا ہے تاکہ میں اچھے اخلاق کی تکمیل کروں۔" (مسند احمد)

ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ اللہ کے نبی وہ کون سی چیز ہے جو سب سے زیادہ دخولِ جنت کا سبب بنتی ہے، آپ نے فرمایا "اللہ کا تقویٰ اور خوش خلقی" پھر پوچھا گیا وہ کون سی چیز ہے جس کی وجہ سے عام طور پر لوگ جہنم میں داخل ہوں گے آپ نے فرمایا "منہ اور شرم گاہ"۔ (ترمذی)

اب آیئے! اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی میں حسن اخلاق کی چند

جھلکیاں بھی دیکھ لیجئے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ جو کچھ کہتے تھے وہ کرتے بھی تھے، آپ کے قول و عمل میں کوئی تضاد نہ تھا اور آپ کی زندگی قرآن کریم کی چلتی پھرتی تصویر اور عملی تفسیر تھی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اہل مدینہ کی لونڈیوں میں سے کوئی بھی لونڈی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر جہاں چاہتی تھی لے جاتی تھی۔ (بخاری) یعنی آپ ہر کسی کی خدمت اور حاجت برآری کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے، چاہے وہ امیر ہو یا غریب، آزاد ہو یا غلام اور لونڈی، اپنا ہو یا پرایا، اور اس میں کسی قسم کی عار محسوس نہیں فرماتے تھے۔

حضرت ام خالد رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں اپنے والد کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی، اس وقت میں نے زرد رنگ کی قمیض پہنی ہوئی تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تو بہت خوش ہوئے اور اس قمیض کی بہت تعریف فرمائی، میں مہر نبوت کے ساتھ کھیلنے لگی، اس پر میرے والد نے مجھے ڈانٹا لیکن آپ نے فرمایا اسے کھیلنے دو پھر آپ نے اس قمیض کے بارے میں دعا فرمائی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں خوب پہننے اور پرانا کرنے کی توفیق نصیب فرمائے چنانچہ (آپ کی دعا قبول ہوئی) وہ قمیض اتنا عرصہ استعمال ہوتی رہی کہ لوگوں میں اس کی بقا کے تذکرے ہونے لگے۔ (بخاری)

ایک چھوٹی سی بچی جو نسبی اعتبار سے رشتہ دار بھی نہیں ہے، سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے جسمِ اطہر کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کرتی ہے، اس کا والد اس چھیڑ چھاڑ کو محسوس کرتا اور اسے بے ادبی سمجھتا ہے لیکن اللہ کے وہ نبی جو حسنِ اخلاق کی مجسم تصویر تھے قطعاً برا نہیں مناتے بلکہ الٹا اس بچی کی دلجوئی فرماتے ہیں۔ اس کے پیراہن کی تعریف فرماتے اور دعائیں بھی دیتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی ہے، آپ نے مجھے کبھی اف تک نہیں کیا، نہ ہی کسی کام کے کرنے پر یہ فرمایا کہ تو نے کیوں کیا اور نہ ہی چھوڑنے پر فرمایا کہ تو نے یہ کام کیوں نہ (کیا اور آپ انسانوں میں سب سے زیادہ خوش اخلاق تھے۔" (صحیح بخاری

یہ اس خادم کی گواہی ہے جسے ایک دو سال نہیں پورے دس سال خدمت کی سعادت حاصل ہوئی اور جسے آپ کی داخلی اور خارجی، ازدواجی اور معاشرتی زندگی کا ہر پہلو دیکھنے کا موقع ملا، یہ بات حیرت انگیز ہے کہ عام انسانوں کے برعکس جو لوگ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے جتنے زیادہ قریب تھے اور جنہیں آپ کی معاشرت اور معاملات زیادہ سے زیادہ دیکھنے کا موقع ہاتھ آیا وہ اتنے ہی زیادہ آپ

کے مداح تھے ورنہ کئی مشہور شخصیات اور لیڈر ایسے ہوتے ہیں جن کے حسنِ اخلاق اور اصول پرستی وغیرہ کی شہرت تو بہت ہوتی ہے لیکن جب ان کے ساتھ عملی واسطہ پڑے اور انہیں پرکھنے اور قریب سے دیکھنے کا موقع ملے تو وہ عوامی ہیرو بالکل زیرو ثابت ہوتے ہیں۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اب بھی وہ منظر میرے سامنے ہے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں سے ایک نبی (اور درحقیقت خود اپنی ہی) کے بارے میں بتا رہے تھے کہ اسے اس کی قوم نے مار مار کر زخمی کر دیا، وہ اپنے چہرے سے خون پونچھتے ہوئے اللہ سے دعا کر رہے تھے: اے میرے رب! میری قوم کو معاف فرما دے کیونکہ یہ جانتے نہیں ہیں۔ (بخاری) دوستوں اور محسنوں کے ساتھ بداخلاقی تو ایک طرف اپنے بدترین دشمنوں کے لئے بھی آپ کے دامن میں مغفرت کی دعاؤں اور حسنِ اخلاق کے سوا کچھ نہ تھا، ہم جو آپ کے نام لیوا ہیں کیا ہم بھی ایسے خوش اخلاق ہیں؟ نہیں ہرگز ہرگز نہیں! ہماری بداخلاقی اور بدمعاملگی تو پوری دنیا میں مشہور ہو چکی ہے ہاں ہم میں سے بعض جو خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہیں تو اپنے مطلب اور غرض کے لئے اور یا پھر ان دشمنان دین کے سامنے جو اس وقت قوت و طاقت اور سیاست کے سرچشموں پر قابض ہیں اور جنہیں ہر اعتبار سے مادی ترقی اور عروج حاصل ہے۔

اللہ تعالٰی ہمیں محض اس کی رضا کی خاطر حسن اخلاق کا مظاہرہ کرنے کی توفیق نصیب فرمائے۔

خبریں و دریں

پاکستان میں جہاں دوسرے شعبوں کا حال بیان سے باہر ہوچکا ہے اسی طرح عوام کے لیے خوراک کے حوالے سے جو کچھ صورت حال ہے اس کی کچھ جھلک پچھلے دنوں چند خبروں کے آئینے میں دیکھی جاسکتی ہے جو ہمارے اخلاقی نظام کے ساتھ خوفِ خدا کے حوالے سے بھی اپنے اندر بعض سوالات رکھتی ہے۔ تینوں خبروں کا خلاصہ چند الفاظ میں یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ اب ہمارے لیے ہر چیز "جائز" اور "حلال" ہوچکی ہے، چاہے وہ جو بھی اور جیسی بھی ہو اور صرف "پیسے" کے حصول کے لیے ہر اقدام درست ہے۔ چاہے اس کے نتیجے میں کسی کی جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ ویسے تو ان تین رپورٹوں ہی پر سب کچھ منحصر نہیں اس حوالے سے اور بھی بہت کچھ سامنے آتا رہتا ہے لیکن ان خبروں کو وضاحت سے پیش کرنے کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر صاحبان اختیار میں کوئی خدا کا خوف رکھنے والا بندہ باقی رہ گیا ہے تو وہی اس کے لیے کچھ کرے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کل اس کا یہی ایک اقدام خود اس کے کسی اپنے پیارے کی جان بچانے کا سبب بھی بن جائے کہ نیکی رائیگاں نہیں جاتی۔ تو پڑھیے پاکستان کے تین بڑے شہروں کی عوام کی صحت کے حوالے سے عبرت ناک رپورٹیں .... جو بلاشبہ پوری قوم کے لیے بھی لمحہ فکریہ ہیں، پہلی خبر کچھ اس طرح سے ہے:

پشاور (نمائندہ ایکسپریس) یورپ میں پالتو کتوں کے لیے تیار کردہ" K9 کے نام سے چپس پشاور میں سرعام فروخت کیے جا رہے ہیں اور اس معاملے پر صوبائی حکومت اور محکمہ صحت نے چپ سادھ رکھی ہے، پشاور سمیت دیگر اضلاع میں گلی گلی دکانوں پر 5 روپے فی پیکٹ دستیاب ہیں، یہ چپس مختلف نجی اسکولوں میں بھی بچوں کو فراہم کیے جارہے ہیں، دکانداروں کے مطابق یہ چپس انہیں پشاور ہی سے سپلائی کیے جارہے ہیں، جب انہیں بتایا کہ K9 یورپ اور امریکا میں پالتو کتوں کو کھلائے جاتے ہیں تو انھوں نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔"

اس رپورٹ کے مطابق پشاور کی ایک دکان پر کتوں کے کھانے کے چپس فروخت کے لیے رکھے ہوئے ہیں، جن پر ان کا نام بالکل صاف پڑھا جاتا ہے اور ایک ننھا بچہ اسی مال سے ایک پیکٹ خرید کر لے جارہا ہے۔ اس پر تبصرہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہم اپنے اس معصوم بچے کی طرح ایک پوری نسل کو صرف چند دھیلے کمانے کے لیے آخر کیا کھلا رہے ہیں! یہ رپورٹ اب صرف ایک خبر نہیں رہی، ہماری تاریخ کا ایک حصہ بن چکی ہے۔ کل یہ بچہ بڑا ہوگا۔ تو اس کے دل و دماغ پر کیا اثرات مرتّب ہوں گے؟ کیا ہم نے یہ سب کچھ سوچ لیا ہے! کل یہ بچہ بڑا ہوگا تو ہم کو یہ نہیں کہے گا کہ میں تو چھوٹا سا بچہ تھا۔ مجھے تو کچھ نہیں معلوم تھا۔ مجھے کتوں کے لیے بنائے گئے چپس کیوں کھلا دیے گئے.... اس کا

جواب کون دے گا؟! اور کیا.... ؟ کیا ہمارے پاس اس بچے کے آیندہ وقت میں کیے جانے والے اس سوال کا کوئی جواب ہے؟

اور لیجیے دوسری خبر جو کچھ اس طرح سے ہے:

لاہور (نمایندہ جنگ) لاہور ہائی کورٹ کے مسٹر جسٹس میاں ثاقب نثار نے بغیر" لائسنس کے منرل واٹر کے نام پر مضر صحت پانی تیار کرکے فروخت کرنے والی 28 کمپنیوں کو شوکاز نوٹس جاری کردیے ہیں کہ کیوں نہ ان کمپنیوں کو ختم کردیا جائے۔ عدالت نے لائسنس یافتہ تمام کمپنیوں کو ہدایت کی کہ وہ ایک ماہ میں اپنے لائسنسوں کی تجدید کرائیں۔ عدالت نے یہ حکم ملٹی نیشنل کمپنیوں کے تیار کردہ منرل واٹر کی خرید و فروخت کے خلاف دائر کیس کی سماعت کے دوران دیے۔ درخواست گزار بیرسٹر ظفر اللہ خان نے موقف اختیار کیا ہے کہ ملٹی نیشنل کمپنیاں عوام کو منرل واٹر کے نام پر مضر صحت اور غیر معیاری پینے کا پانی فروخت کررہی ہیں جس سے لوگ موذی امراض کا شکار ہورہے ہیں۔ عدالت کو بتایا گیا کہ 53 کمپنیوں میں سے 28 کمپنیوں کے پاس لائسنس ہی نہیں ہیں۔ اس کے باوجود وہ یہ کاروبار کررہی ہیں۔ اس پر عدالت نے ان کمپنیوں کو " شوکاز نوٹس جاری کردیے۔

اس اقدام پر معزز عدالت کا شکریہ تو پوری قوم کو ادا کرنا چاہیے۔ یہاں ابھی سوال صرف یہ پوچھا جاتا ہے کہ ایسی کمپنیاں راتوں رات تو وجود میں نہیں آ سکتیں۔ نہ ہی چند دنوں میں اتنا بڑا کاروبار پھیلا سکتی ہیں۔ ملک کے معاملات پر نظر رکھنے والے درجنوں اداروں کو یہ کمپنیاں اور ان کا کاروبار بالکل نہیں نظر آیا جو ایک قانون داں کو اس سلسلے میں عدالت کے دروازے پر دستک دینا پڑی ہے۔ معزز عدلیہ کو قوم کی جانب سے ایک بار پھر سلام اور شکریہ!

تیسری رپورٹ جو آگے پیش کی جا رہی ہے.... دراصل ان پہلی دونوں رپورٹوں کا محض ایک اور "عکس" ہے اور خود سرکاری منصب دار کی طرف سے جاری ہونے پر اس کی اہمیت اور زیادہ واضح ہو چکی ہے۔ رپورٹ ملاحظہ فرمایئے:

کراچی (اسٹاف رپورٹر) صوبائی وزیر ماحولیات و متبادل توانائی شیخ محمد افضل (خالد عمر)" نے جمعہ کو اپنے دفتر میں ایک اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے کہا ہے کہ سیوریج کے گندے اور صنعتوں کے آلودہ زہریلے پانی سے کاشت کی گئی سبزیاں انتہائی مضر صحت ہیں لہٰذا عوام انہیں کھانے سے پرہیز اور انہیں خریدنے سے اجتناب کریں۔ صوبائی وزیر نے ڈائریکٹر جنرل ای پی اے نعیم احمد مغل کو اس حوالے سے فوری طور پر ایکشن لینے اور زہریلے پانی سے سبزیاں کاشت

کرنے والے کھیت مالکان کے خلاف فوری ایکشن لینے اور اس سلسلے میں تفصیلی رپورٹ پیش کرنے کی ہدایت کی۔ شیخ محمد افضل نے کہا کہ ایک شہر کی ضرورت کا 20 سے 30 فیصد حصہ اس قسم کی زہریلی سبزیوں سے پورا کیا جا رہا ہے جس کے نتیجے میں مذکورہ سبزیاں استعمال کرنیوالے پیٹ کے کیڑے، ہیضے، ملیریا، پیٹ اور جگر کے مختلف امراض میں مبتلا ہو رہے ہیں۔ دیگر سبزیوں کے مقابلے میں گندے اور زہریلے پانی سے کاشت کی جانے والی سبزیاں زیادہ ہری بھری اور چمکیلی ہوتی ہیں جس کی وجہ صنعتی فضلے میں موجود الیکلز، ڈائیز اور کاپر کے کمپاؤنڈ کی موجودگی ہے۔ اس پانی سے کاشت کی جانے والی سبزیوں کے استعمال سے انسان اعصابی اور دیگر مہلک بیماریوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، مسلسل استعمال سے جگر کی بیماریوں کے ساتھ کینسر لاحق ہونے کا خطرہ بھی ہوتا ہے۔

انسانی اسمگلنگ سات ارب ڈالر کا کاروبار

کوئی مرد یا عورت جو میلان کی کسی گلی میں ہرمس کے سکارف اور رولیکس کی گھڑیاں سستے داموں فروخت کر رہی ہوگی خود بھی غیر قانونی تارک وطن ہو سکتی ہے جو جعلی کاغذوں یا خفیہ راستوں سے بھاری رقم ادا کرکے اور اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر کئی براعظموں کو پار کرکے روزگار کمانے کے لیے وہاں پہنچی ہو۔ نئے قسم کی غلامی،.بردہ فروشی اور سستی محنت فراہم کرنے کا یہ کاروبار منشیات فروشی اور اسلحہ کے کاروبار اور مقبول عام ٹریڈ مارکوں کی نقلی اشیاء کی فروخت کرنے جتنی اہمیت رکھتا ہے اور عالمی سرمایہ داری نظام کا ایک تحفہ ہے اور بقول شاعر

یہاں ہر چیز بکتی ہے خریدارو بتاؤ کیا خریدو گے

ادارہ اقوام متحدہ کے مطابق انسانی سمگلنگ کا کاروبار سالانہ سات ارب ڈالر سے زیادہ کا ہے اور بہت تیزی سے ترقی پذیر ہے۔ ایک اندازے کے مطابق صرف امریکہ میں سالانہ پانچ لاکھ لوگ غیر قانونی طریقے سے داخل ہوتے ہیں۔ یورپی یونین کے ملکوں میں بھی اتنے ہی لوگوں کی ناجائز درآمد کا اندازہ ہے۔ تقریباً پندرہ کروڑ لوگ ہیں جو اپنے ملکوں سے باہر کے ملکوں میں روزگار کمانے پر مجبور ہیں جن میں سے بہت سے اس مقصد کے لیے ۵۳ ہزار ڈالر تک خرچ

کرتے ہیں، سب سے زیادہ خرچہ کرنے والے چینی ہیں جو امریکہ میں بہتر روزگار کے لیے آتے ہیں۔ بے شمار لوگ سمگل کرنے والے اداروں کے ہاتھوں فروخت بھی کیے جاتے ہیں۔ اس نظام کی ہوس زر نے انھیں ایک جنس بنا دیا ہے۔ یو ایس کانگریس کی ریسرچ سروس کا اندازہ ہے کہ ہر سال دس لاکھ سے بیس لاکھ لوگ ناجائز اور غیر قانونی طریقے سے سرحدیں پار کرتے ہیں جن میں اکثریت عورتوں اور بچوں کی ہوتی ہے۔ تیمیسورا (رومانیہ) کی ایک عورت پچاس ڈالر میں خرید کر دو سو ڈالر میں فروخت کی جاتی ہے اور مغربی یورپ کے بردہ فروشوں کو دس گناہ منافع ہوتا ہے، کیسا نفع بخش کاروبار ہے؟ یونیسف نے اندازہ لگایا ہے کہ وسطی اور مغربی افریقہ کے ملکوں سے سالانہ دو لاکھ بچے خرید کر غلام بنائے جاتے ہیں جو ان عورتوں کو ملازمتوں کا اور بچوں کو بہتر والدین کی تحویل میں دینے کا لالچ دیا جاتا ہے، بہتر زندگی کے خواب دکھائے جاتے ہیں اور بہتر زندگی کے خوابوں کی کمائی میں اس نظام کی سب سے بڑی کمائی ہے جو عالمی سطح پر ڈراؤنے خوابوں میں تبدیل ہو رہی ہے اور خود اس نظام کی جڑیں کھوکھلی کر رہی ہے۔

ان غلام لڑکیوں اور لڑکوں کو واپس ان کے ملکوں میں بھیج دینے یا گرفتار کرا دینے یا جسمانی ایذا پہنچانے کے خطرات سے دوچار کرنے یا قرضوں میں جکڑ کر

ان کے پاسپورٹ چھین کر انھیں انتہائی کریہہ جرائم کا نشانہ بننے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ انتہا
ئی سخت قوانین اور زبردست انتظامات کے باوجود اس تجارت کا سد باب نہیں ہو سکتا۔
SANGATTECAMP صرف برطانیہ کے گرفتار شدہ غیر قانونی تارکین وطن کے کیمپ
میں ۲۴ ہزار سے ۵۰ ہزار بچے اور عورتیں موجود ہیں جن کو ان کے وطن واپس بھیجنا
برطانیہ کے لیے مسئلہ بنا ہوا ہے۔ انھیں واپس بھیجنے میں برطانیہ کو کم از کم ۳۴ سال کا
عرصہ درکار ہوگا۔ برطانیہ ایک جزیرہ ہونے کی وجہ سے نسبتاً محفوظ سرحدیں رکھتا ہے
مگر امریکہ، سپین اور اٹلی جیسے ممالک اپنی سرحدوں کی زیادہ حفاظت نہیں کر سکتے۔
منشیات، آتشیں اسلحہ، دو نمبر کی تجارت،، بردہ فروشی کے علاوہ انسانی اعضاء رئیسہ،
آنکھوں کی پتلیوں، گردوں، پھیپھڑوں کی ناجائز تجارت بھی بہت زوروں پر ہے۔ تیزی
سے معدوم ہونے والے جنگلی جانوروں، مصوری اور سنگ تراشی کے نایاب نمونوں اور
مضر صحت فضلے کی ناجائز تجارت نے بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل کر لی ہے۔ ان
کاروباروں کی بعض تفصیلات انہی صفحات میں آئندہ بیان کی جائیں گی مگر مختلف ملکوں
سے سرمائے کی سمگلنگ اور اسے "محفوظ جنت" تک پہنچانے کے کاروبار کی ایک مثال
GAYMAN جزیرہ پیش کرتا ہے جہاں کی کل آبادی ۶۳ ہزار نفوس سے زیادہ نہیں مگر
اس جزیرے میں دو ہزار دو سو میوچل فنڈز ہیں، ۵۰۰ انشورنس کمپنیاں ہیں، ۶۰ ہزار
سے زیادہ تجارتی ادارے ہیں اور ۶۰۰ بینک ہیں

جن میں بددیانت معاشروں کی بددیانت کمائی کے ۸۰۰ ارب ڈالرز کا سرمایہ موجود ہے اور یہ جزیرہ "کالی دولت" کو دھونے کی سب سے بڑی لانڈری سمجھی جاتی ہے مگر عالمی سرمایہ داری نظام اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا کیوں کہ یہ "لانڈری" بنائی ہی اسی مقصد کے لیے گئی ہے۔

فنِ تشہیر

بچپن کی سرحدوں کو پھلانگنے والے نوجوان گدھے نے اپنی بات سے اپنے بوڑھے باپ کو چونکا دیا۔

"کیا کہا تم نے، کیا ہو سکتا ہے؟" بوڑھے گدھے نے پوچھا۔

"بابا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ میں یہ کام کر سکتا ہوں۔"

"مگر یہ تو بتاؤ کہ تم کون سا کام کر سکتے ہو بیٹے؟" بوڑھے گدھے نے پوچھا۔

"اب میں .... شیر کی کھال پہن سکتا ہوں۔ کوئی پہچان بھی نہ سکے گا۔ اس طرح ہم ان سب کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہمیں ماضی کے تجربات سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔"

"تمہیں اس گدھے کا حشر یاد نہیں جس نے شیر کی کھال پہن کر شیر بننے کی کوشش کی تھی۔" بوڑھے گدھے نے کہا۔

"وہ احمق تھا۔" نوجوان گدھے نے جوش میں کہا: "اِدھر اس نے ہینگنا شروع کیا، اُدھر لوگوں کو اس کی اصلیت کا پتہ چل گیا۔"

نوجوان گدھے نے شیر کی کھال میں اپنے آپ کو چُھپالیا۔ اب وہ شیر ہی نظر آ رہا تھا۔ کھال اوڑھ کر جوان گدھا بڑی شان سے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگا۔

بوڑھے گدھے نے کہا: اچھی کھال ہے.... اب ذرا شیر کی طرح دھاڑ کر دکھاؤ۔"

نوجوان گدھے نے اپنا منہ کھولا مگر اس کے منہ سے جو آواز نکلی، وہ ہینگنے کی نہ تھی بلکہ کسی طاقتور اور جوان شیر کے دھاڑنے کی آواز تھی۔ بوڑھا گدھا اتنا حیران ہوا کہ وہ زمین پر گر گیا اور تقریباً آدھا منٹ آنکھیں جھپکتا رہا۔

"واقعی تم تو دھاڑ رہے تھے۔"

ہاں! تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ اصل چیز تشہیر ہوتی ہے۔ وہ چیز نہیں جس کی "تشہیر کی جاتی ہے۔ میری دھاڑ اصلی ہے۔ اندر سے میں گدھا ہوں تو کسی کو کیا خبر۔

بوڑھے گدھے کی زبان کی نوک پر ایک بات آتے آتے رہ گئی "تھوتھا چنا باجے گھنا۔" مگر اس نے چپ رہنے ہی میں بہتری سمجھی اور پوچھنے لگا۔

"مگر میں حیران ہوں کہ تم نے سچ مچ شیر کی طرح دھاڑنا کس طرح سیکھ لیا۔"

نیا زمانہ.... نئے اطوار.... " نوجوان گدھے نے اتراتے ہوئے کہا۔ "میں ایک مدت سے شیروں کا مشاہدہ اور مطالعہ کر رہا ہوں۔ اب تو کوئی شیر بھی میرے مقابلے میں "دھاڑ کر نہیں دکھا سکتا۔

غرور کا سر نیچا" بوڑھے گدھے کے دل میں یہ الفاظ گونجے اور اس بار ہمت کر کے وہ" ان الفاظ کو زبان پر لے آیا۔

بندر کیا جانے ادرک کا مزہ" نوجوان گدھے نے اپنے بوڑھے باپ پر طنز کرتے ہوئے" کہا۔

"میٹھی گھاس بھی بوڑھوں کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کے نیچے جاکر کڑوی ہو جاتی ہے۔"
گھاس کے ذائقے کا پتہ کھانے سے چلتا ہے۔" بوڑھے گدھے نے کہا "اب تم باتیں کم"
"اور کام زیادہ دکھاؤ۔
شیر کی کھال میں مگن اور اِتراتا ہوا نوجوان گدھا قریبی گاؤں کی طرف چل پڑا۔ گاؤں کے باہر اسے ایک کُتا دکھائی دیا۔ گدھے کو توقع تھی کہ کُتا اسے شیر سمجھ کر بھاگ جائے گا مگر کُتا بڑی بے نیازی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا۔
تم بھاگے کیوں نہیں۔" گدھے نے پوچھا۔"
میں بھلا کیوں بھاگتا؟" کُتے نے بڑی بے نیازی سے پوچھا "اگر تم دھاڑتے ہوئے" یہاں آتے تو پھر میں یقیناً بھاگ اُٹھتا۔ پھر یہ کہ مجھے بھلا کیا علم کہ تم شیر کی کھال میں گدھے نہیں ہو۔ ایک بار تو ایسا ہو چکا ہے نا۔ وہ گدھا جس نے شیر کی کھال اوڑھ رکھی
".... تھی یاد آیا
"یاد آیا...." گدھے نے کہا "مگر تمہیں پتہ چل جائے گا کہ میں کون ہوں۔"
یہ کہہ کر اس نے منہ کھولا اور دھاڑنے لگا۔
واقعی.... تم تو شیر ہو۔" یہ کہہ کر کُتا دُم دبا کر بھاگا۔"
دو فرلانگ تک کُتا بھاگتا چلا گیا۔ جب وہ تھک گیا تو ایک جگہ رُک کر سستانے لگا پھر اپنے پنجے سے جسم کو کھجایا اور اپنے آپ سے کہنے لگا "دھاڑا تو وہ شیر کی طرح تھا مگر وہ شیر نہیں تھا۔ گدھا تھا، جو شیر کی کھال پہنے لوگوں

”کو بے وقوف بنا رہا ہے۔ میں ابھی جا کر اپنے آقا کو خبردار کرتا ہوں۔

کُتا تیزی سے بھاگتا ہوا اپنے مالک کے پاس پہنچا۔

آقا! ایک احمق گدھا شیر کی کھال اوڑھے پھر رہا ہے۔ اپنی چھڑی اُٹھائیے اور اس کی“
”مرمت کر دیجیے۔

یہ تو میں کروں گا ہی۔“ کُتے کے مالک نے کہا ”میں اس ناہنجار کو خوب پیٹوں گا جو اتنی“
”اوچھی اور باسی حرکت کے ساتھ لوگوں کو دھوکا دے رہا ہے۔

آقا! مجھے آپ سے یہی امید تھی“ کُتے نے خوش ہو کر کہا۔“

کُتا اور اس کا مالک تھوڑی دُور ہی گئے ہوں گے جب انہوں گدھے کو دیکھا جو شیر کی کھال میں تھا اور غرا رہا تھا۔

کُتے کے مالک نے کہا: ”گدھے کے بچے! ابھی جب تم میری چھڑی کی ضرب سہو گے تو
”اپنی اصلیت جان جاؤ گے۔

میں اسے اپنے دانتوں سے نوچ لُوں گا۔“ کُتے نے کہا۔“

مرد چھڑی لیے آگے بڑھا۔ اس نے گدھے کو مارنے کے لیے چھڑی اوپر اُٹھائی۔ گدھے نے منہ کھولا اور دھاڑنے لگا۔ شیر کی دھاڑ! اور آگے بڑھ کر مرد کے بازو پر بھی دانت دے مارے۔ مرد خوف سے چیخا۔ چھڑی اس کے ہاتھ سے گری اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگنے لگا۔ وہ ایک میل تک بھاگتا چلا گیا۔ کُتا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ جب وہ دم لینے کے لیے رُکا تو کُتے نے کہا۔

”....آقا آپ کیوں بھاگ رہے تھے؟ وہ تو گدھا تھا“

بکواس نہ کرو، وہ شیر تھا۔ شیر کی طرح دھاڑ رہا تھا۔ اس نے میرے بازو پر کاٹا بھی"
ہے۔ خاموش رہو۔ تم نے تو مجھے مروا ہی دیا تھا۔"
مگر میرے آقا۔ آپ مجھے بات کرنے کی اجازت تو دیں۔ میں چند لفظوں میں ثابت"
کرسکتا ہوں کہ وہ شیر نہیں۔ گدھا تھا۔"
لفظ نہیں۔ دنیا میں عمل پر نظر رکھی جاتی ہے۔" یہ کہہ کر کُتّے کے مالک نے کُتّے کو"
پیٹنا شروع کردیا۔
ایک آسٹریلوی کہانی

ٹائی فائڈ بخار

ٹائی فائڈ ایک متعدی بخار ہے جو "سالمونیلا ٹائی فی" نامی جرثومے سے پھیلتا ہے۔
سالمونیلا نامی جرثومے کی کئی اور اقسام بھی ہوتی ہیں جو انسانی آنتوں کو نشانہ بناتی ہیں اور ان کی وجہ سے جو بخار ہوتا ہے اسے امعائی یعنی آنتوں کا بخار کہتے ہیں۔
سو سال پہلے دنیا بھر میں یہ مرض ہر سال بے شمار اموات کا سبب بنتا تھا، لیکن اب جن ملکوں میں معیار زندگی بہتر ہو گیا ہے، لوگوں میں صحت کا شعور پیدا ہو گیا ہے، صحت و صفائی کے انتظامات بہتر ہو گئے ہیں اور صاف پانی کی فراہمی ہو گئی ہے وہاں اس کا زور بہت کم ہو گیا ہے۔
ٹائی فائڈ جراثیم کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ یہ صرف انسانوں میں پھلتے پھولتے ہیں اور ایک انسان ہی سے دوسرے کو لگتے ہیں۔ اس طرح انسان ہی اس مرض کو پھیلاتے ہیں۔ جن لوگوں کو یہ بخار ہوا ہو' ان میں صحت یابی کے بعد بھی یہ جراثیم کم از کم ایک سال تک موجود رہتے ہیں۔
اس بخار کے جراثیم ہمارے جسم میں جراثیم سے آلودہ غذا' دودھ اور پانی کے

ذریعے سے داخل ہوتے ہیں۔ ٹائی فائڈ سے متاثر افراد اور وہ بھی جن کے جسم میں یہ جراثیم عرصہ سے پل رہے ہوں' لاکھوں کی تعداد میں انہیں اپنے فضلے میں خارج کرتے ہیں۔ یہ جراثیم مریض کے خون، بلغم، قے اور جسم سے خارج ہونے والے دیگر سیالات میں موجود ہوتے ہیں۔ ان اشیاء پر بیٹھنے والی مکھیاں اور دیگر کیڑے مکوڑے کھانے پینے کی اشیا میں یہ جراثیم پہنچاتے ہیں جن کے کھانے سے دوسرے افراد بھی اس مرض کا شکار ہو سکتے ہیں۔

سمندری کستورا مچھلی اور دیگر صدفیہ (سیپی والی) مچھلیوں میں یہ جراثیم سمندر میں شامل ہونے والے گٹر کے اور ڈرینج کے گندے پانی سے داخل ہو کر انہیں بھی آلودہ کر دیتے ہیں۔

ٹائی فائڈ سے متاثر شخص سے دوسرے شخص میں داخل ہونے کے بعد یہ جراثیم بعض کے جسم میں تین دن، دس دن اور ساٹھ روز تک خاموش رہتے ہیں، یعنی اس مدت تک یہ لوگ بیمار نہیں پڑتے۔ یہ عرصہ ان کی حضانت کی مدت کہلاتا ہے۔ اس عرصہ میں یہ جسم میں اپنی تعداد میں اضافہ کرتے ہیں۔ حضانت کی مدت کا تعلق جراثیم کی مقدار سے ہوتا ہے۔ یہ کم ہوں گے تو دیر سے اور زیادہ ہوئے تو جلدی بیمار ڈال دیں گے۔

بخار کا آغاز

ٹائی فائڈ کی جسے عرف عام میں میعادی بخار بھی کہتے ہیں، ابتدائی علامات فلو یعنی نزلہ وبائی جیسی ہوتی ہیں۔ مریض سر میں درد، تھکن اور بھوک نہ لگنے کی شکایت کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ سردی کے ساتھ بخار بھی رہتا ہے، لیکن فلو کے برخلاف یہ بخار عام طور پر تیز رہتا ہے جو روزانہ بڑھتا جاتا ہے۔ یہ بخار ۲۰۱ سے ۴۰۱ تک پہنچ جاتا ہے۔

جراثیم کا حملہ کمزور ہو تو بخار کا سلسلہ عموماً ایک ہفتے تک اور زیادہ ہو تو آٹھ ہفتوں تک جاری رہتا ہے۔ اس بخار کی ایک خاص علامت یہ بھی ہوتی ہے کہ تیز ہونے کے باوجود نبض کی رفتار سست رہتی ہے۔ مرض بڑھنے کے ساتھ مریض زیادہ بیمار اور نڈھال ہوتا جاتا ہے اور دوسرے ہفتے میں اس کی ناک سے خون بہنے کا امکان پیدا ہو جاتا ہے۔ ٹائی فائڈ کے جراثیم چوں کہ آنتوں کو نقصان پہنچاتے ہیں، اس لیے مریض پیٹ میں تکلیف محسوس کرتا ہے۔ پیٹ پھول جاتا ہے اور قبض کی شکایت ہو جاتی ہے۔ بعض مریضوں کو دورانِ مرض اسہال کی شکایت بھی ہو سکتی ہے اور پہلے ہفتے کے ختم یا دوسرے کی ابتدا میں اس کے سینے اور پیٹ کے بالائی حصے پر گلابی رنگ کے دھبے نمودار ہو سکتے ہیں۔

ٹائی فائڈ سے مریض کا دماغ اور اعصاب بھی متاثر ہو سکتے ہیں جس کی وجہ سے وہ سر میں سخت درد کی شکایت کرتا ہے اور بحرانی کیفیت بھی طاری ہو سکتی ہے۔ معائنہ کرنے سے اس کا جگر اور تلی بھی بڑھی ہوئی ہو سکتی ہے۔ تیسرے یا چوتھے ہفتے تک بخار دھیرے دھیرے کم ہو کر

دیگر علامات اور دھبے غائب ہو جاتے ہیں۔

پیچیدگیاں

بیسویں صدی میں ٹائی فائڈ کی جو مؤثر اینٹی بایوٹک دوا تیار ہوئی وہ "کلورم فینی کول" ہے۔ اس سے پہلے ٹائی فائڈ سے ہلاکتوں کی شرح ۲۱ سے ۲۳ فی صد ہوتی تھی اور زیادہ تر اس مرض کی جن دو اہم پیچیدگیوں سے مریض ہلاک ہوتے تھے وہ تھیں: آنتوں سے خون کا اخراج اور آنتوں میں ہونے والے سوراخ۔ مؤثر اینٹی بایوٹک دواؤں کی وجہ سے یہ خطرہ اب ۲ فیصد بلکہ اس سے بھی کم ہو گیا ہے۔

آنتوں سے جریان خون:

ٹائی فائڈ کے جراثیم کی وجہ سے آنتوں کے لمفی ریشے پھول جاتے ہیں جن کی وجہ سے آنتوں کی اندرونی دیوار یا حصے خون کی رگیں چھلنے لگتی ہیں اور ان سے خون رسنے لگتا ہے۔ بعض اوقات بہت زیادہ خون بہہ نکلتا ہے جس سے مریض کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔ یہ شکایت عام طور پر مرض کے دوسرے ہفتے میں لاحق ہوتی ہے۔ مریض کے درجہ حرارت اور بلڈ پریشر میں بھی یکایک کمی ہو جاتی ہے۔

آنتوں میں سوراخ:

آنتوں کو پہنچنے والا صدمہ گہرا ہو کر آنتوں کی آخری سطح یا پرت تک جا

پہنچتا ہے جس سے بالآخر ان میں سوراخ ہو جاتے ہیں۔ یہ عام طور پر تیسرے ہفتے میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں مریض کے پیٹ میں سخت درد ہوتا ہے اور اسے دبانے سے اسے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔

دوسری پیچیدگیاں

ان جراثیم سے جسم کے دوسرے ریشے یا بافتیں بھی متاثر ہو سکتی ہیں جس کی وجہ سے ان میں پیپ دار زخم بن جاتے ہیں۔ یہ بھی اس مرض کی بڑی سنگین پیچیدگی ہوتی ہے جو عموماً جگر، پتے، جوڑوں، دماغ اور پھیپھڑوں میں واقع ہوتی ہے۔ سالمونیلا ٹائی فی جراثیم پتے میں داخل ہو کر بخار کے ختم ہونے کے بعد بھی اس چھوت کا اہم ذریعہ بنے رہتے ہیں۔ یوں سمجھیے کہ مریض کا پِتّا ان جراثیم کا ذخیرہ گاہ بن جاتا ہے اور ایسے لوگ یہ جراثیم دوسروں کو پھیلانے کا ایک ذریعہ بنے رہتے ہیں۔ اعصابی نقصانات میں بہرا پن قابل ذکر ہے۔ یہ اس بخار کی بہت بعد میں ظاہر ہونے والی پیچیدگی ہوتی ہے۔

کیریئر:

پتے کے ٹائی فائڈ کے جراثیم کی زد میں آنے کے بعد مریض صحت یابی کے باوجود ان سے نجات نہیں پاتا، اس لیے وہ ان جراثیم کا چلتا پھرتا ذریعہ بن کر رہ جاتا ہے اور اس کی اجابت کے ساتھ یہ جراثیم برسوں بلکہ عمر بھر خارج ہوتے

رہتے ہیں۔ اندازاً ۳ فی صد مریض اس کے پرانے جراثیم بردار بن جاتے ہیں اور ان میں زیادہ تعداد خواتین اور بوڑھوں کی ہوتی ہے۔ ان سب میں بہت سوں کو یہ یاد بھی نہیں ہوتا کہ انہیں کبھی ٹائی فائیڈ بھی ہوا تھا۔ ایسے افراد انسانی صحت کے لیے خطرہ بنے رہتے ہیں خاص طور پر اگر کھانے پینے کی چیزیں فراہم کرنے کا کام کرتے ہوں تو انجانے میں یہ جراثیم اپنے گاہکوں کو پہنچاتے رہتے ہیں، اس لیے یہ بہت ضروری ہے کہ ایسے تمام افراد کا باقاعدہ طبّی معائنہ ہو۔ گرما گرم اشیاء تو ان جراثیم سے محفوظ ہو سکتی ہیں لیکن کھانے پینے کی ایسی بے شمار اشیاء ہوتی ہیں جن میں ان افراد کے ذریعے سے یہ جراثیم داخل ہو سکتے ہیں۔

مریض کی صحت یابی کے بعد سکھ کا سانس لے کر نہیں بیٹھنا چاہیے بلکہ دورانِ مرض کے علاوہ صحت یابی کے بعد بھی مریض کے خون اور پیشاب کا معائنہ کرواتے رہنا چاہیے۔

وائڈل ٹیسٹ:

بخار کے دوران مریض کا جسم جراثیم کا مقابلہ کرنے کے لیے بڑی تعداد میں دافع اجسام اینٹی باڈیز) تیار کرتا ہے۔ ان کی تعداد کا کھوج جس ٹیسٹ سے لگایا جاتا ہے وہ وائڈل) ٹیسٹ کہلاتا ہے۔ اس سے مرض کی تشخیص میں بھی مدد

ملتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ جسم میں ان کی تیاری کی رفتار تیز ہے یا ست۔ اب کئی نئی اینٹی بایوٹک دوائیں دستیاب ہیں جو ماہر ڈاکٹر اپنے مریض کی بلڈ ٹیسٹ رپورٹ دیکھ کر تجویز کر سکتا ہے۔ عموماً دیکھا گیا ہے کہ ان دواؤں کے خون اور جگر پر خراب اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ مریض ان دواؤں کے ذیلی اثرات سے سخت خارش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں خود سے دوا بند کرنے کی بجائے اپنے ڈاکٹر سے رجوع کرنا چاہیے۔

:بہتر تیمارداری

دوائی علاج کے علاوہ ٹائی فائڈ کے مریض کی سب سے اہم ضرورت بہتر تیمارداری ہے جس میں اس کے آرام کے علاوہ صحیح اور مناسب غذاؤں کے ذریعے سے اس کے جسم کی قوت مدافعت کو مستحکم رکھنا بہت ضروری ہے۔ مریض کی دیکھ بھال بڑی توجہ سے ہونی چاہیے تاکہ وہ اوپر بیان کی ہوئی پیچیدگیوں سے محفوظ رہے اور علامات جیسے ہی ظاہر ہوں، ضروری معالجاتی اقدامات میں بالکل دیر نہیں ہونی چاہیے۔

چوں کہ یہ ایک انتہائی متعدی مرض ہے، اس لیے مریض کو آرام سے بالکل الگ تھلگ رکھنا چاہیے۔ اس کے کپڑے،، برتن، تولیے وغیرہ کھولتے پانی سے صاف کرنے کے علاوہ پیشاب، اجابت وغیرہ کو بڑی احتیاط سے ٹھکانے لگانا چاہیے بلکہ ان

کا ٹیسٹ کروا کر پوری طرح اطمینان کر لینا چاہیے کہ ان میں جراثیم ختم ہو گئے ہیں۔ یہ کام ہر ہفتے ہونا چاہیے یہاں تک کہ بالکل کلیئر رپورٹ آ جائے۔

:احتیاطی تدابیر

ٹائی فائڈ یا دوسرے انفیکشنز جب کبھی محدود پیمانے پر لاحق ہو یا وسیع پیمانے پر، درج ذیل احتیاطی تدابیر بہت مفید ثابت ہوتی ہیں:

☆ گھر کے علاوہ محلے اور بستیوں میں صحت و صفائی کے انتظامات بہتر کیے جائیں۔ صاف اور ابلا ہوا پانی ہی استعمال ہو۔

☆ کھانے پینے کی اشیاء مکھیوں وغیرہ سے محفوظ رکھی جائیں اور انہیں تیار کرنے والوں کو پوری احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

☆ بازاری کھلی اشیاء ہرگز استعمال نہ کی جائیں اور صرف خوب گرم کی ہوئی چیزیں ہی کھائی جائیں۔ خاص طور پر دودھ اچھی طرح ابلا ہوا ہونا چاہیے۔

☆ وبا پھوٹ پڑے تو ایسے افراد کا کھوج ضرور لگانا چاہیے جن میں اس کے جراثیم موجود ہوں۔ یہ کھوج ان کے فضلات کے ٹیسٹ سے لگایا جا سکتا ہے۔

☆ ٹائی فائڈ کے حفاظتی ٹیکے بھی لگوائے جا سکتے ہیں، لیکن سب سے بہتر یہی ہے کہ احتیاط کی جائے۔ اس کا ٹیکا دو ہفتوں کے وقفے سے لگتا ہے جس کا اثر برقرار رکھنے کے لیے ہر تین سال بعد یہ لگوانا پڑتا ہے۔ اس سے مقامی طور پر درد کے علاوہ بخار بھی ہو سکتا ہے۔ بارہ سال سے کم عمر بچوں کو اس کی آدھی

خوراک دی جا سکتی ہے لیکن دو سال سے کم عمر بچوں کے لیے یہ ضروری نہیں ہوتا۔

دوران سفر احتیاط:

☆ صرف احتیاط سے تیار کردہ محفوظ غذائیں کھانی چاہئیں۔

☆ چھلکے والے پھل ہی استعمال کیے جائیں۔ ان کا چھلکا اتارنے سے پہلے انہیں خوب اچھی طرح دھو لینا چاہیے۔ بازاروں میں کھلی بکنے والی گنڈیریاں، مٹھائیاں، کٹے ہوئے پھل اور ان کے رس بالکل استعمال نہ کیے جائیں۔

☆اگر ہوٹل میں کھانا بہت زیادہ مجبوری ہو تو کھانا تازہ اور خوب گرم کیا ہوا کھائیے کیوں کہ تازہ اور گرم خوراک میں جراثیم ختم ہو جاتے ہیں۔ ٹھنڈی اور کھلی چیزوں کو ہاتھ نہ لگائیے۔

☆ کوشش کیجیے کہ اپنے ساتھ ابلے ہوئے پانی کی بوتل رکھیے اور اسے ہی استعمال کیجئے۔بوتل بند پانی سے بھی حتی الامکان احتراز کیجیے کیوں کہ اِن میں بھی بہت کم معیاری ہوتی ہیں۔

گھریلو ناچاقیوں کا حل کہاں ہے؟

پیروں کے آستانوں میں یا اللہ و رسول کی اطاعت میں

میاں بیوی خاندان کی بنیادی اکائی سمجھے جاتے ہیں، عقدِ نکاح کے بعد دونوں کا تعلق استوار ہوتا ہے جو اس دنیا میں موت تک قائم رہتا ہے۔ یہ سارا عرصہ دونوں کو مل جُل کر گزارنا ہوتا ہے.... اس حقیقت سے کسی کو جائے فرار نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی طبیعت اور مزاج مختلف بنائے ہیں۔ طبیعتوں کا اختلاف اور مزاجوں کا سرد و گرم ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ خاندانی زندگی میں دونوں فریقوں میں سے کسی ایک کا دوسرے سے الجھ جانا انہونی بات نہیں مگر اس الجھاؤ کا طویل ہو جانا خطرناک ہوتا ہے۔ آج کے دور میں خاندانی جھگڑے اتنے عام ہو گئے ہیں کہ معمولی بات پر مار پٹائی، طلاق اور قتل تک نوبت پہنچ جاتی ہے۔ آپ اخبارات اٹھا کر دیکھ لیں درجنوں خبریں میاں بیوی کے جھگڑوں کی ہوں گی.... جھگڑے ہوتے ہیں تو لوگ ان کے حل کے لئے تگ و دو کرتے ہیں.... زیادہ تر پیروں فقیروں کے پاس بھاگتے ہیں.... آپ پیروں فقیروں کے آستانوں پر چلے جائیں آدھے سے زیادہ مرد و خواتین خاندانی جھگڑوں کو ختم کرانے کے لئے تعویز لینے آئے ہوں گے۔ کسی کی بیوی روٹھ کر میکے گئی ہو گی اور کسی کا خاوند دوسری عورت کے دام زُلف کا اسیر ہو گا، کسی کو شکایت ہو گی کہ اس کی

نند نے تعویذ کردئے اور کوئی کہے گی کہ میرے اوپر ساس نے کالا جادو کروا دیا ہے۔
پیر صاحب بھی اپنے آستانے پر راجہ اندر بنے بیٹھے کسی کو پانی دم کرکے دے رہے ہوں گے، کسی کو تعویذ اور کسی کو دھاگے پڑھ کے دے رہے ہوں گے۔ آنے والے مجبوروں کا کچھ بنے نہ بنے پیر صاحب کی تو چاندی ہو جاتی ہے، دم درود کا نذرانہ تو ہے ہی غیر محرم عورتوں کو دیکھ دیکھ کر آنکھیں سینکنے کا بہانہ بھی بن جاتا ہے۔ نام نہاد پیروں نے جنوں بھوتوں کی بھی عجیب و غریب ڈراؤنی قسم کی کہانیاں گھڑی ہوتی ہیں جو اپنے مریدوں اور سائلوں کے سامنے بیان کر کرکے انہیں خوب ڈراتے دھمکاتے اور ان سے پیسے بٹورتے ہیں۔ کتنے ہی گھرانے پیروں فقیروں کے چکروں میں تباہ ہو چکے ہیں، کتنے ہی پیروں کے واقعات ہیں کہ اسی دم درود کے چکر میں گناہوں کی دَل دَل میں جا گرے ہیں جہاں سے واپسی کا امکان کم ہی ہوتا ہے.... خیر بات بہت دور نکل گئ عرض یہ کرنا چاہتا تھا کہ ہماری سادگی کی بھی انتہا ہے کہ ہم قرآنی آیات کے ورد کرنے، وظیفے پڑھنے اور چلّے کاٹنے کے لئے طرح طرح کی مشقتیں برداشت کرتے ہیں۔
اگر کوئی پیر صاحب کہہ دیں کہ چالیس دن تک روزانہ آدھی رات کے بعد تم قبرستان جاکر فلاں وظیفہ پڑھوگے تو اولاد ہوگی تو اس کے لئے فوراً تیار ہو جائیں گے لیکن اگر کوئی یہ کہہ دے کہ پانچ وقت کی نماز پڑھو، اپنے مال کی زکوۃ دو، تقویٰ اور پاکیزگی اختیار کرو، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کوتاہی نہ کرو جو مانگنا ہے اللہ سے مانگو، تو طبیعت پر بہت

گراں گزرتا ہے۔ الحمدللہ یہ بندہ پورے یقین واعتماد سے کہتا ہے کہ اگر کسی گھر میں حرام داخل نہ ہوتا ہو، زکوٰۃ اور صدقہ و خیرات کا اہتمام ہو، اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود کو پامال نہ کیا جاتا ہو، اس کے احکام کی تعمیل کی جاتی ہو، طہارت و پاکیزگی کا اہتمام ہو تو اس گھر میں جن، بھوت پریت، آسیب کا کبھی ڈیرا نہیں ہو سکتا، نہ ہی اس گھر میں لڑائی دنگا فساد ہوگا، آپس کی ناچاقی، ایک دوسرے کے خلاف بُغض و کینہ، دوسرے کو پریشان اور رسوا کرنے جیسے ناپاک جذبات قطعاً پیدا نہیں ہوں گے۔ گھریلو ناچاقیاں اسی وقت ہوتی ہیں جب اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدوں کو پامال کیا جاتا ہے۔ آج کا انسان جب گھریلو پریشانیوں سے تنگ آتا ہے تو پیروں فقیروں کے پاس بھاگتا ہے کہ وہ کوئی "وظیفہ" بتائیں.... پیر بتائے کہ روز ایک لاکھ مرتبہ "یَاعَزِیزُ" پڑھنا ہے تو کیا اس طرح پڑھ لینے سے مسئلے کا حل ہوجائے گا؟ جبکہ گھر میں ٹی وی چل رہا ہے، عورتیں بے پردہ ہیں، حرام کی کمائی دھڑا دھڑ پیٹ کا ایندھن بن رہی ہے.... ایک حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ بعضے پریشان حال اور پراگندہ لوگ یارب یارب پکارتے ہیں لیکن ان کی دعائیں قبول نہیں ہوتیں.... اس لئے کہ ان کا کھانا حرام، پینا حرام، پہننا حرام ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ صدقہ کیا کرو اس سے بلائیں اور بیماریاں دور ہوتی ہیں" لیکن ہمارے بھولے بھالے مسلمان کا عمل یہ ہے کہ وہ یتیموں مسکینوں اور غریبوں کو تو اپنے دروازے سے دھکے دے کر بھگاتا ہے جبکہ ایک تعویذ حاصل

کرنے کے لئے عاملوں کی تجوریاں بھرنے کے لئے تیار رہتا ہے.... یہ مسلمان کی سادگی نہیں کہ وہ قرآن کی آیتوں کو گھول کر پی گیا، تعویذ بنا کر گلے کا ہار بنالیا، نئی دکان بنائی یا مکان تعمیر کیا تو "برکت" کے لئے سیپارے پڑھوالئے، گھر والوں میں سے کوئی بیمار ہوگیا تو سورہ یٰسین کا ورد کرالیا.... کوئی مرگیا تو اُسے بخشوانے کے لئے سوا لاکھ گٹھلیوں پر درود پڑھوالیا.... لیکن اگر کچھ نہ کرسکا تو قرآن کے پیغام پر غور و فکر نہ کرسکا، اسے دل کی گہرائیوں اور دماغ کی وسعتوں میں جگہ نہ دے سکا.... کبھی یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی کہ میرا رب مجھ سے کیا کہتا ہے.... ہا!.... میری قوم کتنی سادہ مزاج ہے۔ محترم قارئین و قاریات! جائزہ لیجئے غلطی کہاں ہے؟ ہمارا کردار و عمل کیا ہے؟ دین کے تقاضے کیا ہیں؟ سوچئے کہ قرآن کی سورتیں بھوت پریت کو بھگانے کے لئے اتریں تھیں یا ان کا مقصد کچھ اور بھی تھا؟.... اللہ تعالٰی ہمیں دین کے تقاضوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمادیں۔ آمین یارب العالمین

مغرب کی "علم دوستی" وانسانیت نوازی۔ایک تازہ مثال

محمد اسماعیل ریحان

مغرب کی علمی تحقیقات خصوصاً امریکی ڈاکٹروں کے ارشادات آج کل ہمارے علمی حلقوں میں وحی سے بھی کچھ زیادہ مستند مانے جاتے ہیں۔وحی کے احکام میں تو شک وشبے کی ہزاروں راہیں نکل آتی ہیں، مگر امریکن دانش ور جو فرمادیں ،اس کے تحقیق شدہ ہونے پر بلاچوں چراں یقین کر لیا جاتا ہے۔یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان حضرات نے جو کچھ لکھا ہوگا اس میں زمین وآسمان کے سارے وسائل استعمال کر لیے ہوں گے۔اس قدر عرق ریزی اور باریک بینی سے کام لیا ہوگا جس سے زیادہ انسانی بساط سے باہر ہے۔اس کے بعد سامنے آنے والے نتیجے کو کسی تعصب کے بغیر من وعن بیان کر دیا ہوگا۔

ہماری اسی اندھی عقیدت سے فائدہ اٹھا کر دشمن جس طرح ہمیں دیگر میدانوں میں مات دے رہا ہے اسی طرح تاریخ کو بھی مسخ کرتا جا رہا ہے۔تاریخ کی اس پامالی کا ایک نہایت مکروہ پہلو یہ ہے کہ گزشتہ دو عشروں سے امریکی دانش ور تاریخ کی ہر اس شخصیت کو ہیرو بنا کر پیش کرنے کی تگ ودو کر رہے ہیں جس نے کسی بھی دور میں مسلمانوں کو غیر معمولی طور پر نقصان پہنچایا ہو۔ چاہے وہ کسی

بھی ملک یا مذہب سے تعلق رکھتا ہو۔
اس سلسلے کی سب سے شرمناک مثال گزشتہ چار پانچ سالوں میں سامنے آئی ہے، جب امریکہ نے چنگیز خان کو دنیا کے محسن کے طور پر مشہور کرنا شروع کیا۔ اس کے لیے ۵۰۰۲ء میں خصوصی مہم چلائی گئی کیونکہ اس سال چنگیز خان کی ولادت کے آٹھ سو سال پورے ہو رہے تھے۔ اُسی سال ۲۲ نومبر کو امریکی صدر جارج بش نے چنگیز خان کی جنم بھومی منگولیا کا دورہ کیا جہاں منگولیا کی فوج نے چنگیز خان کے دور کی قدیم فوجی وردیوں میں ملبوس ہو کر امریکی صدر کا استقبال کیا۔ صدر بش کو تاتاریوں کے قدیم رواج کے مطابق گھوڑی کا دودھ پیش کرکے چنگیزی دور کی یادیں تازہ کی گئیں، اس موقع پر صدر بش نے چنگیز خان کے کردار کو سراہتے ہوئے کہا کہ ہم منگولوں جیسی بہادر قوم کے ساتھ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں شریک ہیں۔ بش نے یہ اعلان بھی کیا کہ اب اسلامی بنیاد پرستی ناکام ہو کر رہے گی۔
بش کے منہ سے چنگیز خان کی اس برملا تعریف پر اصحابِ عقل و خرد حیران رہ گئے کیونکہ اپنے ہمسایہ ملکوں پر چنگیز خان کا حملہ تاریخ کا ایک ایسا باب ہے جس میں ہر طرف لہو کے دریا بہتے نظر آتے ہیں۔ چنگیز خان کا پہلا حملہ چین اور کوریا پر ہوا تھا، اس کے بعد اس نے عالم اسلام کا رخ کیا تھا۔ اس کے

جرنیل مشرقی یورپ میں بھی گھس گئے تھے مگر یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس کی سفاکیت کا اصل نشانہ عالم اسلام ہی بنا تھا۔ مغربی مؤرخین خود اعتراف کرتے ہیں کہ چنگیز خان نے عالم اسلام میں جس قدر تباہی مچائی، وہ چین اور دوسرے ملکوں سے کہیں زیادہ تھی۔ گزشتہ صدی کا نامور امریکی مؤرخ ہیرلڈ لیمب اپنی تصنیف "چنگیز خان" میں تسلیم کرتا ہے کہ چنگیز خان نے جیسی سفاکی کا ثبوت عالم اسلام میں دیا، اس کی مثال چین اور دوسرے ملکوں میں نہیں ملتی۔ وہ چنگیزی حملے پر اظہارِ تاسف کرتے ہوئے لکھتا ہے: "یہ بغیر منافرت کے بنی نوع آدم کا قتل عام تھا جس کا مقصد محض انسانوں کو فنا کرنا تھا" (چنگیز خان باب ۱۷، ص ۱۳۱)

پھر یہ بات بھی ریکارڈ پر ہے کہ عالم اسلام میں بھی منگولوں کی تلواریں اہل سنت والجماعت کی آبادیوں کو بے دریغ صفحہ ہستی سے مٹاتی چلی گئیں، جبکہ گمراہ فرقے بڑی حد تک محفوظ رہے، وجہ یہ تھی کہ ان کے عمائد اکثر مواقع پر حملہ آوروں کا نہ صرف ساتھ دیتے رہے بلکہ ان کو مسلم ملکوں پر حملوں کے لیے اکساتے بھی رہے۔ علامہ ذہبی نے لکھا ہے: تاتاریوں نے واسط سے ہرات کی طرف کوچ کیا تو پہاڑوں میں روپوش ایک تاجر اپنے چند ساتھیوں سمیت باہر نکلا اور لاشیں گننے لگا، وہ بتاتا ہے کہ ہم سات افراد نے پانچ لاکھ، پچاس ہزار لاشیں شمار کیں، پھر ہم باطنیوں (اسماعیلی شیعوں) کے شہروں سے گزرے، تو دیکھا وہاں

(سب کچھ سلامت تھا، ذرا بھی فرق نہیں پڑا تھا۔" (تاریخ اسلام ذہبی، احوال ۶۱۷ھ
اسی طرح بغداد کی بیس لاکھ آبادی میں سے اٹھارہ لاکھ اہل سنت کو قتل کر دیا گیا، جبکہ اہل تشیع کے محلے کرخ کی دو لاکھ آبادی کو بخش دیا گیا۔ (البدایہ والنہایہ احوال ۶۵۶ھ)

ایک ایک شہر اور ریاست میں اسی طرح لاکھوں مسلمان قتل کیے گئے جن کی مجموعی تعداد تین کروڑ سے متجاوز ہو جاتی ہے۔ غرض تاریخ انسانی کے اس بھیانک ترین قتل عام کا اصل نشانہ عالم اسلام کے ممالک اور عالم اسلام میں سے اہل سنت والجماعت کے علاقے بنے۔

عقیدے کی تفریق سے قطع نظر جو لوگ بھی اس حملے کا شکار ہوئے وہ انسان تھے اور اسی لیے آج تک کسی مؤرخ یا محقق نے چنگیز خان کی اس سفاکی کو جائز قرار نہیں دیا۔ حتیٰ کہ خود چنگیز خان کے اپنے ہم قوم مؤرخین نے اس کی فتوحات، تنظیم، قانون سازی اور اصلاحات کی تو تعریف کی ہے مگر اس کی خونریزی کے جواز کے لیے وہ بھی کوئی توجیہہ تلاش نہیں کر سکے۔

مگر شاباش ہے امریکی محققین کو کہ جب انہوں نے ۲۰۰۵ء میں چنگیز خان کو ہیرو

بنانے کا تہیہ کیا تو ۲۰۱۰ء میں اس کی خونریزی کو بھی قابل تعریف قرار دے دیا اور اپنے زعم میں اس کے لیے ایک ٹھوس وجہ بھی وجہ تلاش کر لی۔

چنگیز خان کی تعریف وتوصیف کا پہلو ظاہر کرنے والی یہ جدید تحقیق امریکہ کی ایک خاتون ڈاکٹر "جولیا پونگریٹز" (Julia Pongratz) نے کی ہے۔ جولیا گلوبل ایکولوجی کے شعبے سے تعلق رکھتی ہے، اس نے ماحولیاتی آلودگی کے بارے میں اپنی تحقیق میں کہا ہے کہ چنگیز خان سب سے زیادہ ماحول دوست فاتح تھا جس کی سرگرمیوں نے گلوبل وارمنگ کم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اگر وہ انسانوں (جن میں تین چوتھائی سے زیادہ مسلمان تھے) کا قتل عام نہ کرتا تو گلوبل وارمنگ بہت پہلے ایک شدید بحران کی شکل اختیار کر لیتی۔ جولیا کا کہنا ہے کہ یہ تصور غلط ہے کہ ماحولیاتی آلودگی کا آغاز تیل اور کوئلے سے چلنے والے کارخانوں کے بعد ہوا۔ جولیا نے دعویٰ کیا کہ ماحول اسی وقت سے آلودہ ہونا شروع ہو گیا تھا جب انسانوں نے جنگل کاٹ کاٹ کر دیہات آباد کیے اور فصلیں اگانا شروع کیں۔ جولیا چنگیز خان کو انسانیت کا محسن ثابت کرتے ہوئے کہتی ہے کہ چنگیز خان کے حملے کی وجہ سے وسیع قطعاتِ اراضی طویل زمانے تک انسانی سرگرمیوں سے خالی رہے، چنانچہ وہاں جنگلات اگ آئے جو کاربن ڈائی آکسائڈ کی بڑی مقدار کو جذب کرنے کے لیے کافی تھے۔ اس طرح انسان ایک مدت تک صاف ہوا میں سانس لینے کے قابل ہو گیا۔

یاد رہے کہ یہاں جن قطعاتِ اراضی کا ذکر ہو رہا ہے ان میں موجودہ افغانستان و خیبر پختونخواہ، قبائلی علاقہ جات، سندھ کا ساحلی علاقہ ، بلوچستان ،ایران ،وسطِ ایشیا کی پانچ ریاستیں (تاجکستان،ترکمانستان ،ازبکستان ، کرغیزستان اور قازقستان) ، عراق شام اور ترکی جیسے اسلامی تہذیب و تمدن کے بڑے بڑے گھوارے شامل ہیں جنہیں، اس بدبخت چنگیز نے اس طرح پامال کیا کہ صدیوں تک وہاں پہلے جیسی آبادی نہ ہو سکی۔ ہیرلڈ لیمب لکھتا ہے: "اس قتل عام نے عالمِ اسلام کے قلب کو ایک طرح کا چٹیل میدان بنا دیا۔ حکم یہ تھا کہ مسمار شدہ شہروں میں پھر سے انسان آباد نہ ہونے پائیں، ان شہروں کے نشان اس سرزمین پر داغوں کی طرح باقی رہتے جو کسی زمانے میں بڑی زرخیز تھی۔" (چنگیز خان باب ۱۷ ، ص ۱۳۱)

مگر کمال ہے کہ آج ایک مریکن ہی نے اس قتل عام کو نیکی ثابت کر دکھایا اور نسلِ انسانیت کے سب سے بڑے قاتل کو محسنِ انسانیت قرار دے دیا۔

یہ گمان نہ کیجئے کہ اس "انوکھی نکتہ آفرینی" پر موصوفہ کو دھری دھری لعنتیں ملی ہوں گی اور ایک متعصبانہ وانسانیت کُش مفروضے کو تحقیق کے نام پر پیش کرنے کی جسارت پر اسے تحقیقی ادارے سے برخواست کردیا ہوگا۔ جی نہیں

ڈاکٹرنی کو اس پر ۲۰۱۰ء کا پیٹر کوپن ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

مغرب کی جدید علمی تحقیقات کے ایسے نمونے دیکھنے کے بعد مجھے یہ یقین ہو چلا ہے کہ اہل مغرب کے نزدیک اہلمشرق کو حیوان سمجھنے کی ذہنیت نہ صرف باقی ہے بلکہ رُوبہ ترقی ہے۔آج بھی وہاں مسلمانوں کو انسان نہیں سمجھا جاتا۔اپنے سوا وہ سب کو کیڑے مکوڑے تصور کرتے ہیں ۔مذکورہ تحقیق کو دیکھ کر بالکل ایسا لگتا ہے جیسے کسی کے گھر کے سامنے مردار جانوروں کا ڈھیر پڑا تھا جسے کسی خاکروب نے آکر صاف کردیا۔اب گھر کے مالکان خاکروب کی تعریف کر رہے ہیں کہ اگر وہ یہ ہمت نہ کرتا تو انہیں سانس لینے میں کتنی مشکل پیش آتی۔

خالص پانی....کیسے؟

صاف اور خالص پانی صحتِ انسانی کے لیے کتنا ضروری ہے اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی ہو جاتا ہے کہ انسانی جسم میں 70 فی صد پانی ہوتا ہے جس کا درجہ حرارت عموماً 98.6 ڈگری فارن ہائیٹ ہوتا ہے۔ روزانہ پانی کی مقدار جسم میں سے خارج ہو جاتی ہےَ جلد سے 30 فی صد، پھیپھڑوں سے فیصداور پچاس فی صدپیشاب پاخانہ کے ذریعہ۔جب کہ اسی مقدار میں پانی خوراک اور پینے کے ذریعے روزانہ حاصل ہوتا ہے۔

زندگی کی نوید پانی جب ہی انسان کے لیے روح پرور ثابت ہوتا ہے جب وہ اپنی خالص حالت میں انسان کو میسر ہو۔ ورنہ ناخالص اور گندا پانی انسان کی زندگی کے لیے بے حد نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔

خالص پانی اپنے وزن میں آٹھ حصے آکسیجن اور ایک حصہ ہائیڈروجن پر مشتمل ہوتا ہے لیکن بالکل خالص پانی عام طور پر کہیں نہیں ملتا۔ اس میں اکثر چونا، لوہا، سوڈیم کے کلورائیڈ، کاربونک ایسڈ، ریت (سلیکا)، میگنیشیااور نامیاتی مواد شامل ہوتے ہیں۔

معدنیاتی مادوں پر مشتمل پانی (مثلاً چونا) گلہڑ، گردوں کی پتھری وغیرہ، میگنیشیا پر مشتمل پانی دست، لوہے پر مشتمل پانی جگر کی تکالیف، بدہضمی وغیرہ جب کہ نباتاتی اور حیوانی مادے کا حامل پانی ملیریا، ٹائیفائیڈ، ہیضہ، اسہال اور پیچش کا باعث بن سکتا ہے۔ اس قسم کا غیر خالص پانی چکھنے میں بدذائقہ اور معدے کے لیے نقصان دہ ہوتا ہے۔

اچھا خالص پانی شفاف اور چمک دار ہوتا ہے۔ اس کا کوئی رنگ اور کوئی بو نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کا کسی طرح کا مزہ ہوتا ہے۔ یہ لشکارے مارتا ہے اور گرمی یا سردی کے موسم میں عام طور پر اس کے درجہ حرارت میں زیادہ تبدیلی نہیں ہوتی۔

غیر خالص پانی کو خصوصی طور پر بنائے گئے آلات سے فلٹر کیا جاتا ہے جس میں مسام دار پتھر بھرا ہوتا ہے۔ پسی ہوئی چارکول (کوئلے) میں سے گزارنے پر بھی یہ بہتر ہو جاتا ہے۔"

☆ابالا ہوا اور ریت یا پسی ہوئی چارکول (کوئلہ) میں سے فلٹر کیا ہوا پانی عموماً تمام آلائشوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ بہت کم خرچ پر گھر میں مندرجہ ذیل طریقے سے ایک بہترین فلٹر تیار کیا جا سکتا ہے:

ایک عام سا کھلا اور گہرا برتن لے کر اس کے پیندے کے درمیان ایک سوراخ کر دیں۔ چارکول (کوئلے) کا ایک ٹکڑا اس سوراخ میں اس طرح ڈال دیں کہ یہ پانی کا قطرہ قطرہ ٹپکاتا رہے۔۔برتن کے پیندے پر پسے ہوئے چارکول کی تہہ پھیلا دیں اور اس کے اوپر اچھی طرح دھوئی ہوئی ریت بچھا دیں۔ پھر ریت کی تہہ کے اوپر پسے ہوئے چارکول کی ایک اور تہہ لگا دیں۔ اس طرح دونوں کی چار چار تہیں لگائیں۔ سب سے اوپر باریک ریت پھیلائیں۔ تہیں لگانے کے لیے باریک چھاننی استعمال کی جا سکتی ہے۔ اس فلٹر کو لوہے یا لکڑی کے بنے ہوئے تین پایوں والے اسٹول کے اوپر رکھ دیں۔ فلٹر کے اوپر کچی مٹی کا برتن پانی سے بھر کر رکھ دیں جس میں سے پانی قطرہ قطرہ کرکے فلٹر میں گرے گا اور فلٹر ہو کر قطرہ قطرہ نیچے سے گرے گا۔ صاف شدہ پانی اکٹھا کرنے کے لیے فلٹر کے سوراخ کے نیچے بوتل یا اگر میسر ہو سکے تو پیتل کا صاف ستھرا برتن رکھ دیں۔ اس میں جمع شدہ پانی ہر طرح کی آلائشوں سے پاک قابل استعمال ہو گا۔

☆ ہنگامی صورتحال میں گندے پانی کو اچھی طرح ابال کر چوہرے ململ کے چوہرے سفید کپڑے میں سے چھان لینے کے بعد استعمال کریں اور اگر ایک گھنٹہ دھوپ میں رکھ کر استعمال کریں تو یہ زیادہ اچھا ہو گا۔

بہت (Strychnos-Potatorum) ☆اچھی طرح سے رگڑا ہوا ایک نرملی پھل مختصر وقت میں کسی بھی طرح سے گندے آدھا کلو پانی کو پینے کے قابل بنا دے گا۔

مندرجہ بالا طریقے سب سے بہترین اور آسان ہیں۔ کیوں کہ ان طریقوں میں پانی کو خالص بنانے کے لیے کسی قسم کے کیمیکلز کا استعمال نہیں کیا گیا اور نہ ہی مندرجہ بالا طریقوں کے اختیار کرنے میں کسی قسم کی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ذیل میں پانی کو خالص بنانے کے چند دیگر طریقے بھی پیش ہیں:

☆ایک گیلن پانی میں آئرن پر آکسائڈ کے ڈھائی دانے اسے فالتو نامیاتی مادے اور مٹی سے پاک کر دیں گے۔

☆ایک گیلن پانی میں پھٹکری کے چھ دانے ڈالنے سے اس میں موجود تمام کیلشیم کاربونیٹ، کیلشیم سلفیٹ، امونیا ہائیڈریٹ اور حتیٰ کہ نباتاتی البومینائی مادہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

☆آئیوڈین کا آدھا دانہ' سٹرک ایسڈ کا آدھا اور سوڈے کے کاربونیٹ کا ایک دانہ ہیضہ کی وبا کے وقت گندے پانی کی تھوڑی سی مقدار کو خالص بنا دے گا۔

کٹا ہوا ہونٹ اور کٹا ہوا تالو

دورانِ حمل تین مہینے میں چہرے کے مختلف حصے الگ الگ بن رہے ہوتے ہیں جو بعد میں مل جاتے ہیں اور چہرہ مکمل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی بھی وجہ سے یہ چہرے کے مختلف حصے نہ مل پائیں تو کٹا ہوا ہونٹ یا کٹا ہوا تالو یا دونوں نمودار ہو سکتے ہیں۔

اس کی کیا وجوہات ہیں؟ اس کا بالکل ٹھیک جواب تو آج تک کوئی نہیں دے سکا مگر کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کی وجہ سے ماہرین کا خیال ہے کہ بچے کے پیدائشی کٹے ہوئے ہونٹ یا کٹے ہوئے تالو کی ایک بڑی وجہ موروثی ہو سکتی ہے۔ اس خیال کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر ایسے بچے ان ماں باپ کے ہوتے ہیں جو آپس میں ماموں زاد، خالہ زاد یا چچا زاد کزن ہوتے ہیں۔

ماہرین اس عارضے کی دوسری وجوہات میں ماحولیاتی آلودگی، حمل کے پہلے تین مہینے میں غیر ضروری اور حاملہ کا اپنی طرف سے ادویات کا استعمال بھی بتاتے ہیں۔ بہت سی خواتین اس ضمن میں احتیاط نہیں کرتیں اور بغیر اپنے ڈاکٹر کے مشورے کے مختلف دوائیں استعمال کر لیتی ہیں۔ فولک ایسڈ اور آئرن کی کمی اور تابکاری شعاعوں کے مہلک اثرات بھی آنے والے بچے کو اس عارضے میں مبتلا کر

سکتے ہیں!

مندرجہ بالا وجوہات میں سے کوئی بھی وجہ ہو سکتی ہے لیکن ایک بات یاد رکھنی ضروری ہے کہ کٹے ہوئے ہونٹ یا کٹے ہوئے تالو کا سورج گرہن یا چاند گرہن سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ ہمارے معاشرے میں کٹے ہوئے ہونٹ والے بچے کے ساتھ ستم ظریف کئی قسم کے توہمات جوڑ دیتے ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

پاکستان میں اس بیماری کا تناسب:

پاکستان کا شماراس بیماری کے تناسب سے دنیا بھر میں چوتھے نمبر پر ہے جہاں پر کٹے ہوئے ہونٹ اور کٹے ہوئے تالو والے بچے پائے جاتے ہیں۔ چین پہلے نمبر پر، بھارت دوسرے نمبر پر اور انڈونیشیا تیسرے نمبر پر ہے۔ پاکستان میں ہر 500 بچوں میں ایک ایسا بچہ پیدا ہوتا ہے۔ اور تحقیق کے مطابق پاکستان میں ایک دن میں اوسطاً دس ہزار بچے پیدا ہوتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک دن میں تقریباً 25 بچے کٹے ہوئے ہونٹ اور کٹے ہوئے تالو کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ ایک مہینے میں 750 اور ایک سال میں 9000 بچے ایسے پیدا ہوتے ہیں۔

کٹے ہوئے ہونٹ اور کٹے ہوئے تالو کے نقصانات:

ایسے بچے جوں کہ صحیح طریقے سے بولنے کے قابل نہیں ہوتے ہیں۔ وہ زیادہ ترچپ رہنے کی کوشش کرتے ہیں اور نفسیاتی مسائل کا شکار بنتے ہیں۔ جن میں ڈپریشن عام ہے۔ ساتھ ساتھ ایسے بچے سانس کی نالی کے ورم، کان کی نالی کے ورم اور دانتوں کی بیماری کا شکار ہو سکتے ہیں۔

علاج:

ایسے بچوں کا علاج صرف پلاسٹک سرجری ہے۔ مگر سرجری کا صحیح عمر میں ہونا انتہائی ضروری ہے۔ صحیح عمر کے ساتھ بچے کا میڈیکلی فٹ ہونا یعنی بچے کا وزن، بچے کا ہیمو گلوبن () اور بچے کا سانس کی نالی کا صحیح ہونا انتہائی ضروری ہے۔ عموماً مندرجہ ذیل عمر میں بچے کی سرجری کی جاتی ہے:

☆کٹے ہوئے ہونٹ.... تین ماہ کے بعد کبھی بھی۔

☆کٹے ہوئے تالو.... ایک سال سے ڈیڑھ سال کی عمر میں۔

☆مسوڑھوں کی سرجری.... چھ سے نو سال کی عمر میں۔

☆ناک کی سرجری.... 16 سے 17 سال کی عمر میں۔

بعض بچے پیدا ہوتے ہیں تو صرف ہونٹ کٹا ہوا ہوتا ہے اور بعض بچے پیدا ہوتے ہیں تو صرف تالو کٹا ہوا ہوتا ہے اور بعض بچوں میں ہونٹ اور تالو دونوں کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ صرف ہونٹ کٹے بچے میں ایک سرجری اور صرف تالو کٹے بچے میں

بھی ایک سرجری کی جاتی ہے مگر جن بچوں کے ہونٹ اور تالو دونوں کٹے ہوئے ہوتے ہیں، ان میں عمر کے مختلف ادوار میں تین سے چار سرجری کی جاتی ہے۔

:اخراجات

ایک سرجری میں پرائیوٹ سیکٹر میں 60 سے 80 ہزار روپے کا خرچہ آتا ہے (خوشی کی بات یہ ہے کہ شعبہ پلاسٹک سرجری، سول ہسپتال اور ڈاؤ یونیورسٹی آف ہیلتھ سائنسز کراچی میں مستحق مریضوں کی فری سرجری کی جاتی ہے)۔

ان سرجریوں کے بیچ میں بچے کے چہرے کی افزائش کو دیکھا جاتا ہے اور اس کی آواز کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ اس کے دانوں اور مسوڑھوں کی افزائش کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ ضرورت پڑنے پر آرتھوڈونٹکس اور اسپیچ تھراپسٹ کی مدد بھی لی جاتی ہے۔ بعض اوقات آواز کی بہتری کے لیے بھی سرجری کی جاتی ہے جسے Pharyngoplasty کہا جاتا ہے۔ یہ زیادہ تر چھ سال کی عمر کے بعد کی جاتی ہے۔

:والدین کو کیا کرنا چاہیے

زیادہ تر ماں باپ جن کو اس قسم کے نقائص کا علم نہیں ہوتا، وہ ایسے بچے کو دیکھ کر گھبر اجاتے ہیں اور رونا پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ ایسے والدین کو

چاہیے کہ فوری طور پر بچوں کے ڈاکٹر سے رجوع کریں جو بچے کا مکمل معائنہ بھی کرے گا
اور بچے کے وزن اور دودھ کے متعلق ہدایت بھی دے گا۔ جن بچوں کا صرف ہونٹ کٹا
ہوا ہوتا ہے وہ دودھ پینے میں اتنی تکلیف کا شکار نہیں ہوتے جتنا وہ بچہ جس کے ہونٹ
اور تالو دونوں کٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ ایسے بچوں کے لیے لمبا نپل تجویز کیا جاتا ہے جس
کے سرے پر سوراخ کو موٹا کر لیا جاتا ہے۔ ہمیشہ ایسے بچوں کو تھوڑا سا اٹھا کر 45 کے
زاویے پر دودھ پلانا چاہیے تاکہ دودھ سانس کی نالی میں نہ جائے۔ ہر مہینے بچے کا
وزن کروانا چاہیے تاکہ یہ پتہ چلے کہ اسے غذا صحیح مل رہی ہے کہ نہیں۔ ساتھ ساتھ
حفاظتی ٹیکوں کا کورس بھی کروانا چاہیے۔ جیسے ہی بچہ سرجری کی عمر کو پہنچے تو اسے فوری
طور پر پلاسٹک سرجن سے رجوع کرنا چاہیے۔

جعل سازی

شاید بعض چیزیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں، بس اپنا روپ بدل کر دوبارہ سامنے آجاتی ہیں اور بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں، ایسی ہی ایک خبر پچھلے دنوں سامنے سننے میں آئی جس میں بتایا گیا ہے کہ پاکستان بھر میں 40 فیصد سے 50 فیصد ادویہ جعلی بن رہی ہیں۔ مجرم پکڑے جاتے ہیں مگر قانونی اور انتظامی کمزوریوں کے سبب گرفتار افراد سزا سے بچ جاتے ہیں۔ یہ الفاظ کسی اور کے نہیں بلکہ جناب وفاقی وزیر داخلہ کے ہیں جو انہوں نے قومی اسمبلی کے ایک اجلاس میں کہے۔

21 ستمبر 2008ء کو بھی اسی سلسلے میں ایک خبر آئی تھی جس میں بتایا گیا تھا کہ ایف آئی اے نے کھارادر کراچی کے علاقے ڈینسو ہال میں چھاپہ مار کر ڈھائی کروڑ روپے مالیت کی جعلی دوائیں برآمد کرلیں۔

اور اب تازہ خبر ملک کے بڑے اخبارات میں بڑے طمطراق کے ساتھ اشتہار کی صورت چھپی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جعلی ملاوٹ شدہ اور مضر صحت ادویات کا مسئلہ روز بروز قابو سے باہر ہوتا جا رہا ہے۔ خبر کراچی اسٹاف رپورٹر کی طرف سے کچھ یوں ہے:

پاکستان میں پہلی بار ایک ملٹی نیشنل فارما کمپنی نے سینٹرل ڈرگ ٹیسٹنگ لیبارٹری میں غیر معیاری قرار دی جانے والی ٹیبلٹ ڈسپرول (پیراسیٹا مول) کو واپس لینے کی ہدایت جاری کر دی۔اور ڈاکٹروں، کیمسٹ اور فارماسسٹ سے کہا ہے کہ مذکورہ دوا کی فروخت فوری بند کر کے کمپنی کو واپس کر دیں۔ کراچی میں اس ٹیبلٹ کی مقدار 4 کروڑ لاکھ بتائی جاتی ہے جو اسپتالوں اور میڈیکل اسٹوروں پر عام دستیاب ہے۔اس 90 ٹیبلٹ کے نمونے کیمیائی تجزیے کے لیے رواں ماہ میں پیپلز پرائمری ہیلتھ کیئر انیشی ایٹو کے گودام سے حاصل کیے گئے تھے جو کیمیائی تجزیے کے لیے سینٹرل ڈرگ ٹیسٹنگ لیبارٹری بھیجے گئے تھے۔ کیمیائی تجزیہ کے بعد ڈاکٹر عبید علی کے دستخط کے بعد جاری ہونے والی رپورٹ میں انکشاف کیا گیا ہے کہ مذکورہ ٹیبلٹ غیر معیاری ہے۔

آپ نے خبر ملاحظہ کی.... کتنے لوگوں نے اس خبر کو سرسری پڑھا ہو گا اور کتنے لوگوں نے اس کی سنگینی کو محسوس کیا ہو گا!

جب تک کمپنی کی طرف سے دوا کو واپس لیا گیا ہو گا۔ نہ جانے اس بیچ کی کتنی ٹیبلٹس فروخت ہو چکی ہوں گی اور معصوم لوگوں نے اسے بخار اور درد کے علاج کے طور پر استعمال کیا ہو گا۔ان کا بخار اور درد تو دور ہوا ہو یا نہ ہوا

ہو لیکن دوا کے غیر معیاری ہونے کی وجہ سے کتنے ذیلی اثرات ان کو بھگتنا پڑیں گے اس کی ذمہ داری حکومت سمیت کسی بھی ادارے نے نہ کبھی سمجھی اور نہ دور دور تک اس کے امکانات ہیں!

بہت عرصہ پہلے کی بات ہے تقریباً بارہ پندرہ سال پرانی کہ اخبار میں خود کشی کی کوشش کا ایک واقعہ شایع ہوا تھا جو واقعے کی سنگینی سے ہٹ کر عوام میں ایک لطیفہ بن کر رہ گیا تھا.... شاید اکثر لوگوں کو یاد ہو۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ ایک نوجوان لڑکی نے گھر والوں سے جھگڑے کے بعد گھر میں رکھی زہریلی دوا (شاید کیڑے مار دوا) پی لی تھی ۔جب اس لڑکی حالت غیر ہونے لگی تو گھر والے اسپتال لے کر بھاگے۔ایمرجنسی میں اس کو فوری طبّی امداد دی گئی تو غیر متوقع طور پر وہ لڑکی ہوش میں آ گئی۔بعد میں جب اس دوا کی جانچ کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں اصل دوا کی مقدار صرف دس پندرہ فیصد تھی باقی جعلی آمیزہ تھا۔ قدرت کو لڑکی کی زندگی منظور تھی، سو بچ گئی۔ یوں یہ لطیفہ عام ہوا کہ آج کل تو خود کشی کرنے کے لیے زہر بھی اصلی نہیں ملتا!

بہر حال اب صورت حال کچھ یوں ہے کہ کچھ پتا نہیں چلتا کہ اصل دوا کون سی ہے اور نقلی کون سی؟ جب تک کسی لیبارٹری سے تصدیق نہ کرالی جائے، معاملہ سوال بنا رہتا ہے۔ اس پر ایک اور واقعہ بھی یاد آگیا۔ یہ بھی کسی اخبار میں آیا

تھا جو کچھ یوں تھا کہ کوئی صاحب مختصر عرصے کے لیے بیرون ملک جارہے تھے۔ انہوں نے اپنی بیماریوں کے پیش نظر ڈاکٹر سے ادویہ لکھوائیں اور ساتھ لے گئے۔ وہ وہاں جاکر دوائیں استعمال کرتے رہے تو فائدے کی بجائے مرض بڑھ گیا۔ موصوف اپنا غیر ملکی دورہ مختصر کرکے واپس آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب سے شکایت کی۔ ڈاکٹر صاحب نے جانچ پڑتال کی تو معلوم ہوا کہ ساری کی ساری دوائیں جو اس دورے کے پیش نظر، زیادہ خرید لی گئی تھیں، جعلی ہیں۔ لیبارٹری میں معلوم ہوا کہ ان میں اصل اجزا یا تو پانچ تا دس فیصد ہیں۔ یا بالکل بھی نہیں ہیں، صرف ان کا رنگ، ذائقہ وغیرہ اصل ادویہ جیسا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا؟.... خدا جانے.... لیکن یہ واقعہ اپنے سیاق و سباق میں بالکل حقیقت پر مبنی معلوم ہوتا ہے اور تازہ رپورٹ تو اس کی مکمل تصدیق کرتی ہے۔

اس سارے جائزے سے کم سے کم یہ ضرور معلوم ہوجاتا ہے کہ ہمارے بچپن سے لے کر اب تک اس شعبے یں معیار کی صورت حال روز بروز بگڑتی جارہی ہے اور اس کے برعکس قیمتیں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔ چنانچہ جو دوا ہمارے بچپن میں صرف پانچ دس روپے میں مل جاتی تھی وہ آج کم از کم ڈیڑھ سو سے دو سو کی ہے!

نئے ٹیکسوں کے بعد تو اطلاع ہے کہ اکثر دواؤں کی قیمتوں میں 200 فیصد کے لگ بھگ اضافہ ہو جائے گا۔ جعلی اور مہنگی ادویات کے بارے یں گو ہم پہلے بھی کئی بار لکھ چکے ہیں لیکن یہ موضوع ہرگز ایسا نہیں ہے کہ اس سے سرسری گزر جایا

جائے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آدمی بھوکا رہ لیتا ہے، سر چھپانے کو کچھ نہ ہو تو چند چیتھڑے کسی میدان میں تان کر گزارا کرلیتا ہے لیکن جب اس کے پیارے ' اس کے بچے بیمار ہوں تو ان کی دوا کے لیے اپنا خون پسینا بہا کر اور نہ جانے کیا کیا جتن کر کے چند پیسے اکٹھے کرتا ہے اور پھر اس خون پسینے کی کمائی سے جو دوائی ہاتھ میں آتی ہے وہ نہ صر ف کوئی فائدہ نہیں دیتی بلکہ مضر صحت ملاوٹی اجزا کی وجہ سے اکثر جان کے درپے ہو جاتی ہے....

یہ کتنا بڑا المیہ ہے؟ پھر عذاب نہ آئیں گے تو کیا ہو گا؟ اللہ ہم سب کو ہدایت عطا فرمائے آمین۔

تبلیغ کا مقصد اپنی اور امت کی اصلاح ہے

دعوت و تبلیغ دین کی محنت کا ایک وسیع میدان ہے اور اس میدان میں تبلیغی جماعت کا کام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ جماعت کی محنت کے اثرات کا مشاہدہ ہر ذی شعور انسان کھلی آنکھوں سے کر سکتا ہے۔ یہ ایمانی تحریک آج سے 76 سال پہلے ہندوستان سے اٹھی اور پھر جلد ہی ہندو پاک اور بنگلہ دیش میں ہی نہیں بلکہ پوری دنیا کے ہر اس علاقہ تک پہنچ گئی جہاں مسلمان بستے ہوں۔ ان دین کے خادموں کا مقصد اور بنیادی دعوت یہ ہے کہ تمام امتِ دعوت اسلام قبول کر کے اللہ جلّ شانہ کے سایہ رحمت میں آ جائے اور تمام امت اجابت یعنی امت مسلمہ میں وہ ایمان اور ایمان والی زندگی عام ہو جائے جس کی دعوت لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تھے۔ اور قرآن مجید میں جس کا مطالبہ اس آیت میں کیا گیا ہے: يَآأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً (البقرہ ۲۰۸)

"اے لوگو جو ایمان لائے ہو.... داخل ہو جاؤ اسلام میں پورے کے پورے"

اس سلسلے میں وہ حضرت مولانا الیاس دہلوی رحمہ اللہ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق کام کرتے ہیں۔ ان کی دعوت کا محور دو باتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ تمام مسلمان چوبیس گھنٹے کی زندگی میں اللہ تعالی کے حکموں کو حضور اکرم صلی

اللہ علیہ وسلم کے طریقوں کے مطابق پورا کرنے والے بن جائیں۔اور دوسری یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے صدقے نبیوں والا کام اب ساری امت کے ذمہ ہے۔ پھر اس کے ذیل میں وہ دین کی چھ مخصوص صفات کی دعوت دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ چھ چیزیں اگرچہ پورا دین ہرگز نہیں لیکن اگر ان کو یکھ کر ان پر عمل کیا جائے گا تو پورے دین پر چلنے کی استعداد پیدا ہو جائے گی۔

ان چھ صفات یں سب سے پہلے کلمہ طیبہ اور اس کے مفہوم و یقین کی دعوت ہے۔ یعنی اللہ کی وحدانیت اور بڑائی کی اتنی دعوت دی جائے کہ دل اللہ کی ذات سے متاثر ہو جائے اور غیر کے تاثر سے پاک ہو جائے، اس سے شرک کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح کلمے کا دوسرا جز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقوں میں کامیابی کی اتنی دعوت دی جائے کہ سنتیں زندہ ہو جائیں اور بدعات کا خاتمہ ہو جائے۔ اس بنیادی محنت کے بعد بالترتیب نماز، علم و ذکر، اکرامِ مسلم، اخلاص اور دعوت و تبلیغ کی دعوت دی جاتی ہے۔ جماعت کے ساتھی ان صفات کے علاوہ کوئی اور بات مثلاً کسی "شیخ" سے بیعت ہونے یا کسی حلقہ سے وابستہ ہونے یا کسی جماعت اور انجمن کا ممبر بننے کی نہ دعوت دیتے ہیں اور نہ منع کرتے ہیں، بلکہ کہا یہ جاتا ہے کہ جس سلسلے سے چاہیں اصلاحی تعلق قائم کریں۔ خود تبلیغی جماعت کے بانی اور اکابر کی جو علمائے دیوبند کی طرف نسبت ہے، اس

نسبت کی بھی دعوت نہیں دی جاتی کیوں کہ مولانا الیاس دہلوی رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ "جہاں تک ہوسکے یہ کوشش کرو کہ دین کی اس دعوت میں میری ذات اور میرے نام کا ذکر نہ آئے۔"

غرض تبلیغی جماعت کسی نئے نظریہ یا کسی نئے مقصد کی داعی نہیں، وہ تو صرف اپنی اور امت کی اصلاح کے لیے محنت اور قربانی کی دعوت دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری تنظیموں اور انجمنوں کی طرح اس تحریک کا کوئی دستور یا منشور نہیں، کوئی دفتر یا رجسٹر نہیں اور نہ ہی کوئی ممبر یا عہدیدار ہے، یہاں تک کہ اس کا کوئی جداگانہ نام تک نہ رکھا گیا۔ حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ نام "تبلیغی جماعت" ہم نے نہیں رکھا۔ ہم تو بس کام کرنا چاہتے تھے، اس کا کوئی خاص نام رکھنے کی ضرورت بھی نہ سمجھی تھی۔ لوگ کام کرنے والوں کو تبلیغی جماعت کہنے لگے، پھر یہ اتنا مشہور ہوا کہ ہم خود بھی کہنے لگے۔"

اسی طرح جماعت والے اپنی کارگزاریوں کی بھی بالکل شہرت نہیں چاہتے بلکہ اپنے کام کے لیے اخبار یا رسالہ نکالنے یا اشتہار و پمفلٹ کے ذریعہ اپنی بات پہنچانے کے وہ بالکل قائل نہیں!.... مگر اس کے باوجود کام کا ثمر جو نکلا وہ سب کے سامنے ہے۔

یورپ اور افریقہ کے وہ علاقے جہاں پورے ملک میں چند مسجدیں ہوا کرتی تھیں، وہاں جماعت کی محنت کو اللہ نے قبول فرمایا اور آج سینکڑوں مساجد ہیں اور راقم ذاتی طور پر ان ساتھیوں سے واقف ہے جن کے ہاتھ پر آسٹریلیا اور افریقہ میں ہزاروں ایسے لوگ دوبارہ دائرہ اسلام میں داخل ہوئے، جو عیسائی اور قادیانی جماعتوں کے دجل وفریب کا شکار ہو کر گمراہ ہو گئے تھے، لیکن آپ نے کبھی ان کارناموں کے اشتہار نہیں دیکھے ہوں گے، کیوں کہ حضرت مولانا الیاس دہلوی رحمہ اللہ نے اپنے کام کا ڈھانچا اخلاص کی بنیاد پر اٹھایا تھا اور یہاں تک دعا فرمایا کرتے تھے کہ اے اللہ! اس کام کو کرامات کی بنیاد پر نہ چلائیے گا۔

اس جماعت میں ہر شخص اپنا خرچہ خود اٹھاتا ہے، ان میں وہ بھی ہوتے ہیں جو لاکھوں خرچ کر سکتے ہیں اور آخرت کے اجر و ثواب کی امید پر خرچ بھی کرتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہوتا تو وہ سامان سر پر رکھ کر مہینوں کے لیے پیدل نکل پڑتے ہیں۔

اگر غائر نظر سے دیکھا جائے تو جماعت کی روز افزوں کامیابی اور ساری دنیا میں پھیلاؤ اسی حکمت عملی کی وجہ سے ہے کہ یہ کام انبیا کرام علیہم السلام

کے طریقہ دعوت کے بے حد مشابہ ہونے کی وجہ سے بے حد سادہ، آسان اور انسانی فطرت کے مطابق ہے۔اس کے علاوہ انبیا کرام علیہم السلام کی سنت ہیں تبلیغی کام کسی خاص طبقہ کی ہی اصلاح کا ذریعہ نہیں بلکہ تمام دین کے احیائ، تمام مسلمانوں کی اصلاح اور دائرہ اسلام میں بیش از بیش وسعت کا ذریعہ ہے۔جماعت نے اپنے کام کو کسی ایک مخصوص طبقے تک محدود نہیں کیا بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں بے دھڑک دین کی دعوت کے لیے محنت کی۔ انتہائی معمولی شعبہ زندگی کے افراد سے لے کر اخص الخواص تک یکساں ایمان و اعمال کی آواز لگائی۔

جماعت والے ان لوگوں کے پاس بھی گئے جنہیں کبھی کسی نے اس نظر سے نہیں دیکھا کہ وہ بھی اللہ کے بندے اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی امت میں سے ہیں۔ یہاں تک کہ خواجہ سرا اور ناچنے گانے والوں کو بھی دعوت دی گئی !اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان گنت سعید روحوں نے اس دعوت پر لبیک کہا اور یوں تبلیغی جماعت کو ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے داعی مل گئے جو مختلف صلاحیتوں اور استعداد کے مالک تھے۔ یہ جماعتیں گویا چلتی پھرتی تربیت گاہیں و خانقاہیں ہیں۔ اس کے ذریعے کچھ بھی نہ ہو تو کم از کم دین کے لیے تکلیفیں اٹھانے اور اپنا مال دین کے لیے خرچ کرنے کی عادت پڑتی ہے اور دوسروں کی اصلاح ہو یا نہ ہو اپنی اصلاح کی فکر ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ غرض تبلیغی جماعت کا مقصد دین کی طلب کو عام کرنا ہے، جس سے مدارس کو طلبہ کثرت سے

ملتے رہیں اور خانقاہوں کو ذاکرین ملیں اور ہر عام مسلمان کے دل میں دین کی اہمیت پیدا ہوتی چلی جائے۔

اس ضمن میں ایک بہت اہم بات یہ بھی ہے کہ چوں کہ یہ تبلیغی کام اپنی اصل میں بہت عمومی حیثیت رکھتا ہے اور ہر قسم کے آدمی اس میں آتے اور کام کرتے ہیں اور ہر ایک کی اصلاح، اس کی استعداد اور حوصلہ کے موافق ہوتی ہے۔اس لیے کسی فرد یا جماعت سے کوتاہی اور غلو ظاہر ہو جانا بالکل قرین قیاس ہے، جسے جماعت کا اصول یا اس کے اکابر کی طرف منسوب کر دینا مناسب نہیں۔ دراصل ہدایات کو غور سے نہ سننے،اصول کی پابندی نہ کرنے اور چھ نمبر سے بڑھ کر بیان کرنے سے خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

جماعت پر غیروں کی طرف سے جو اعتراضات کیے جاتے ہیں وہ تو اکثر نرے الزامات ہی ہوتے ہیں لیکن اپنے حلقوں میں جو خیر خواہی سے تبلیغی جماعت پر اعتراض کیے جاتے ہیں وہ یا تو ناواقفیت کا نتیجہ ہوتے ہیں یا پھر عام تبلیغی افراد کے کسی انفرادی عمل کو دیکھ کر اس کو پوری جماعت کی طرف منطبق کر دیا جاتا ہے جو ظاہری بات ہے کہ اصولاً غلط ہے۔ اگرچہ فی نفسہ فکر و عمل کی کمی کوتاہی یا غلطی کا امکان بھی رہتا ہے مگر دیکھا گیا ہے کہ اکابر اور جید علماء کی طرف سے جب کوئی اصلاح کی کوشش کی گئی تو اسے سنجیدگی سے لیا گیا اور اپنی اصلاح کی گئی۔

اس لیے علم والوں اور بے علموں کو، نئے اور پرانوں کو، متقی اور غیر متقی کو، ذاکرین اور غافلوں کو سب کو تنقید کرتے وقت ایک معیار پر جانچنا اور ایک وزن سے تولنا صحیح نہیں۔ کسی فرد سے اگر کوتاہی ہو جائے تو اس کو جماعت کا اصول نہیں قرار دینا چاہیے بلکہ نرمی سے اصلاح کی طرف متوجہ کرنا چاہیے۔

ایک عام اعتراض تبلیغی جماعت پر یہ کیا جاتا ہے کہ تبلیغی جماعت کو مسلمانوں کو درپیش کسی بھی انفرادی یا اجتماعی مسئلہ سے خواہ وہ سیاسی ہو یا سماجی کوئی دلچسپی اور سروکار نہیں ہے۔ اس اعتراض کے جواب میں مولانا منظور نعمانی رحمہ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: "اس کام کی بنیاد قرآن و حدیث سے حاصل ہونے والے اس یقین پر ہے کہ اس زمانہ میں امت مسلمہ کو سارے عالم میں جو اجتماعی یا انفرادی مشکلات و مسائل درپیش ہیں، ان کا سببِ اصلی اور علۃ العلل یہ ہے کہ امت کی غالب اکثریت اس حقیقی ایمان بالغیب اور اس ایمانی زندگی سے دور ہو گئی ہے جو اللہ تعالی کی نظر عنایت کے لیے شرط ہے اور اس میں وہ خدافراموشی اور آخرت سے بے فکری آ گئی ہے جو پچھلے انبیا کرام علیہم السلام کی امتوں کے لیے سراسر تباہی کا باعث بنی۔ اور امت کی یہی حالت دوسری قوموں کے اسلام کی طرف آنے میں اس وقت سب سے بڑی رکاوٹ بنی ہوئی ہے۔ نیز یہ یقین بھی اس تبلیغی کام کی بنیاد ہے کہ آخرت کا مسئلہ اس دنیوی زندگی کے

سارے مسائل سے لاکھوں درجہ زیادہ قابل فکر ہے مگر حالت یہ ہے کہ (امت مسلمہ کے) دنیوی مسائل کی فکر کرنے والوں کی تو کمی نہیں ہے لیکن آخرت کی فکر میں دوڑ دھوپ کرنے والوں کو دیکھنے کے لیے آسمان کی آنکھیں ترستی ہیں۔" [تبلیغی جماعت اور جماعت اسلامی از مولانا منظور نعمانی]

اس لیے تبلیغی جماعت سے یہ توقع رکھنا ہرگز مناسب نہیں کہ جماعت دعوت الی اللہ کے میدان میں بھی کام کرے اور اس کے ساتھ ساتھ دین کے دوسرے شعبوں میں بھی بھرپور کردار ادا کرے۔ہاں دوسرے شعبوں میں کام کرنے والوں کے لیے دعائے خیر کی جاتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ دراصل یہ تبلیغی کام اپنی اصل میں، دین کے تمام شعبوں کا خادم ہے۔ دین کے تمام شعبوں کے لیے رجال کار مہیا کرنا تبلیغی جماعت کا کام ہے۔ بے طلبوں اور دنیاداری کی دلدل میں گلے گلے پھنسے ہوئے لوگوں کو نکال کر اور ان کے دل میں دین کی طلب پیدا کرکے، دین کے مختلف شعبوں سے وابستہ کرنے کی محنت کرنا اپنی نوعیت کا بڑا زبردست کام ہے۔

بہرحال افراط و تفریط سے بچنے کے لیے حضرات کی یہ خواہش ہے کہ علماء کرام کی سرپرستی میں کام ہو، کیوں کہ جتنا علماء کرام اس مبارک کام کی سرپرستی اور نگرانی کریں گے اتنا ہی کمی بیشی دور ہو کر اعتدال قائم ہو گا اور شکایات کم ہوں گی ۔یوں تو الحمدللہ کام اس مخصوص ڈھنگ میں شروع بھی ایک جید عالم مولانا الیاس دہلوی رحمہ اللہ سے ہوا اور شروع ہی سے اکابر علماء کرام کی تائید و نصرت بھی اس تبلیغی کام کے ساتھ رہی۔ مثلاً حضرت مولانا اشرف علی

تھانوی، حضرت رائے پوری، حضرت حسین احمد مدنی، حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا حضرت مولانا قاری طیب، حضرت مولانا علی میاں اور حضرت مولانا منظور نعمانی، رحمھم اللہ تعالیٰ اور پھر ان اکابر کے خلفاء کرام غرض سب کی پشت پناہی اس جماعت کے ساتھ رہی۔

اس لیے علماء کرام سے یہ درخواست کی جاتی ہے کہ اپنے درس وتدریس اور دوسری علمی مشغولیت کے ساتھ اپنے محلوں کی جماعتوں میں جڑتے رہیں۔ اور سال میں تھوڑا بہت وقت فارغ کرکے جماعت کے ساتھ چلے جائیں تو ان شاء اللہ جماعتوں میں جو ہر قسم کے عامی مسلمان ہوتے ہیں، ان کی نگرانی، اصلاح اور تربیت ہوتی چلی جائے گی۔ اب جماعتیں تو بے شمار ہیں مگر کام کی نگرانی کرنے والے یعنی علماء کرام کم ہیں۔ اس وقت بھی صرف اندرون ملک میں کم وبیش پندرہ بیس ہزار جماعتیں ایمان واعمال سیکھنے سکھانے میں مشغول ہوں گی اور میری معلومات کے مطابق ساڑھے چھ ہزار علماء کرام اس وقت اندرون ملک سال لگا رہے ہیں۔ یوں اگر ایک عالم ایک جماعت میں ہو تو باقی تین چوتھائی جماعتیں علماء کرام کی صحبت سے محروم ہیں۔

آخر میں دین کے تمام شعبوں میں کام کرنے والے محترم ساتھیوں سے راقم التجا کرنا چاہتا ہے کہ بے شک اپنے متعین شعبے میں خوب جم کر کام کریں، مگر اپنا

محاسبہ کرتے رہیں اور دوسرے شعبوں کی کمی ہرگز دل میں نہ لائیں۔ کیوں کہ شیطان ذہن میں یہ ڈالتا ہے کہ بس ہمارا کام ہی اصل ہے دین کے دوسرے کام معاذ اللہ کم تر ہیں۔ ایسا سمجھنا بہت خطرے کی بات اور فتنہ کی چیز ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ اللہ رب العزت کی منشا ہے کہ جس سے اپنے دین کا جو چاہے کام لے۔ اس لیے تقابل کی بجائے تعاون کی راہ اپنائیں اور اپنے دائرہ عمل میں رہتے ہوئے دوسرے شعبوں کے ساتھیوں کے ممنون ہوں کہ دین کے دوسرے کام جو ہم اپنے شعبہ کی مشغولیت کی وجہ سے نہیں کر پا رہے، ہمارے بھائی اس کام کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ اس نقطہ نظر سے دوسرے شعبوں کے ساتھیوں کی حوصلہ افزائی کرنا، بقدرِ استطاعت ان کے ساتھ تعاون کرنا اور دعاؤں میں ان کو یاد رکھنا ان شاء اللہ آپ کو دین کے سارے شعبوں میں کام کرنے کا اجر دلوائے گا اور اس کے ساتھ امت میں جوڑ کی شکل پیدا ہو کر اجتماعیت پیدا ہو گی جو امت مسلمہ کی اس وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔

ماحول اور صحبت کا اثر

یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ ماحول اور صحبت سے بہت جلد متاثر ہو جاتا ہے .... آپ کا خدانخواستہ کسی ہسپتال میں خصوصاً سرکاری ہسپتال میں جانا ہوا ہو تو آپ نے محسوس کیا ہو گا کہ وہاں کے افسردہ ماحول کا اثر بہت جلد آپ کے مزاج میں سرایت کر گیا ہے۔ دکھی لوگوں کے دکھ، بیماروں کی آہ وبکا اور متعلقین کی پریشانی آپ کو بھی دکھی اور پریشان کر دے گی۔ آپ کتنے ہی رجائی ذہن کے مالک اور ہنسنے ہنسانے والے ہوں، ہسپتال کے ماحول میں خود بخود قنوطی انداز میں سوچنے لگیں گے۔اس کے بالمقابل آپ کسی بات پر غمگین ہوں اور ایسے میں آپ دوستوں کی محفل میں چلے جائیں، جہاں بے فکرے دوست معمولی باتوں پر فلک شگاف قہقہے لگا رہے ہوں تو نہ چاہتے ہوئے بھی آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رینگ جائے گی۔ کچھ دیر اور وہاں بیٹھیے تو آپ کو اپنے غم ہوا میں تحلیل ہوتے محسوس ہوں گے۔

جی ہاں یہ انسانی فطرت کا ایک بہت اہم پہلو ہے کہ اس کی خاص داخلی کیفیات خارجی ماحول سے متاثر ہو جاتی ہیں.... بے شک ذاتی طبعی رجحان بھی اہمیت کا حامل ہے لیکن ماحول ہی کے زیر اثر طبیعت اپنے اظہار کی جرات کر پاتی ہے۔اور اس سے بڑھ کر اگر یوں کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ ماحول اور صحبت کی اثر

انگیزی اتنی گہرائی میں سرایت کر جاتی ہے کہ انسان کے ذاتی رجحانات تک کو متاثر کر دیتی ہے۔ ماحول اور صحبت ہی کا اثر تو ہوتا ہے کہ خونخوار بھیڑیئے دوسروں کے لیے جان نثار کرنے کو آمادہ ہو جاتے ہیں.... اور یہ بھی ماحول کا اثر ہوتا ہے کہ ایک انتہائی نرم خُو اور محبت کرنے والا انسان تشدد پر اتر آتا ہے۔

مندرجہ بالا سطور بطور تمہید ہم نے تحریر کی ہیں.... مقصد تو آپ کو ایک ملاقات کا حال سنانا تھا۔ اوپر چند باتیں اس لیے عرض کیں کہ آپ کی ذرا ذہن سازی ہو جائے اور آپ کو حیرت کا وہ جھٹکا نہ لگے، جس جھٹکے سے پچھلے دو ہفتوں سے میں سنبھل نہ پایا ہوں....

ہمارے پرانے محلے میں ایک نوجوان رہا کرتا تھا۔ نام آپ اس کا عالم فرض کر لیں۔ عمر اس کی سولہ سترہ برس تھی کہ ابھی مسیں بھیگ رہی تھی۔ انتہائی شریف اور اپنے کام سے کام رکھنے والا.... خوش اخلاق اور ملنسار.... صبح گھر سے سیدھا کالج، اور کالج سے سیدھے گھر، اسی طرح شام کو گھر سے نکلتا تو انسٹیٹیوٹ کے لیے.... اور پھر فارغ ہو کر سیدھا گھر۔ کم از کم میں نے اسے کبھی اِدھر اُدھر فالتو بیٹھتے نہیں دیکھا تھا۔ پھر تھوڑا عرصہ گزرا اور ہم کچھ ناگزیر وجوہات کی وجہ سے وہ محلّہ چھوڑ کر دوسرے محلے میں آ گئے۔ شروع

میں ہفتہ دو ہفتہ میں پرانے محلّہ میں چکر لگ جاتا، پھر آہستہ آہستہ یہ دورانیہ ہفتوں سے بڑھ کر مہینوں اور پھر سالوں پر محیط ہو گیا۔ اب پچھلے دنوں شاید ڈیڑھ سال بعد ایک دوست سے ملاقات کی غرض سے اپنے قدیم محلے میں جانا ہوا۔ ہم ایک ہوٹل پر چائے کے لیے بیٹھے تو باتوں کے دوران اس نے اچانک ایک طرف اشارہ کر کے مجھ سے کہا:

"اسے پہچانتے ہو؟"

میری نگاہیں اس کے اشارے کے تعاقب میں ایک الٹرا ماڈرن سی شے پر جا رکیں۔ وہ ایک نوجوان تھا، ویسا ہی ایک عام سا فریب خوردہ نوجوان جو ہمارے گلی محلوں میں آج کل عام ملتے ہیں۔ سنہرے بلیچ شدہ لمبے لمبے بال، فرنچ کٹ، بلیڈ سے خود ہی پھاڑی ہوئی تنگ میلی جینز پہنے اس لڑکے نے کانوں، گلے اور ہاتھوں میں لڑکیوں کی طرح مختلف زیورات پہنے ہوئے تھے.... میں نے بیزاری سے منہ موڑا اور کہا: "نہیں ...."

تم کہتے کہ میں نے پہچان لیا ہے تو مجھے حیرت ہوتی.... ارے یہ عالم خان ہے!""

نعمان نے اپنی دانست میں انکشاف کیا تھا لیکن میں پھر بھی پہچان نہ سکا اور لاتعلقی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

ارے بھائی! ابھی تک نہیں پہچانے، وہ منی باجی کا بیٹا عالم ہے، گورنمنٹ"

اسکول کے ساتھ والے گھر کا عالم خان عرف گڈو!"اور اب مجھے اچانک یاد آیا کہ وہ کس عالم خان کی بات کر رہا ہے۔ بے یقینی کی کیفیت میں ' میں نے دوبارہ اس لڑکے کو دیکھا جو اب اپنے دوستوں کے ساتھ کسی بات پر عامیانہ انداز میں قہقہے لگا رہا تھا۔"ارے نہیں بھائی، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" میرے منہ سے بے اختیار نکلا لیکن ساتھ ہی میری نگاہوں نے اس کے میک اپ زدہ چہرے کے پیچھے وہ معصوم نقوش تلاش کر لیے تھے جو میری یاد میں ایک شرمیلے سے نوجوان کے ساتھ وابستہ تھے۔"جی ! یہ وہی گڈو ہے، اب تو بڑی فنٹر چیز ہو گیا ہے۔ لیکن تمہیں پتا ہی ہے کہ پہلے کیسا شریف نوجوان ہوا کرتا تھا؟ بس چند بدمعاش لڑکوں کے ہتھے چڑھ گیا۔ انہیں پتا تھا کہ غریب لڑکا ہے، اس لیے مختلف ترغیبات دے کر اسے پھسلا لیا۔ اسے موبائل لے کر دیا اور موٹر سائیکل کے لالچ میں اسے خراب کرتے رہے۔ پھر بڑی مصیبت یہ ہوئی کہ انہوں نے عالم خان کو اپنی تنظیم میں جوائن کر لیا۔ اب تم صاحبزادے کا حال دیکھ ہی رہے ہو کہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ پڑھائی سب چھوڑ دی ہے،اور موصوف اپنے لچے دوستوں کے ساتھ غنڈہ گردی کرتے پھرتے ہیں۔اور یہ تو کچھ نہیں، تمہیں بتاؤں کہ ...." یہاں پہنچ کر میرے دوست نومی نے اپنی دھیمی آواز سرگوشی میں بدل لی۔"کہ وہ اب تک تین چار قتل بھی کر چکا ہے!!"

میں جو حیرت سے ایک بے یقینی کی کیفیت میں یہ سب روداد سن رہا تھا، تقریباً

"اپنی جگہ سے اچھل ہی پڑا۔" وہ کیسے ؟

کیسے ؟.... ارے بھئی وہ اب تنظیم کے عسکری ونگ میں ہے۔اور تین چار قتل ان"

"!کے لیے کوئی بڑی بات نہیں ہوتی

میں تاسف سے عالم کو دیکھنے لگا۔یکایک مجھے اس کی ماں منی باجی کا خیال آیا۔ وہ بے چاری توزندہ درگور ہو گئی ہوں گی۔ بیوہ تھیں اور اکلوتا لڑکا تھا۔کیسے سنبھال کر انہوں نے اسے پروان چڑھایا تھا.... چچ۔

نعمان سے پوچھا تو کہنے لگا: "ہاں پہلے تو بے چاری بہت زیادہ پریشان ہوئیں، ان کی زندگی بھر کی کمائی جو بیچ چوراہے میں لُٹ رہی تھی۔ لیکن پھر جب پیسے کی ریل پیل ہوئی

"....توانہوں نے سمجھوتا کر لیا۔اب تو بڑے ٹھاٹ ہیں اُن لوگوں کے

میں تھوڑی دیر بعد وہاں سے چلا آیا۔وہی روزمرہ کے معمولات شروع ہو گئے لیکن بیس بائیس برس کا عالم خان عرف گڈو میرے اعصاب پر بری طرح سوار ہو گیا ہے.... چند بدقماش لڑکوں کی بدنیتی نے ایک شریف نوجوان کو ذلالت کی کس پستی میں ،پھینک دیا تھا! اب یہی کل کا معصوم گڈو آیندہ دہشت گرد بن کر ابھرے گا

شریفوں کی عزتوں سے کھیلے گا اور نہ جانے کتنی معصوم جانیں لے گا۔ اور یہ سب کیوں ہوا؟ محض بری صحبت اور گندے ماحول کی نحوست کی وجہ سے ....

جی ہاں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان عالی شان کا مفہوم ہے کہ بری صحبت سے بچو اور اچھے لوگوں کی صحبت اختیار کرو، پھر آگے مثال دی کہ عطر فروش کی دوستی سے اگر عطر میسر نہ بھی ہوا تو کپڑوں سے خوشبو آئے گی اور کوئلہ فروش کی صحبت سے اگر کوئلہ نہ بھی لیا تو کپڑے ضرور کالے ہوں گے۔ تو یوں ثابت ہوا کہ صحبت اچھی ہو یا بری رنگ ضرور لاتی ہے.... اب ایک نظر ہم اپنے بچوں کو دیکھیں کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا کن لوگوں کے ساتھ ہو رہا ہے۔ خصوصاً یہ ضرور دیکھیں کہ وہ اپنے سے بڑی عمر کے لڑکوں کے ساتھ تو نہیں بیٹھ رہے۔ کیوں کہ بڑی عمر والوں کے ساتھ دوستی اور اختلاط مردوزن بہت بڑی برائی کا پیش خیمہ ہے۔ اللہ ہم سب کی حفاظت فرمائے۔

دوسری طرف کسی اللہ والے کا مقولہ ہے کہ

یک زمانہ صحبتِ با اولیاء

بہتر از صد سالہ طاعتِ بے ریا

"ایک گھڑی اللہ والوں کی صحبت میں گزارنا سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔"

شکوہ کناں

ایک شکوہ کناں کی کہانی، جس کا کوئی راز داں نہیں تھا
پہلی جنگ عظیم جاری تھی۔ میرے بابا فوج میں تھے۔ انہیں اکثر و بیشتر محاذ پر رہنا پڑتا تھا۔ گھر آنے کی نوبت گاہے گاہے آتی تھی۔ جنگ کے زمانے میں انہیں میں نے بہت کم دیکھا۔ کبھی کبھار دیکھا بھی تو اس طرح کہ سوتے سوتے میری آنکھ کھل جاتی اور خاکی وردی والا ایک لمبا تڑنگا شخص مجھ پر جھکا ہوا ہوتا۔ بابا مجھے پیار کرنے کے لیے مجھ پر جھکتے تھے۔ ان کے آنے یا جانے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ کبھی کبھی وہ رات گئے آتے۔ ان کے فوجی بوٹ کی کھٹ کھٹ سے میری آنکھ کھل جاتی یا کبھی کبھی ان کے آنے کی خبر مجھے صبح ہوتی۔ میں سو کر اٹھتا تو بابا کو مما کے پلنگ پر سوتا ہوا دیکھتا۔ مما اس وقت ناشتہ تیار کرنے کے لیے باورچی خانے میں ہوتیں۔ میرے بابا کا گھر آنا جانا ہمیشہ پراسرار رہا مگر ان کے آنے سے مجھے خوشی ہوتی تھی، حالاں کہ مما کا پلنگ خاصا بڑا تھا اور صبح سویرے میں اپنے کمرے سے نکل کر مما کے ساتھ لیٹ جاتا تھا لیکن ڈیڈی کے آنے کے بعد پلنگ کی گنجائش کم ہو جاتی تھی اور میں ان دونوں کے درمیان پھنس کر رہ جاتا تھا۔ بابا تمباکو نوشی کے عادی تھے۔ ان کی

سانسوں سے تمباکو کے بھبکے اٹھتے تو میں پریشان ہو جاتا تھا۔ ان کے کھردرے ہاتھ اور داڑھی کے نوکیلے بال بھی مجھے تنگ کرتے تھے لیکن ڈیڈی جب بھی آتے، بہت ساری چیزیں لاتے۔ کھلونے، تمغے، گورکھا چاقو اور دوسرے تحائف۔ یہ سب چیزیں میری کھلونوں کی الماری میں محفوظ ہو جاتیں۔

جنگ کا زمانہ میرے لیے بہت پرسکون تھا۔ میرے کمرے کی کھڑکی مشرق کی طرف کھلتی تھی۔ مما نے کھڑکیوں پر دبیز پردے ڈال رکھے تھے لیکن میری آنکھ صبح کی پہلی کرن کے ساتھ کھل جاتی تھی اور میں بستر سے بہت ہشّاش بشّاش اٹھتا تھا۔ کچھ دیر تک میں ان کاموں کے متعلق سوچتا رہتا جو مجھے دن بھر میں کرنے ہوتے۔ ہمارے ہاں کوئی ملازم نہیں تھا لہٰذا مجھے مما کے کاموں میں ہاتھ بٹانا پڑتا تھا۔ کبھی کبھی یہ کام مجھے بہت ناگوار گزرتے تھے۔ پوری بلڈنگ میں صرف ہمارے گھر میں کام کرنے والا کوئی لڑکا نہیں تھا۔ میں نے بارہا مما سے نوکر رکھنے کے لیے ضد کی مگر مما کا کہنا تھا کہ نوکر کو تنخواہ دینے کے لیے ان کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دوسرے کاموں کے لیے مما کے پاس پیسے کہاں سے آ جاتے تھے۔

مما میرے جاگنے کے بعد ہی بستر چھوڑتی تھیں۔ پھر وہ اٹھ کر ناشتہ تیار کرنے لگتیں۔ ناشتے کے بعد ہم ہمیشہ بابا کے لیے دعا کرتے پھر سودا سلف لینے بازار

چلے جاتے۔ اگر سودا لینے کے بعد کچھ وقت بچ جاتا تو مما مجھے اپنی کسی سہیلی کے ہاں لے جاتیں اور اگر موسم خوشگوار ہوتا تو ہم باغ میں چہل قدمی کرنے چلے جاتے۔

ہر رات سونے سے پہلے میں دعا کرتا کہ اے اللہ! بابا کو جلدی سے گھر بھیج دے۔" یہ دعا مجھے مما نے سکھائی تھی۔

ایک صبح میری آنکھ کھلی تو کیا دیکھتا ہوں کہ بابا ہمیشہ کی طرح پراسرار طور پر موجود ہیں۔ اس روز بابا خاکی وردی کی بجائے نہایت خوبصورت نیلا سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ مما بہت زیادہ خوش نظر آ رہی تھیں۔ نہ معلوم اس میں خوشی کی کیا بات تھی۔ مجھے تو بابا خاکی وردی کے بغیر کچھ زیادہ اچھے دکھائی نہیں دیے۔ مما ہنستی مسکراتی ہوئی گھر بھر میں دوڑتی پھر رہی تھیں۔

انہوں نے مسرت بھرے لہجے میں مجھے بتایا کہ "نومی! اللہ نے ہماری دعا سن لی ہے، تمہارے بابا جنگ سے واپس آ گئے ہیں۔" ہم نے جنگ سے بابا کی بحفاظت واپسی پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ گھر کے کام کاج نمٹا کر ہم لوگ بازار گئے، وہاں سے واپس آ کر بابا اور مما آپس میں گفتگو کرنے لگے۔ بابا زیادہ بول رہے تھے اور مما ان کی بے سروپا باتیں بڑے غور سے سن رہی تھیں۔ مما کا یہ

انہماک مجھے اچھا نہیں لگا، میں نے بابا کی گفتگو میں دخل اندازی کرنا چاہا تو مما بولیں:
نومی بیٹے! کچھ دیر خاموش رہو۔"مما نے پیار سے مجھے سمجھایا۔ یہ الفاظ مما عموماً کسی" غیر دلچسپ مہمان کے سامنے کہا کرتی تھیں۔ اس لیے میں نے خاموشی کی بجائے گفتگو جاری رکھی۔
نومی! خاموش رہو۔" مما نے بے چینی سے پہلو بدل کر نسبتاً سخت لہجے میں کہا۔ "دیکھ" "نہیں رہے ہو' میں تمہارے بابا سے بات کر رہی ہوں۔
یہ جملہ میں نے مما کے منہ سے پہلی بار سنا تھا۔ 'دیکھ نہیں رہے ہو' میں تمہارے بابا سے بات کر رہی ہوں۔' میرے دل میں فوراً خیال آیا کہ اگر ہماری دعا کا یہی اثر ہے تو لگتا ہے ہماری دعا رائیگاں ہی گئی۔ میں نے لہجہ بدل کر سوال کیا۔ "آپ بابا سے باتیں "کیوں کر رہی ہیں؟
ہم بہت ضروری باتیں کر رہے ہیں۔ تم خاموش رہو یا جاؤ، جا کر کھیلو۔" مما نے فیصلہ" صادر کر دیا۔
شام کو مما کے کہنے سے بابا مجھے بازار گھمانے نکلے۔ مما مجھے ہمیشہ باغ میں لے جاتی تھیں۔ اس تبدیلی سے مجھے خوشی ہوئی لیکن میں نے محسوس کیا کہ میری

اور بابا کی دلچسپیوں میں بے حد تضاد ہے۔ انہیں بازار کی رونق، دوڑتی بھاگتی گاڑیوں اور جلتی بجھتی روشنیوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہیں جگہ جگہ اپنے ہم عمروں سے باتیں بنانے میں لطف آتا تھا۔ یہ لئے انہیں ایسا کرنے سے روکنا چاہا تو انہوں نے مجھے ہاتھ سے پیچھے دھکیل دیا۔ میں چپ چاپ کھڑا بور ہوتا رہا۔

شام کی چائے پر مما اور بابا کی ضروری گفتگو کا سلسلہ پھر شروع ہو گیا۔ بابا بازار سے اخبار خرید لائے تھے۔ وہ کبھی اخبار پڑھتے، کبھی مما سے گفتگو کرنے لگتے۔ مما فوراً ان کی طرف متوجہ ہو جاتیں، میں انہیں کوشش کے باوجود اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکا پھر بھی میں نے ہمت نہیں ہاری، کچھ نہ کچھ بولتا رہا۔ میری بار بار کی دخل اندازی پر مما نے جھنجھلا کر کہا۔ "نومی! جب بابا اخبار پڑھ رہے ہوں تو تمہیں خاموش رہنا چاہیے۔" مجھ پر واضح ہو گیا کہ مما میرے مقابلے میں بابا سے گفتگو کرنا زیادہ پسند کرتی ہیں یا بابا سے اتنی خوف زدہ ہیں کہ ان کے سامنے مجھ پر توجہ دینا نہیں چاہتیں۔

رات کو مما مجھے میرے کمرے میں سلانے آئیں۔ میں نے ان سے دریافت کیا۔ "مما! "اگر میں دعا مانگوں کہ اے اللہ! بابا کو واپس جنگ پر بھیج دے تو کیا وہ بھیج دے گا؟

"....مما کچھ دیر خاموش رہیں پھر انہوں نے مسکرا کر کہا۔ "نہیں
کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔"
"اس لیے کہ اب جنگ نہیں ہو رہی ہے۔"
لیکن مما! آپ تو کہتی ہیں کہ اللہ ہر کام کر سکتا ہے، اگر وہ چاہے تو کیا جنگ دوبارہ"
"شروع نہیں کرا سکتا؟
وہ چاہے تو شروع کرا سکتا ہے مگر وہ چاہے گا نہیں۔" انہوں نے میرا گال تھپ تھپایا۔"
"بے مقصد جنگ خدا نہیں کراتا، برے لوگ کراتے ہیں۔"
اگر خدا جنگ نہیں کراتا تو برے لوگ کیوں کراتے ہیں؟" میں نے معصومیت سے"
"پوچھا۔ "کیا برے لوگ خدا سے بڑے ہوتے ہیں؟
یہ بات ابھی تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ اب تم چپ چاپ سو جاؤ۔" مما نے کہا تو"
میں نے ناامیدی سے چپ سادھ لی۔

میں حسب معمول صبح سویرے اٹھا اور مما کے کمرے میں چلا گیا۔ مما اور بابا سوئے ہوئے تھے۔ مجھے مجبوراً ان دونوں کے درمیان گھسنا پڑا۔ مما ایک کنارے سکڑی سمٹی لیٹی تھیں اور بابا نے اپنے حصے سے زیادہ بستر پر قبضہ جما رکھا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ میں اپنے لیے خاطر خواہ جگہ کیسے نکالوں۔ میں نے بابا پر دو چار لاتیں چلائیں' وہ غراتے ہوئے ایک طرف ہو گئے۔ میں اپنے لیے جگہ بنا کر اطمینان سے انگوٹھا چوسنے لگا۔ بستر کی گرمی نے مجھے

"! بہت آرام پہنچایا۔ چند لمحوں بعد میں نے مما کو آواز دی۔ "مما! مما

ششش! بابا کو مت جگاؤ" مما نے اٹھ کر مجھے خاموش کر دیا۔"

مما بابا سے گفتگو کرتے وقت مجھے نظر انداز کرتی تھیں مگر یہ بات مجھے اس سے زیادہ تکلیف دہ معلوم ہوئی۔ میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مما سے گفتگو کیے بغیر دن شروع ہو "سکتا ہے۔ میں نے ان سے پوچھا۔ "کیوں مما؟

بے چارے بابا تھکے ہوئے ہیں۔" انہوں نے سرگوشی کی۔"

بے چارے بابا!" مما کے منہ سے مجھے یہ جملہ قطعی پسند نہیں آیا۔ میں نے ان کی" ہدایت سنی اَن سُنی کر کے کہا۔ "کیا آپ کو یاد ہے' آج مجھے آپ کے ساتھ کہاں جانا ہے؟ آج میں آپ کے ساتھ دریا کے کنارے چل کر مچھلیاں پکڑوں گا۔ آپ نے کہا تھا "نا کہ دریا سے لَوٹ کر آج ہم مچھلیاں پکائیں گے۔

مما نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا، میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہنے لگیں۔ "بابا کو "مت جگاؤ۔

مگر بابا جاگ چکے تھے، ان کے گلے سے غراہٹ سی نکلی اور وہ ماچس تلاش کرنے لگے' پھر انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر غور سے گھڑی دیکھی۔ مما نے بڑے نرم لہجے میں ان سے پوچھا۔

"چائے پیوگے ڈیئر؟ "

"چائے؟" بابا نے حیرت سے کہا۔ "ابھی کیا وقت ہوا ہے۔"

میں بیچ میں بول پڑا۔ "اٹھ جایئے بابا! چائے پی لیجیے۔ میں چائے پی کر مچھلیاں پکڑنے جاؤں گا۔" میں نے بہت امید سے مما کی طرف دیکھا۔

خاموشی سے سو جاؤ نومی!" اب کے مما نے مجھے بہت زور سے ڈانٹا۔ مجھے رونا آ گیا۔"

بابا نے کچھ نہیں کہا۔ انہوں نے خاموشی سے پائپ سلگایا اور کمرے میں دھواں بکھیرنے لگے۔ وہ خاموشی سے پائپ پی رہے تھے، میری یا مما کی طرف توجہ نہیں دے رہے تھے۔

میں مما سے اکثر ضد کرتا تھا کہ وہ مجھے اپنے ساتھ سلائیں، وہ کہتی تھیں کہ نہیں' ایک بستر پر سونا صحت کے لیے اچھا نہیں ہے۔ میں سوچنے لگا کہ یہی بات انہوں نے بابا سے کیوں نہیں کہی۔

بابا پائپ پیتے پیتے اٹھے اور باورچی خانے میں چلے گئے۔ وہاں انہوں نے چائے بنائی۔ تھوڑی دیر بعد وہ مما کے لیے تو چائے لائے لیکن میرے لیے نہیں۔ مجھے غصہ آ گیا۔

"مما! " میں نے چیخ کر کہا۔ " میں بھی چائے پیوں گا۔"

تم میرے ساتھ پی لینا۔" مما نے رسان سے کہا۔"

یہ بات مجھے بہت بری لگی۔ میں مما کی چائے میں حصہ کیوں بٹاتا؟ مجھے میرے گھر میں برابر کا حق ملنا چاہیے تھا۔ میں سوچنے لگا۔ بابا اور میں ساتھ نہیں رہ سکتے۔ ہم دونوں میں سے کسی ایک کو اس گھر سے جانا پڑے گا۔ یہ لئے جھنجھلاہٹ ہیں مما کی ساری چائے پی لی لیکن انھوں نے تحمل سے کام لیا، کچھ کہا نہیں۔

رات کو مما مجھے سلانے آئیں۔ اِدھر اُدھر کے دو ایک جملوں کے بعد انھوں نے آہستہ سے کہا۔ "نومی! میں تم سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔"

"کیا؟" میں نے دریافت کیا۔

"مما بولیں۔ "وعدہ کرو کہ تم صبح صبح آکے بے چارے بابا کو پریشان نہیں کروگے۔"

پھر وہی بے چارے بابا، دو ہی دنوں میں مما کی تمام ہمدردیاں اُن کے ساتھ ہو گئی تھیں۔ مجھے غصہ آنے لگا۔ "کیوں مما؟"

"تمہارے بابا پریشان اور تھکے تھکے رہتے ہیں' ان کے لیے سونا بہت ضروری ہے۔ تمہارے آنے سے ان کی نیند میں خلل پڑتا ہے۔"

"لیکن مما! بابا پریشان اور تھکے تھکے کیوں رہتے ہیں؟"

اس لیے کہ جب وہ جنگ پر تھے تو ہمارے لیے خرچا بھیجتے تھے۔ اب جنگ ختم ہو جانے سے ان کی ملازمت ہو گئی ہے۔ خرچہ نہیں آئے گا تو ہم گزارا کیسے کریں گے؟ تمہارے بابا کے لیے ضروری ہے کہ وہ محض ہمیں آرام پہنچانے کی خاطر باہر جا کر کام کریں اور باہر جا کر کام کرنے کے لیے ان کی نیند پوری ہونا ضروری ہے۔"

صبح میری آنکھ کھلی تو مما کی باتیں مجھے یاد تھیں۔ میں بہت دیر تک اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ کھلونوں سے کھیلتا رہا لیکن آج نہ جانے کیا بات تھی کہ سورج نکل ہی نہیں رہا تھا۔ مجھے خواہش ہوئی کہ کوئی مجھے ایک پیالی چائے بنا دے۔ آخر مجھ سے برداشت نہ ہو سکا، مما کی باتیں ایک دم میرے ذہن سے نکل گئیں اور میں ان کے کمرے میں چلا گیا۔ مما اور بابا سو رہے تھے۔ میں مما کے اوپر سوار ہو کے اپنے لیے جگہ بنانے لگا۔ مما کی آنکھ کھل گئی۔ انہوں نے زور سے میرا بازو پکڑ لیا۔ "نومی! تم نے مجھ سے کیا وعدہ کیا تھا؟" میں شرمندہ ہو کے رہ گیا۔ مما نے میرا ماتھا چُھوتے ہوئے پریشانی سے کہا۔ "اوہ تمہارا تو بدن بھی گرم ہے، اچھا آؤ، خاموشی سے سو جاؤ، بات بالکل نہیں کرنا۔"

میں ان کی پشت سے چپک کر کچھ دیر تک زبردستی آنکھیں موندے لیٹا رہا لیکن آخر

کب تک لیٹا رہتا۔ میں تو مما سے باتیں کرنا چاہتا تھا۔ "مما! مما!" یہ لہٰذا انہیں ہلانے جلانے کی کوشش کی۔

"نومی! خاموش رہو۔ تمہارے بابا سو رہے ہیں۔"

"مما نے سرگوشی میں مجھے ڈانٹا۔" "یہ بات آخر تمہاری سمجھ میں کیوں نہیں آتی؟ میں باتیں کرنا چاہ رہا تھا اور بابا سونا چاہ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ آخر یہ گھر کس کا ہے؟ یہ سوچ کر میں نے اعتماد سے کہا۔ "مما! بابا کی صحت کے لیے اچھا ہے کہ یہ دوسرے کمرے میں سویا کریں۔" مما خاموش ہو کر رہ گئیں۔

بہت دیر بعد انہوں نے میری جانب کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔ "نومی! یا تو بالکل چپ "ہو جاؤ یا اگر چپ نہیں ہو سکتے تو اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔

گویا میرے ساتھ مما نے جو ناانصافی شروع کر دی تھی، میں نے اس کا اقرار خود ان کے منہ سے کروا لیا تھا جب ہی تو انہوں نے میری بات کا جواب نہیں دیا بلکہ الٹا مجھے ڈانٹنے لگیں۔ یہ سب کچھ بابا کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ میں نے مما کی نظر بچا کر بابا کی کمر پر ایک لات لگا دی۔ اس حرکت کا خاطر خواہ اثر ہوا، بابا نے غرّا کے آنکھیں کھول دیں۔

کیا وقت ہوا ہے؟" انہوں نے"

دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے دروازے پر کوئی کھڑا ہو۔
مما نے دنیا بھر کی مٹھاس اپنی آواز میں گھولتے ہوئے کہا۔ "ابھی کوئی خاص وقت نہیں ہوا ہے ڈیئر!" پھر وہ بستر سے اٹھیں اور مجھے گھورتے ہوئے بولیں۔" تم نے بابا کو جگا دیا نا، چلو اٹھو اور اپنے بستر پر جاؤ۔" انہوں نے جھک کر مجھے بستر سے اٹھانا چاہا۔ میرا حق مجھ سے زبردستی چھینا جا رہا تھا۔ میں احتجاجاً ان کے ہاتھوں میں اکڑ گیا اور زور زور سے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے چیخنے لگا۔ میرا چیخنا ایسا تھا کہ مردہ بھی قبر سے اٹھ کھڑا ہوتا۔ اچانک بابا دہاڑے۔
عجیب گدھا لڑکا ہے، یہ کبھی سوتا بھی ہے کہ نہیں؟" انہوں نے خود کو چادر میں لپیٹے ہوئے گردن اٹھا کر مجھے دیکھا۔ چادر سے صرف دو سیاہ آنکھیں جھانکتی دکھائی دیں۔ اُف، کتنے ڈراؤنے لگ رہے تھے وہ!
مما کے لیے مجھے سنبھالنا مشکل ہو رہا تھا۔ آخر دروازے تک پہنچتے پہنچتے انہوں نے مجھے زمین پر کھڑا کر دیا۔ میں ان کے ہاتھوں سے چھوٹتے ہی کمرے کی دیوار سے جا لگا اور زور زور سے اس طرح پاؤں پٹخنے لگا جیسے میری قوت دوگنی ہو گئی ہو۔

بابا اٹھ بیٹھے اور مجھے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے چلاّئے۔ "خاموش!" ان کی چنگھاڑ نے مجھے ایک لمحے کے لیے گنگ کر دیا۔ اس انداز میں مجھے اس سے پہلے کسی نے مخاطب نہیں کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ بابا کا چہرہ سرخ ہو رہا ہے۔ یکایک میرے غصے میں بھی زبردست اضافہ ہو گیا۔ میں سسکتے ہوئے جواباً چیخا۔ "تم.... تم چپ رہو۔"

کیا کہا؟" بابا نے بستر سے چھلانگ لگائی۔"

زبیری.... سنو پلیز" دروازے کے قریب سے مما کی سہمی ہوئی آواز سنائی دی۔ "نومی" بچہ ہے، ابھی تم سے مانوس نہیں ہوا۔" میں نے مما کی طرف دیکھا، ان کی آنکھوں میں خوف تھا۔

مگر بابا نے ان کی بات جیسے سنی ہی نہیں اور ایک درندے کی طرح مجھ پر جھپٹے۔ میں ننگے پاؤں کمرے میں اِدھر سے اُدھر ناچنے لگا۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے، کمرے سے نہیں نکلوں گا۔

اس روز سے ہماری زندگی عذاب ہو گئی۔ اب بابا اور مَیں ایک دوسرے کے دشمن بن چکے تھے۔ وہ مما سے میرا وقت چُرانے کی کوشش کرتے اور میں اُن کا وقت چرانے کے چکر میں رہتا۔ جب بھی مما مجھے سونے سے پہلے کہانی سنانے بیٹھتیں' بابا کو اپنی کسی پرانی چیز کی ضرورت پیش آ جاتی یا چائے پینے کی خواہش ہونے لگتی یا کوئی دلچسپ واقعہ انہیں یاد آ جاتا۔ اور جب بابا اور مما گفتگو میں

محو ہوتے تو میں شور مچا مچا کر کھلونوں سے کھیلنے لگتا۔

ایک شام بابا باہر سے واپس آئے۔ میں ان کے صندوق سے چیزیں نکال نکال کر کھیل رہا تھا۔ اس میں ان کے تمغے تھے اور نہ جانے کیا کیا چیزیں بھری ہوئی تھیں۔ بابا مجھے اپنی چیزوں سے کھیلتے دیکھ کر برس پڑے۔ ان کے برسنے پر مما جھنجھلا گئیں۔ انہوں نے بابا کی چیزیں سمیٹ کر صندوق میں رکھتے ہوئے مجھے ایک چانٹا رسید کر دیا۔ ”نومی! بابا کی چیزیں اس وقت تک نہ چھیڑا کرو جب تک وہ خود اجازت نہ دیا کریں۔“

حالات روز بروز خراب ہوتے گئے۔ میں نے بہت سوچا، بہت غور کیا مگر یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ آخر بابا میں ایسی کیا خصوصیت ہے کہ مما انہیں مجھ سے زیادہ چاہتی ہیں۔ میرے نزدیک تو وہ کسی طرح مجھ سے بہتر نہیں تھے۔ انہیں چائے تک پینی نہیں آتی تھی۔ چائے پیتے وقت ان کے منہ سے سُرڑ سرڑ کی آوازیں نکلتی تھیں۔ ایک دن مجھے خیال آیا کہ بابا اخبار پڑھ کر مما کو خبریں سناتے ہیں، شاید اسی لیے وہ انہیں زیادہ چاہتی ہیں۔ یہ خیال آتے ہی میں بھی اِدھر اُدھر سے خبریں جمع کر کے مما کو سنانے لگا۔ لیکن اس کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا۔ پھر مجھے گمان ہوا کہ بابا کی تمباکو نوشی مما کو اچھی لگتی ہے لہٰذا ایک روز میں نے بابا کا پائپ اٹھا کر انہی کی طرح ہونٹوں میں دبایا اور گھر

میں ٹہلنا شروع کر دیا۔ اتفاق سے مما سے پہلے بابا نے مجھے دیکھ لیا۔ وہ تو موقع کی تاک میں رہتے تھے۔ انہوں نے فوراً میری پٹائی کر دی۔ پھر ایک بار چائے پیتے ہوئے میں نے بابا کی طرح سڑ سڑ کی آوازیں نکالیں۔ مما نے بری طرح مجھے ڈانٹ دیا۔

میں ہر وقت وہ راز جاننے کی فکر میں لگا رہتا تھا جس کی وجہ سے مما بابا کو زیادہ پسند کرتی ہیں۔ آخر ایک دن یہ بات میری سمجھ میں آ گئی، نہ معلوم یہ معمولی بات پہلے میرے ذہن میں کیوں نہیں آئی تھی۔ بابا نے چوں کہ مما سے شادی کی تھی، اس لیے مما انہیں مجھ پر فوقیت دیتی تھیں۔ ایک دن ہمت کرکے میں نے بابا کو جتا دیا کہ میں نے ان سے شکست قبول نہیں کی ہے، ہاں اپنے بڑے ہونے کا انتظار کر رہا ہوں۔ بابا نے میری بات سُنی اَن سنی کر دی۔

ایک شام وہ دونوں میری موجودگی نظر انداز کرکے خوش گپیاں کر رہے تھے۔ میں نے بڑے مدبّرانہ انداز میں مما کو مخاطب کیا۔ "مما! آپ جانتی ہیں ' میں بڑا ہو کر کیا کروں گا؟"

نہیں جانتی۔ بتاؤ کیا کروگے؟"انہوں نے سوال کیا۔"

میں.... میں آپ سے شادی کروں گا۔" میں نے صاف صاف کہہ ہی دیا۔ بابا نے" مذاق اڑانے کے انداز میں قہقہہ لگایا لیکن مما خوش ہو گئیں۔ شاید یہ سن کر

انہیں سکون ملا تھا کہ ایک دن بابا سے انہیں نجات مل جائے گی۔ انہوں نے مجھے گود میں اٹھا لیا۔ "بھئی یہ تو بہت اچھا ہو گا۔"

"ہاں بہت اچھا ہوگا، پھر بہت سارے، بہت سارے بچے ہوں گے۔"

ہاہاہا.... "بابا اب منہ پھاڑ کر ہنس رہے تھے۔ مجھے لگا وہ میرا مذاق اڑا رہے ہیں۔ میں طیش میں آگیا۔

خوب۔" مما نے مجھے چومتے ہوئے کہا۔ "اب بہت جلد تمہارا بھائی آ جائے گا پھر تم اکیلے نہیں رہوگے، یوں سمجھ لو کہ تمہارے لیے ایک ننھا سا کھلونا آ رہا ہے۔" بھائی کی خوش خبری سن کر مجھے بہت اطمینان حاصل ہوا کہ بابا کی تمام مخالفتوں کے باوجود مما کو مجھ سے محبت ہے جب ہی تو وہ میرے لیے بھائی لا رہی ہیں۔

مگر بھائی آنے سے پہلے گھر کا ماحول میرے لیے پہلے سے زیادہ اجنبی بنتا چلا گیا۔ اب بابا رات کو دیر سے گھر آنے لگے تھے۔ مما بھی کوئی خاص کام نہیں کرتی تھیں پھر بھی وہ مجھے سیر کے لیے نہیں لے جاتی تھیں۔ وہ روز بروز صحت مند ہوتی جا رہی تھیں لیکن اس کے باوجود اُن کا مزاج چڑ چڑا ہوتا جا رہا تھا۔ بات بات پر جھنجھلا جاتی تھیں۔ خصوصاً میری ہر حرکت پر انہیں غصہ آ جاتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھڑکنے لگی تھیں۔ انہوں نے مجھے گود میں اٹھانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ وقت یوں ہی گزرتا رہا۔

ایک دن اچانک مما کی طبیعت خراب ہو گئی۔ انہیں بابا اسپتال لے گئے۔ پھر وہ اسپتال سے آئیں تو تنہا نہیں تھیں، وہ میرے لیے ایک بھائی لے آئی تھیں۔ جسے وہ سونی سونی کہہ رہی تھیں۔

سونی حالاں کہ میرے کھیلنے کے لیے لایا گیا تھا لیکن مجھے تو مما اسے ہاتھ بھی نہیں لگانے دے رہی تھیں۔ وہ دن بھر سونی کے ساتھ پلنگ پر پڑی رہتیں۔ میں پہلے ہی روز سے سونی کو ناپسند کرنے لگا۔ وہ مجھ سے بہت مختلف لڑکا تھا۔ اسے ہر وقت مما کی توجہ چاہیے تھی اور مما گویا اسی کی ہو کر رہ گئی تھیں۔ میں سوچتا کہ اتنی سی بات بھی ان کی سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ بسا اوقات سونی خواہ مخواہ بھی ان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانا چاہتا تھا۔ عجیب کاہل لڑکا تھا۔ دن دن بھر سوتا رہتا اور اس کی نیند میں خلل پڑنے کے ڈر سے مجھے خاموش رہنا پڑتا تھا۔ پہلے مما کی زبان پر 'بے چارے بابا' کا نعرہ رہتا تھا، اب وہ 'سونی کو مت جگاؤ، سونی کو مت جگاؤ" کی رَٹ لگائے رکھتی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سونی آخر اس وقت کیوں نہیں سوتا جب سب سوتے ہیں، ہر وقت کیوں سوتا رہتا ہے۔ مجھے موقع کی تلاش رہتی تھی کہ جب بھی مما کسی کام میں لگی ہوتیں، میں زور سے چٹکی بھر کے سونی کا جگا دیتا۔ ایک روز مما نے مجھے ایسا کرتے ہوئے دیکھ لیا اور پھر خوب مجھے مارا۔

اس سے پہلے انہوں نے مجھے اس طرح کبھی نہیں مارا تھا۔ میں روتا ہوا باہر نکل کر لان میں کھلونوں سے کھیلنے لگا۔ اب اس گھر میں کھلونوں کے سوا میرا کوئی نہیں تھا۔ میرے کھلونے ہی میرے سچے دوست تھے حالاں کہ پہلے میں انہیں بے پروائی سے اِدھر اُدھر پھینک دیتا تھا لیکن اب اپنے دل کی تمام باتیں انہی سے کرتا تھا۔

میں ایک شام لان میں کھیل رہا تھا۔ معاً مجھے بابا آتے دکھائی دیے۔ میں ایسا بن گیا جیسے وہ مجھے نظر نہ آئے ہوں، پھر میں نے انہیں سنانے کے لیے اونچی آواز میں اپنے کھلونوں کو مخاطب کیا۔ "سنو ہوائی جہاز! سنو چابی کی موٹر! اب اس گھر میں کوئی بے بی آیا تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

بابا ٹھٹک کر رک گئے اور مجھے حیرت سے دیکھنے لگے۔ "نومی! تم کیا کہہ رہے تھے ابھی؟"

"میں اپنے کھلونوں سے باتیں کر رہا ہوں۔" میں ان کی طرف اچٹتی نظر ڈال کر پھر کھیل میں مشغول ہو گیا۔

بابا کچھ دیر تک مجھے دیکھتے رہے پھر چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے اندر چلے گئے۔

اس شام کے بعد سے میں نے بابا کے رویے میں نمایاں تبدیلی دیکھی۔ ان کا سلوک مجھ سے اچھا ہو گیا تھا لیکن مما کا رویہ وہی رہا۔ ان کی توجہ کا مرکز اب بھی سونی ہی تھا۔ مما اب بابا سے بھی بہت کم باتیں کرتی تھیں۔ وہ لوتھڑا ہر وقت ان سے چمٹا رہتا تھا۔ بابا کے کام کرنے بھی مما نے چھوڑ دیے تھے۔ اب ہر کام بابا کو خود کرنا پڑتا تھا۔ مما کے اس رویے سے بابا بھی کچھ پریشان نظر آتے تھے۔ وہ مما سے میری طرح صاف صاف بات تو نہیں کرتے تھے لیکن اکثر یہ شکایت ضرور کرتے کہ سونی کے رات بھر روتے رہنے کی وجہ سے ان کی نیند پوری نہیں ہو سکی ہے۔ لیکن مما پر سونی نے نہ جانے کیا جادو کر دیا تھا کہ وہ اس کے خلاف کچھ سننا نہیں چاہتی تھیں۔ بابا کی شکایت کے جواب میں وہ تڑ سے کہہ دیتیں۔ "اسے جب بھوک لگتی ہے، جبھی روتا ہے۔"

مجھے مما کی ناسمجھی پر بہت افسوس ہوتا تھا۔ میں جانتا تھا کہ سونی خواہ مخواہ روتا ہے تاکہ مما کی توجہ کسی اور جانب مبذول نہ ہو۔

ایک رات کوئی میرے بستر پر آگیا۔ میری آنکھ کھل گئی، مجھے فوراً یہ خیال آیا کہ یہ مما ہوں گی، آخر انہیں احساس ہو ہی گیا کہ وہ میرے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں لیکن اسی وقت دوسرے کمرے سے سونی کا رونا اور مما کا چمکارنا

سنائی دیا۔ میں نے غور سے دیکھا، یہ مما نہیں تھیں، بابا تھے۔ ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں اور وہ تھکے تھکے نظر آ رہے تھے۔ سوتے سوتے اٹھنے کے باعث ان کی سانسیں بے ترتیب تھیں۔ گویا میری طرح بابا بھی مما کے کمرے سے بے دخل کر دیے گئے تھے۔ مجھے بابا پر ترس آنے لگا اور میرا دل ان کے لیے پیار سے بھر گیا۔ میں نے بے اختیار اپنے بازو ان کی گردن میں ڈالے اور انہیں خود میں سمیٹ کر سلانے کی کوشش کرنے لگا۔ بابا نے گردن اٹھا کر مسکراتے ہوئے میری طرف دیکھا، پھر زور سے مجھے اپنے سینے میں بھینچ لیا۔

(انگریزی ادب سے انتخاب)

میں نے اسلام کیوں قبول کیا

حلیمہ سعدیہ

میں جنوبی دہلی کے ایک ہندو سینی خاندان سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرے والد ڈی، ڈی، اے میں چیف اکاؤنٹینٹ ہیں۔ میرے تین بھائی ہیں۔ تینوں اعلیٰ پوسٹوں پر الگ الگ منسٹریوں میں افسر ہیں۔ میں نے انگریزی میں ایم اے اور ماس کمیونی کیشن میں ڈپلومہ کیا ہے۔ میں بھی ملک کی ایک اہم وزارت میں سیکرٹری کی پوسٹ پر کام کرتی ہوں۔ میں نے اپنے لیے اسلامی نام حلیمہ سعدیہ تجویز کیا ہے، اگرچہ مجھے اس نام سے بہت کم لوگ یاد کرتے ہیں۔

حکومتِ ہند نے اپنے ملازمین کو غیر ملکی زبانیں سکھانے کے لیے ایک انسٹی ٹیوٹ قائم کیا تھا، جس میں دفتر کی طرف سے مجھے عربی زبان سیکھنے کے لیے بھیجا گیا۔ عربی سکھانے والے اکثر مسلمان اساتذہ تھے۔ انھوں نے عربی کے ساتھ اردو بھی سکھانی شروع کی۔ ہمارے والد صاحب اچھی اردو جانتے ہیں اور بہت اچھی اردو بولتے ہیں، اس لیے مجھے اردو سیکھنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ ہمارے اساتذہ میں ایک استاذ ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب تھے۔ انھوں نے تمام اسٹوڈنٹس کو عربی پڑھانے کے ساتھ ساتھ اسلام کا تعارف بھی کرایا اور تھوڑی سی عربی کی شد بد ہو جانے کے بعد ہمیں قرآنِ حکیم سے عربی پڑھوانے لگے۔

ڈاکٹر محسن عثمانی صاحب جو اس وقت دہلی یونی ورسٹی میں پروفیسر تھے، انہوں نے ہم سبھی عربی پڑھنے والوں کو ہندی اور انگریزی میں اسلام پر لٹریچر فراہم کیا۔ شیخ محمد کلیم صدیقی کی کتاب "آپ کی امانت" بھی لاکر دی۔ واقعی وہ درد کی زبان میں لکھی گئی کتاب ہے۔ اس کتاب کے پڑھنے کے بعد میری قرآن شریف سے دلچسپی بڑھ گئی اور باالآخر اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت دی اور میں نے ڈاکٹر صاحب کو خوشخبری دی کہ میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں۔ انہوں نے مجھے کلمہ پڑھوایا۔ اس کے بعد میں اسلام کی معلومات اور نماز وغیرہ سیکھنے کے لیے مرکز نظام الدین جانے لگی، جہاں پر جنوبی ہندوستان کے ایک عالم دین کے گھر جاکر میں نماز وغیرہ یاد کرتی اور بھی چند مسلمانوں سے میرے تعلقات ہوگئے تھے، ان کے گھر پر میرا آنا جانا ہوگیا۔

میری زندگی کا سب سے دردناک پہلو یہ ہے کہ میں نے قرآنِ حکیم عربی سیکھنے کے لیے ایک کتاب سمجھ کر پڑھا۔ یہ تو قرآنِ کریم کا احسان ہے کہ اس سے مجھے اللہ تعالیٰ اور اپنے مالک کی پہچان تو ہوگئی اور ظاہری طور پر مجھے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے کی بھی توفیق ہوگئی، مگر قرآنِ پاک کی باتوں پر جو یقین ہونا چاہئے تھا اور مرنے کے بعد دوزخ کی آگ اور گناہوں کی سزا پر جو ڈر ہونا چاہئے تھا، وہ بالکل نہیں ہوا۔ میں کلمہ پڑھتی ہوں اور اس خیال سے پڑھتی ہوں کہ شاید پڑھتے پڑھتے اندر اتر جائے، مگر مجھے صاف محسوس ہوتا ہے

کہ لاالہ الا اللہ میرے گلے سے نیچے نہیں اترتا، جیسے صرف زبان سے ہی مسلمان ہوں، دل سے مسلمان نہ ہوں۔ مجھے دیوتاؤ ں اور بتوں کی پوجا تو بڑی حیرت کی بات لگتی ہے، مگر لاالہ الا اللہ کہہ کر جس طرح ہر چیز کی نفی کی کیفیت اندر اترنی چاہئے، اس کا کوئی ادنیٰ حصہ بھی میں اپنے اندر نہیں پاتی۔ نہ دوزخ کا خوف، نہ مرنے کے بعد حساب وکتاب کا ڈر، جیسا اس کا حق ہے، میں اپنے اندر نہیں پاتی، مثال کے طور پر میں مسلمان ہوں تو نماز میرے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر فرض کی ہے اور نماز نہ پڑھنے یا کم از کم قضا کرنے پر مرنے کے بعد کی سزا کی خبر پر مجھے ظاہری طور پر یقین ہے تو مجھے ہر حال میں نماز کو اپنے وقت پر پڑھنا چاہئے، مگر میرا حال یہ ہے کہ میں دیکھتی رہتی ہوں کہ موقع ملے۔ ماں باپ، بہن بھائی سے چھپ کر نماز پڑھنے کا موقع مل جائے تو پڑھتی ہوں، اگر موقع نہ ملے تو کبھی کبھی قضا بھی ہوجاتی ہے۔ گویا گھر والوں کا خوف اللہ تعالیٰ کے خوف اور دوزخ کی آگ سے زیادہ ہے۔ یہ بھی کوئی ایمان ہے۔ میں نماز پڑھتی ہوں۔ آدمی نماز پڑھتا ہے، سجدے میں جاتا ہے، مجھے سجدے میں جانا بہت اچھا لگتا ہے اور شاید میں اپنے آپ کو سب سے زیادہ سکون اور لذت سجدے میں محسوس کرتی ہوں، بلکہ میں سجدے کی حالت میں اپنے کو سب سے زیادہ اچھی بھی لگتی ہوں۔ میری خواہش ہوتی ہے کہ جس طرح سجدے کی حالت میں ہر انسان اس دنیا میں آیا ہے، اسی حالت میں میری موت آئے، مگر جس طرح انسان کو اپنی تمام تر کمزوریوں کے اعتراف کے ساتھ اپنے پورے وجود کو اپنے

عظمت والے رب کے حضور بچھا دینا چاہئے، اس طرح کا سجدہ مجھے آج تک ایک بار بھی نصیب نہیں ہوا۔ میں کبھی ساری ساری رات بے چین رہتی ہوں کہ اس حالت میں اگر موت آ گئی تو یہ تو منافق کی موت ہوگی۔ یقولون بافواھھم مالیس فی قلوبھم القرآن، آل عمران: ۱۶۷) "وہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں) نہیں ہے۔" شاید یہ آیت میرے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

میرے گھریلو حالات ایسے نہیں کہ میری شادی کسی مسلمان سے ہو، اس لیے میں نے گھر والوں سے ابتدا ہی میں شادی کے لیے معذرت کر لی تھی، مگر اب مجھے حقیقی ایمان حاصل کرنے کے لیے اس طرف توجہ ہو گئی ہے۔ میں سوچتی ہوں کسی سچے مسلمان سے شادی کرلوں کہ اس کے ساتھ رہ کر مجھے حقیقی ایمان نصیب ہو جائے۔ مرکز نظام الدین کے ایک عالم صاحب سے میں نے کہا تھا۔ انہوں نے مجھے ایک صاحب سے ملوایا۔

انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں آپ سے شادی کرنے کو تیار ہوں اور آپ پر کسی طرح کی ظاہری پابندی بھی نہ ہوگی۔ اگر آپ گھر والوں کو دکھانے کے لیے مندر جانا چاہیں گی، بلکہ آپ کہیں گی تو میں آپ کو مندر چھوڑ کر آیا کروں گا، مجھے بہت مایوسی ہوئی کہ یہ شخص جب خود آدھا ہندو بننے کو تیار ہے، تو مجھے ایمان کہاں سے آجائے گا، میں نے معذرت کر لی۔ میں صرف ایسے آدمی سے شادی کرنے کو سوچ سکتی ہوں جو مجھے اسلام کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر زبردستی عمل کرائے۔

میں نوکری چھوڑ دوں گی۔ میں عورتوں کے لیے نوکری، روزگار کرنا بلکہ گھر سے باہر رہنا بوجھ سمجھتی ہوں۔ عورت بچے بھی پالے، گھر کا کام بھی کرے اور نوکری بھی کرے....؟ اللہ نے اس کا جسم کمزور بنایا ہے۔ اس کے لیے ملازمت بالکل غیر فطری ہے۔ میں پردے کو عورت کی بنیادی ضرورت سمجھتی ہوں۔ میں دفتر میں رہ کر تو غیر مسلم عورتوں کے لیے بھی پردے کو بڑی نعمت سمجھتی ہوں۔ عورت اگر بے پردہ رہے گی تو اس کو مردوں کی ہوس بھری نگاہوں کو سہنا پڑے گا۔ یہ عورت کے لیے بڑی ذلت اور شرمندگی کی بات ہے۔ ایک گائے گاڑی میں جتنا پسند نہیں کرتی، نہ جانے عورتوں کو کیا ہوگیا ہے جانوروں سے بھی گئی گزری ہوگئیں۔

یوں تو اللہ کا کرم ہے جب سے میں مسلمان ہوئی ہوں، بلکہ میں نے ظاہری طور پر کلمہ پڑھا ہے، اس روز سے قرآن شریف پڑھنے کے سلسلے میں ناغہ نہیں ہوا۔ اللہ کا شکر ہے عم کا پارہ مکمل، سورہ ملک، سورہ مزمل، سورہ رحمٰن، سورہ یٰسٓ اور سورہ الم سجدہ مجھے حفظ یاد ہیں۔ سوتے وقت سورہ ملک اور الم سجدہ اور صبح سویرے سورہ یٰسٓ شریف تو روزانہ پڑھتی ہوں۔ آدھی سورہ کہف بھی مجھے یاد ہو گئی ہے۔ انشاء اللہ جلدی پوری یاد ہو جائے گی۔ جمعہ کے روز سورہ کہف اور صلوٰۃ التسبیح بھی پڑھتی ہوں۔ کبھی کبھی میں جمعرات کے روزے بھی رکھتی

ہوں، مگر بغیر ایمان کے اعمال کس کام کے؟ میں قرآنِ حکیم میں اعرابیوں (عرب دیہاتیوں) کا حال پڑھتی ہوں۔ قالت الاعراب آمنا قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم وان تطیعوا اللہ ورسولہ لا یلتکم من اعمالکم شیئا۔" (القرآن، الحجرات ۴۹:۱۴)

دیہاتی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ (اے نبی!) تم کہہ دو تم لوگ ایمان نہیں" لائے ہو، بلکہ کہو کہ ہم (ظاہری طور سے) اسلام لائے، اس لیے کہ ایمان تمہارے دلوں میں اب تک داخل نہیں ہوا اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو تو وہ (تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کرے گا۔" (ترجمہ آیت مذکورہ

سچی بات یہ ہے کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ آیت صرف میرے بارے میں نازل ہوئی ہے، ورنہ ایمان کے ساتھ مکمل اطاعت ضروری ہے۔

میرا خیال ہے کہ مسلمان بہنیں اسلام کی نعمت کی قدر نہیں پہچانتیں۔ وہ بھی اس ننگی تہذیب کے زہر میں اپنا ذائقہ کھو بیٹھی ہیں۔ بعض مسلم محلوں میں جا کر پہچاننا مشکل ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں کا محلّہ ہے۔ بے پردگی، بلکہ بے حیائی اور حد درجہ عریانیت فیشن کی صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ اسلام سے پہلے کی عورتوں کے حالات اور تاریخ ضرور پڑھنی چاہیے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس سے اسلام کا عورتوں پر احسانات کا احساس ہوگا اور دینِ فطرت کی کچھ قدر

معلوم ہو گی۔ (ماخوذ از ماہ نامہ "ارمغان شاہ ولی اللہ" پھلت، اپریل ۲۰۰۴ئ)

حسن طلب

مختصر مختصر، نئے شہروں کی ایک اثر انگیز تحریر
باپ اور بیٹے کی ایک کہانی

بسا اوقات ہم اپنی ملازمت یا کاروبار میں شدید محنت کرتے ہیں اور گھر دیر سے پہنچتے ہیں تو ہوتا یہ ہے کہ گھر کے تمام افراد گہری نیند سو چکے ہوتے ہیں۔ ہم دبے پاؤں بچوں کے کمرے میں جھانکتے ہیں تو ان معصوموں کو بے فکری سے سوتے دیکھ کر دل میں خیال آتا ہے کہ ہم محنت مشقت اسی لیے کرتے ہیں کہ یہ بہتر سے بہتر زندگی بسر کر سکیں۔ جو لوگ اس بہانے سے خود کو تسلی دے لیتے ہیں، یہ داستان ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے شاید موثر ہو!

ایک شخص رات گئے تھکا ماندہ جھلایا ہوا گھر پہنچا تو اس نے اپنے سات سالہ بیٹے کو دروازے پر کھڑا ہوا پایا۔

"بابا.... !" بیٹے نے کہا۔ "میں آپ سے کچھ پوچھ سکتا ہوں؟"

"ہاں، ہاں، کیوں نہیں! پوچھو، کیا پوچھنا چاہتے ہو؟"

"بابا! آپ ایک گھنٹے میں کتنا کما لیتے ہیں؟" بیٹے نے پوچھا۔

"کیوں کیا بات ہے؟" باپ نے کہا۔ "تم کیا کہنا چاہتے ہو؟"

ایسے ہی، میں بس جاننا چاہتا ہوں۔" بیٹے نے کہا۔ "پلیز مجھے بتائیں کہ آپ ایک گھنٹے "

"میں کتنا کما لیتے ہیں؟

میں ایک گھنٹے میں سو روپے تک کما لیتا ہوں۔" باپ نے سادگی سے بتایا۔"

:اوہ۔ ۔ ۔ ۔" بچے نے یہ سن کر سر جھکا لیا، پھر نظریں اٹھا کر بولا"

"پلیز ڈیڈی! کیا آپ مجھے پچاس روپے ادھار دے سکتے ہیں؟"

باپ یہ سن کر آگ بگولا ہو گیا۔ "اگر پوچھنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم کچھ رقم ادھار مانگ کر کوئی فضول سا کھلونا خرید لو، یا کوئی دوسرا احمقانہ کام کرو تو سیدھے اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ جاؤ۔ کیا میں دن رات محنت مشقت اس لیے کرتا ہوں کہ

"تمہاری نامعقول خواہشات پوری کرتا رہوں؟

بچہ چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔

وہ شخص بیٹھ گیا اور بچے کے سوال پر غور کرنے لگا۔ اس کا غصہ فزوں ہو گیا۔ یہ کس قسم کا بچہ ہے کہ چند روپے کے لیے اس نے اِس قسم کا سوال کیا؟

کچھ دیر بعد جب وہ پرسکون ہو گیا تو اسے پھر اپنے بیٹے کا خیال آیا۔ ہو سکتا ہے کہ بچے کو واقعی کسی خاص چیز کی ضرورت ہو۔ وہ تو شاذونادر ہی پیسے مانگتا، یا کوئی فرمائش کرتا ہے۔

وہ اٹھ کر بیٹے کے کمرے کی جانب چل دیا اور دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔ "تم سو رہے ہو بیٹے؟" اس نے قدرے ہچکچاتے ہوئے آواز دی۔

میں جاگ رہا ہوں۔" بچے نے جواب دیا۔"

میں نے سوچا ہے بیٹے، شاید اس وقت میرا رویہ قدرے تلخ ہو گیا تھا۔" اس شخص نے" کہا۔ "دن بھر کی محنت نے مجھے تھکا دیا تھا اور میں نے جھنجھلاہٹ تم پر اتار دی۔ یہ لو "پچاس روپے۔

باپ کو اس وقت خاصی تشفی ہوئی جب اس نے بیٹے کے چہرے پر خوشی کے رنگ ابھرتے دیکھے۔

وہ چھوٹا بچہ اپنے بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا اور مسکراتے ہوئے بولا، "اوہ شکریہ بابا!" اس کی آواز قدرے بلند تھی۔ پھر اس نے اپنے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ جب ہاتھ باہر نکلا تو اس میں چند مڑے تڑے نوٹ دبے ہوئے تھے۔

یہ دیکھ کر کہ بیٹے کے پاس رقم پہلے سے موجود ہے، باپ کا غصہ عود کر آیا۔

بچہ آہستہ آہستہ رقم گننے لگا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور مسکراتے ہوئے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

بابا!" وہ بولا۔"

ایک منٹ۔" باپ نے کہا، "جب تمہارے پاس پیسے پہلے سے موجود تھے تو پھر تمہیں" "مزید رقم کس لیے چاہیے تھی؟

اس لیے کہ وہ ناکافی تھی، لیکن اب پوری ہو گئی۔" بچے نے جواب دیا۔"

اب میرے پاس پورے سو روپے ہیں۔ کیا میں آپ کے وقت کا ایک گھنٹہ خرید سکتا" ہوں؟ پلیز کل ذرا جلدی گھر آ جائیے گا۔ میں رات کا کھانا آپ کے ساتھ کھانا

چاہتا ہوں۔" (انگریزی سے انتخاب)

جعلی دواؤں کا دھندہ

شاید بعض چیزیں کبھی پرانی نہیں ہوتیں، بس اپنا روپ بدل کر دوبارہ سامنے آجاتی ہیں اور بالکل نئی معلوم ہوتی ہیں۔ یہ بات جعل سازی کے حوالے سے بھی بالکل درست ہے۔ پاکستان میں جعل سازی کا ایشو کچھ نیا نہیں بلکہ بہت پرانا ہے۔ بس اب اور چیزوں کی طرح جعل سازی میں بھی جدت آ گئی ہے۔ طریقہ واردات اب اتنے جدید ہو گئے ہیں کہ عام آدمی تو رہے ایک طرف ادارے بھی عام طریقوں سے انہیں پکڑ نہیں سکتے۔ جدت کے ساتھ ساتھ جعل سازی میں وسعت بھی آ گئی ہے۔ پہلے سنتے تھے کہ سونے میں ادنی دھاتوں کی ملاوٹ، دودھ میں پانی کی ملاوٹ اور مصالحوں میں اینٹ روڑے کی ملاوٹ ہوتی ہے، اور اب سنتے ہیں کہ گھی، گوشت، دال سے لے کر ملتان کے سوہن حلوے تک اور ڈگری، وزارت ادویات سے لے کر زہر تک ہر چیز میں ملاوٹ ہے یا جعلی ہے۔

کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے کہ اخبار میں خودکشی کی کوشش کا ایک واقعہ شائع ہوا تھا جو واقعے کی سنگینی سے ہٹ کر عوام میں ایک لطیفہ بن کر رہ گیا تھا.... شاید اکثر لوگوں کو یاد ہو۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ ایک نوجوان لڑکی نے گھر والوں سے جھگڑے کے بعد گھر میں رکھی کیڑے مار دوا پی لی تھی ،جب اس لڑکی

کی حالت غیر ہونے لگی تو گھر والے اسپتال لے کر بھاگے۔ایمرجنسی میں اس کو فوری طبّی امداد دی گئی تو غیر متوقع طور پر وہ لڑکی ہوش میں آ گئی۔بعد میں جب اس دوا کی جانچ کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس میں اصل دوا کی مقدار صرف دس پندرہ فیصد تھی باقی جعلی آمیزہ تھا۔قدرت کو لڑکی کی زندگی منظور تھی، سو بچ گئی۔یوں یہ لطیفہ عام ہوا کہ !آج کل تو خودکشی کرنے کے لیے زہر بھی اصلی نہیں ملتا

یہ تو جعلی زہر کی بات تھی لیکن اگر اس کے برعکس معاملہ زندگی بچانے والی ادویات کا ہو تو اس کی سنگینی کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔کیوں کہ آدمی بھوکا رہ لیتا ہے، سر چھپانے کو کچھ نہ ہو تو چند چیتھڑے کسی میدان میں تان کر گزارا کر لیتا ہے لیکن جب اس کے پیارے، اس کے بچے بیمار ہوں تو ان کی دوا کے لیے اپنا خون پسینا بہا کر اور نہ جانے کیا کیا جتن کرکے چند پیسے اکٹھے کرتا ہے اور پھر اس خون پسینے کی کمائی سے جو دوائی ہاتھ میں آتی ہے وہ نہ صرف کوئی فائدہ نہیں دیتی بلکہ مضر صحت ملاوٹی اجزا کی وجہ سے اکثر ....جان کے درپے ہو جاتی ہے

اس وقت سب سے زیادہ لوٹ مار دواؤں کے کاروبار میں ہے۔ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں 90فی صد ادویات دنیا بھر کے مقابلے میں اور خصوصاً علاقے کے

دوسرے ممالک کی بانسبت پندرہ سے پچیس فی صد مہنگے داموں فروخت ہو رہی ہیں۔اور یہ بھی اس صورت میں ہے جب دوا سو فیصد اصلی ہو، ورنہ جعلی ادویات میں تو نفع کا کوئی حساب ہی نہیں۔اور نہایت ہولناک خبر یہ ہے کہ پاکستان بھر میں تیس فیصد سے چالیس فیصد ادویہ جعلی فروخت ہو رہی ہیں۔مجرم اگر پکڑے بھی جاتے ہیں تو قانونی اور انتظامی کمزوریوں کے سبب سزا سے بچ جاتے ہیں۔پاکستان میں غیر معیاری اور جعلی ادویات کی پروڈکشن اور فروخت کی خبریں کئی سالوں سے وقتاً فوقتاً سننے میں آتی رہتی ہیں، لیکن چند دنوں کی ہا ہو کے بعد سب تازہ اور بریکنگ خبروں کے ہجوم میں دب کر رہ جاتی ہیں۔

ستمبر 2008ء کو اخبارات میں ایک خبر نمایاں شائع ہوئی تھی کہ ایف آئی اے 21 نے کھارادر کراچی کے علاقے ڈینسو ہال میں چھاپہ مار کر ڈھائی کروڑ روپے مالیت کی جعلی دوائیں برآمد کر لی ہیں۔

اسی طرح پچھلے سال فروری 2011ء میں بھی ملک کے تمام بڑے اخبارات میں ایک خبر بڑے طمطراق کے ساتھ اشتہار کی صورت چھپی تھی ،جس کی رو سے پاکستان میں پہلی بار ایک ملٹی نیشنل فارما کمپنی نے سینٹرل ڈرگ ٹیسٹنگ لیبارٹری میں غیر معیاری قرار دی جانے والی ٹیبلٹ ڈسپرول (پیراسیٹا مول) کو واپس لینے کی ہدایت جاری کی تھی۔انہوں نے ڈاکٹروں ،کیمسٹ اور فارماسسٹ سے کہا تھا کہ

مذکورہ دوا کی فروخت فوری بند کرکے کمپنی کو واپس کردیں۔ کراچی میں اس ٹیبلٹ کی مقدار 4 کروڑ 90 لاکھ بتائی گئی تھی جو اسپتالوں اور میڈیکل اسٹوروں پر عام دستیاب تھی۔

آپ نے مندرجہ بالا خبر ملاحظہ کی.... کتنے لوگوں نے اس خبر کو سرسری پڑھا ہوگا اور کتنے لوگوں نے اس کی سنگینی کو محسوس کیا ہوگا!

جب تک کمپنی کی طرف سے دوا کو واپس لیا گیا ہوگا۔ نہ جانے اس بیچ کی کتنی ٹیبلٹس فروخت ہوچکی ہوں گی اور معصوم لوگوں نے اسے بخار اور درد کے علاج کے طور پر استعمال کیا ہوگا۔ ان کا بخار اور درد تو دور ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن دوا کے غیر معیاری ہونے کی وجہ سے کتنے ذیلی اثرات ان کو بھگتنا پڑیں گے اس کی ذمہ داری حکومت سمیت کسی بھی ادارے نے نہ کبھی سمجھی اور نہ دور دور تک اس کے امکانات ہیں!

ہم یہ بات پورے وثوق سے اس لیے کہہ سکتے ہیں.... کہ آج ایک سال بعد بھی صورت حال پہلے سے زیادہ سنگین اور ہولناک ہوچکی ہے۔ لاہور کا حالیہ واقعہ دیکھ لیں کہ ایک آدمی ایک سرکاری ادارے سے سرکاری دوا اس امید پر حاصل کرتا ہے کہ مفت میں اس کے دل کا علاج ہوگا لیکن وہ دوا اس کے دل کو ہمیشہ کے

لیے خاموش کرنے کا سبب بن جائے تو بتایئے اس سے زیادہ ہولناک مذاق کیا ہو گا؟

پورے واقعے کا سیاق و سباق اور انکوائری رپورٹوں کا اب تک حاصل یہی ہے کہ اس المیے کے پیچھے صرف غیر ذمہ داری اور لاپروائی کارفرما ہے، جس کی وجہ سے ایک سو اڑتیس قیمتی جانیں ضائع ہوئیں اور ہزاروں مریض ابھی بھی خطرے میں ہیں، کیوں کہ وزیراعلیٰ پنجاب کی انسپکشن کمیشن کی تازہ ترین انکوائری رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ یکم دسمبر 2011ء سے جنوری 2012ء تک پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی سے چھیالیس ہزار مریضوں نے یہ غیر معیاری ادویات حاصل کی تھیں، جن میں سے اسکینڈل سامنے آنے پر صرف ساڑھے سات ہزار ان مریضوں کو جن کا رابطہ نمبر موجود تھا انفارم کیا جا سکا کہ وہ مذکورہ ادویات کا استعمال فوراً روک دیں، باقی اڑتیس ہزار مریضوں کا ریکارڈ مینٹین نہیں تھا یوں انہیں انفارم نہیں کیا جا سکا۔ یوں ان اڑتیس ہزار مریضوں میں زندگی کا شدید خطرہ موجود ہے جن میں تقریباً دو لاکھ غیر معیاری گولیاں بانٹی گئی تھیں۔ کیوں کہ اگر وہ قسمت سے ٹی وی یا اخبارات دیکھتے ہوں اور اس طرح ان گولیوں کا استعمال ترک کر بھی دیں تو کیا وہ ان گولیوں کے ذیلی اثرات سے محفوظ رہ پائیں گے جو اس وقت تک انہوں نے استعمال کر لی ہوں گی۔ یہی وجہ ہے کہ خیال کیا جا رہا ہے کہ رپورٹ شدہ 465 مریض (جن پر اس دوا 'آئسوٹیب' کا ری

ایکشن سامنے آچکا ہے) سے متاثرہ افراد کی تعداد کئی گنا زیادہ ہے۔

اس رپورٹ میں یہ بھی انکشاف کیا گیا ہے کہ بیس دنوں تک پنجاب کے ڈاکٹران غیر معیاری ادویات کے رد عمل سے مرنے والے مریضوں کو ڈینگی کا مریض سمجھ کر ان کا علاج کرتے رہے اور حیران ہوتے رہے کہ ڈینگی کا مچھر نہ ہونے کے باوجود اب تک کیوں ڈینگی کے مریض سامنے آ رہے ہیں۔پانچ یا چھ جنوری کو پہلی بار مریضوں میں یہ قدرِ مشترک نوٹ کی گئی کہ وہ سب دل کے مریض ہیں اور دل کے علاج کے لیے وہ مفت دوائیں استعمال کر رہے ہیں جو انہوں نے ' پی آئی سی ' سے حاصل کی تھیں۔یوں پہلی بار اس شک کا اظہار کیا گیا کہ دل کے مریضوں کو دی جانے والی ایک دوا 'آئسو ٹیب' مریضوں میں 'بون میرو سپرشن' میں رد عمل کا سبب بن رہی ہے۔یہ بھی انتہائی افسوس ناک بات ہے کہ آج تشخیص کے انتہائی جدید طریقوں کے موجود ہونے کے باوجود ڈاکٹر حضرات ڈینگی فوبیا میں ہی کیوں گرفتار رہے۔اگر خون کے ایک ٹیسٹ کو اختیار کر لیا جاتا تو کم از کم اتنا ضرور معلوم ہو جاتا کہ یہ ڈینگی نہیں ہے بلکہ کچھ اور ہے!! یوں کئی قیمتی جانیں بچائی جا سکتی تھیں۔

قیمتی جانوں کے ضائع ہونے کے علاوہ اس افسوس ناک واقعہ کے اور بھی کئی نقصانات سامنے آئے ہیں۔فارما انڈسٹری ذرائع کا کہنا ہے کہ پاکستان سے

گزشتہ پانچ سالوں کے دوران ادویات کی ایکسپورٹ میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا، اور فارما انڈسٹری کی ایکسپورٹ میں 35 فیصد سالانہ گروتھ ہو رہی تھی، لیکن خبر ہے کہ اس واقعہ کی بین الاقوامی میڈیا پر آنے کے بعد بیشتر ممالک نے مثلاً سوڈان، سیرالیون، سری لنکا اور افغانستان نے پاکستان سے ادویات کی درآمد پر پابندی لگادی ہے۔یوں اس واقعہ کے نتائج بحثیت ایک ریاست کے پورے ملک کو بھگتنا پڑ رہے ہیں۔ بہرحال چند افراد کی غیر ذمہ داری سے ایک بڑا نقصان ہو گیا لیکن اب آئندہ ایسے کسی واقعہ سے بچنے کے لیے شفاف تحقیقات ہونا چاہئیں تاکہ اس المیے کے ذمہ داروں کا تعین ہو جائے۔سب سے بڑی ذمہ داری تو بہرحال حکومت پنجاب کی ہے کیوں کہ وہ ہر معاملے کی نگراں ہے، خصوصاً اس صورت میں کہ فی الحال پنجاب میں کوئی وزیر صحت ہی نہیں ہے اور وزیر اعلیٰ پنجاب خود ہی اس وزارت کا قلمدان سنبھالے بیٹھے ہیں، اس لیے اس واقعے کے براہ راست جوابدہ تو وہی ہیں۔ ان کے ساتھ 'پی آئی سی' کے عہدیدار اور ادویہ ساز ادارے کے مالکان بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ عدالت میں ایف آئی اے کے وکیل نے کہا ہے کہ ایک ادویہ ساز ادارے کا مالک کے دوا بنانے کے لائسنس کی معیاد ختم ہو چکی تھی لیکن وہ پھر بھی ادویات بنا رہا تھا۔ اسی طرح دوسرے ملزم سے دو لاکھ چالیس ہزار ایسی گولیاں برآمد ہوئی ہیں جن کے بارے میں شک ہے کہ وہ بھی مضر صحت ہیں۔

ہماری ان سطور کے ذریعے ارباب اختیار سے گزارش ہے کہ انتہائی غیر جانبداری سے اس المیہ کے ذمہ داروں کا تعین کریں اور ان پر قتل کا مقدمہ چلا کر عبرت ناک سزا دیں تاکہ عوام کی صحت کے ساتھ کھلواڑ کرنے والوں کو عبرت حاصل ہو۔

بوڑھے نوجوان

چھٹی کا دن تھا۔ بیگم نے کچھ ضروری چیزوں کی فہرست تھمائی تو مارکیٹ کا پروگرام بن گیا۔ دونوں بچے بھی چلنے پر بضد ہو گئے تو انہیں بھی ساتھ لیا اور مارکیٹ کو سدھارے۔ اتوار کی وجہ سے لوگوں کا ہجوم تھا۔ ابھی اپنے مطلوبہ اسٹال پر پہنچے ہی تھے کہ اچانک چہروں کے اژدھام میں ایک ادھیڑ عمر شناسا سے چہرے پر نگاہ ٹھہر گئی۔

"ان سے کہیں ملاقات ہوئی ہے!!" زیر لب کہا، لیکن کہاں؟حسب عادت بالکل یاد نہیں آ رہا تھا۔ اتنے میں اُن موصوف کی نگاہ بھی مجھ پر پڑ گئی اور وہ تیزی سے میری طرف بڑھے۔

"اللہ خیر کرے...." میرے منہ سے نکلا، اتنے میں وہ صاحب زور سے میرا نام پکار کر پرتپاک انداز میں گلے لگ گئے۔ ان کی گرفت سے بے تکلفی مترشح تھی۔

"ارے تو نے مجھے نہیں پہچانا!؟" میری طرف سے متوقع گرم جوشی نہ پا کر شاید وہ معاملہ سمجھ گیا تھا۔

اس کی بات سن کر میرے چہرے پر موجود تذبذب کے آثار خجالت میں بدل گئے۔

میں شاہد ہوں، ٹنڈوآدم میں تیرا کلاس فیلو...." اس نے کہا تو یکایک ایک اسمارٹ سا" " !! لڑکا ہمارے ذہن کے نہاں خانوں سے نکل کر سامنے آ گیا۔ "اوہ.... شاہد جمیل بڑے افسوس کی بات ہے، تم تو بالکل ہی بدل گئے ہو، چہرے پر داڑھی سجا لی ہے، پھر" بھی میں نے پہچان لیا،اور تم نے مجھے نہیں پہچانا۔" اس نے شکوہ کیا تو میں جواب میں نہیں کہہ سکا کہ وہ بھی بالکل بدل گیا ہے۔ کہاں دس بارہ سال پہلے کا وہ دبلا پتلا معصوم صورت نوجوان اور کہاں میرے سامنے کھڑا فربہی مائل یہ شخص جس کے چہرے سے پژمردگی جھلک رہی تھی۔

میں نے اس کی یادداشت کو سراہا اور اس کے چہرے پر ماضی کے وہ نقوش کھوجتے ہوئے،جو میری یادداشت میں رقم تھے، معذرت کی تو اس نے خوشدلی سے معذرت کو قبول کیا اور ہم وہیں کھڑے کھڑے ایک دوسرے کے متعلق اَپ ٹوڈیٹ ہونے لگے۔ وہ کسی پرائیوٹ ٹریڈ کمپنی میں اچھے عہدے پر ملازم تھا۔ باتیں جاری تھیں کہ میں نے اس کی فیملی اور رہائش کے بارے میں پوچھ لیا۔ وہ تھوڑی دیر رکا پھر اس نے دھیرے سے کہا کہ ابھی اس کی شادی نہیں ہوئی ہے اور وہ گلشن اقبال میں اپنی خالہ کے گھر رہتا ہے اور مہینے میں ایک چکر ٹنڈوآدم کا لگا لیتا ہے! میں حیران رہ گیا۔ وہ مجھ سے عمر میں بڑا تھا، شاید تین چار سال بڑا.....

یعنی اس وقت وہ چھتیس سینتیس سال کا ہو چکا تھا اور ابھی تک شادی نہیں کی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں حیرانی ظاہر کرتا، اس نے یہی سوال مجھ سے کر دیا۔ میں نے جواب دینے کی بجائے قریب کھیلتے بچوں کی طرف اشارہ کر دیا۔

ارے.... " اس کے منہ سے بس اتنا ہی نکلا۔ وہ چند لمحے تو ساکت کھڑا بچوں کو دیکھتا" رہا۔ پھر اس نے اچانک بڑھ کر چھوٹی بیٹی کو گود میں اٹھا لیا، لیکن مجھے اس کا انداز فطری نہیں لگا۔ اس کی آنکھوں میں جو چند لمحے پہلے خوشی کے دیے جل رہے تھے، یکایک بجھ سے گئے تھے۔ اب اس کی نظروں سے کچھ ایسی یاسیت اور شرمندگی ہویدا تھی کہ میں خود شرمندہ سا ہو گیا۔

اس کے بعد وہ زیادہ دیر رکا نہیں، ہم نے اپنے موبائل نمبرز کا تبادلہ کیا اور پھر ملنے کا وعدہ کرکے جدا ہو گئے۔ دو دن بعد ہی اس کا فون آ گیا۔ میں نے اِدھر اُدھر کی بات کرتے ہوئے اس سے پوچھ ہی لیا کہ اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی۔ دوسری طرف سے اس نے سرد آہ بھری اور پھر بتانے لگا کہ مجھ سے چھوٹی دو بہنوں کی شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے، اس لیے اس کا شادی کے بارے میں سوچنا بھی محال ہے۔ مزید کرید کرنے پر پتہ لگا کہ وہ چار بھائی اور تین بہنیں ہیں۔ سب سے بڑا بھائی اور اس کے بعد ایک بہن شادی شدہ ہیں، وہ تیسرے نمبر پر تھا، اس سے چھوٹے دو بھائی، پھر دو بہنیں جن کی عمریں بالترتیب تیس

اور ستائیس سال ہیں' غیر شادی شدہ ہیں، جن کی شادی سے پہلے والدین اس کی شادی کا ذکر کرنا بھی گناہ سمجھتے ہیں۔اس نے مزید بتایا کہ چھوٹے بھائیوں میں سے ایک بھائی نے تو تیس سال کے ہونے پر لڑ جھگڑ کر شادی کر لی ہے، جس کی وجہ سے والدین اب اس کی شکل دیکھنے کے بھی روادار نہیں ہیں مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہے!

میں نے پوچھا کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ جب تمہارا نمبر تھا تو والدین کو تمہاری شادی کرنی چاہیے تھی۔ یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی کہ اتنی چھوٹی لڑکیوں کی وجہ سے۔بڑے لڑکوں کی عمریں نکال دی جائیں! تو اس نے جو جواب دیا، وہی اس کالم کو لکھنے کا باعث بنا۔ اس نے کہا کہ ہمارے خاندان میں ایک میں ہی نہیں بلکہ ہر دوسرے گھر میں لڑکے چھوٹی بہنوں کی شادی نہ ہونے کی وجہ سے بوڑھے ہو رہے ہیں، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ والدین کو یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کی شادی کر دیں گے تو پھر وہ انہیں سپورٹ نہیں کریں گے اور چھوٹی بہنوں کی شادیوں پر توجہ نہیں دیں گے۔اس لیے اس اندیشہ سے محفوظ رہنے کی آسان تدبیر یہ سمجھی جاتی ہے کہ جب تک گھر کی بچیوں کی شادی نہ ہو جائے چاہے وہ اپنے بھائیوں سے پانچ پانچ سال چھوٹی بھی ہوں تو تب تک لڑکوں کی شادی نہ کی جائے!!

شاہد کی آواز میں بے حد درد تھا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ اب تک شادی نہ ہونے سے

دیگر مسائل تو اپنی جگہ لیکن سب سے زیادہ دکھ اس بات پر ہوتا ہے کہ والدین کو ہم پر اعتماد نہیں....

میں نے اسے جواب دیا کہ تم نے غلط کہا، اصل دکھ تو اس بات پر ہونا چاہیے کہ آج کل کے والدین کو اللہ تعالٰی پر اعتماد نہیں رہا.... اور شاید یہ اس ہی کی مکافات ہے کہ جن لڑکیوں کی وجہ سے ان کے بڑے بھائیوں کو لٹکایا جاتا ہے، ان کی بھی شادی کی عمریں نکلی جارہی ہیں اور وہ گھر بیٹھی بوڑھی ہو رہی ہیں۔شاہد نے میری بات کی پرزور حمایت کی اور کہا کہ بالکل یہی بات ہے، جب ہر ماں باپ کی سوچ یہی ہو گی کہ اپنے لڑکوں کی شادی نہ کی جائے بلکہ پہلے لڑکیاں نمٹ جائیں تو پھر ان کی لڑکیوں سے شادی کے لیے لڑکے کہاں سے آئیں گے اورظاہری بات ہے کہ اس 'نمٹانے' کے لیے آسمان سے تو کوئی مخلوق اترے گی نہیں....!

شاہد کی بات سن کر مجھے بے حد قلق ہوا تھا، لیکن میں نے اسے ایک استثنیٰ سمجھا، یا زیادہ سے زیادہ اردو بولنے والے گھرانوں کا مسئلہ سمجھا لیکن جب اس نقطہ نظر سے میں نے اپنے اطراف اور جاننے والوں پر نگاہ کی تو انکشاف ہوا کہ اکثر گھرانوں میں ایسا ہی ہے، اوراردو داں حضرات کے علاوہ، پنجابی اور ہزارہ کمیونٹی میں بھی کچھ کچھ یہی سوچ پروان چڑھ رہی ہے۔

دوسری طرف آج اس حساس سماجی مسئلے پر کچھ پڑھنے سننے کو ملتا ہے تو وہ یک طرفہ ہوتا ہے، یعنی رشتہ نہ ہونے کو صرف لڑکیوں کا مسئلہ سمجھا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ لڑکے بھی کنوارے بوڑھے ہو رہے ہیں! ان کی جوانیاں بھی برباد ہو رہی ہیں۔ تیس بلکہ پینتیس کی حدوں کو پار کرنے والے 'نوجوان' گناہوں کی دلدل میں پھنس رہے ہیں.... وہ خوش قسمت جنہیں اچھی صحبت میسر ہے، اللہ کا خوف دامن گیر ہے، وہ بے چارے گناہوں سے بچتے ہیں تو فطری تقاضوں کو دبانے کے نتیجے میں نفسیاتی بیمار ہو جاتے ہیں۔

آج لڑکیوں کے رشتے نہ ہونے کی جو وجوہات ذکر کی جاتی ہیں، ان میں آئیڈیل رشتوں کا انتظار، برادری اور ذات کی شرائط، جہیز، بَری اور دوسرے رسم ورواج کے لیے لاکھوں روپے کا انتظام وغیرہ.... یہ سارے مسائل صرف لڑکی کے رشتہ میں ہی رکاوٹ نہیں ہیں، بلکہ سینکڑوں لڑکے بھی ان وجوہات کی وجہ سے 'لنڈورے' پھر رہے ہیں۔ اس موقع پر ہمیں مانسہرہ کے ایک ہی گاؤں کے درجن بھر سے زائد بوڑھے ہوتے نوجوانوں کا مشترکہ 'درد بھرا خط' یاد آرہا ہے جو غالباً ایک سال پہلے 'خواتین کا اسلام' میں ہی چھپا تھا، جس میں انہوں نے صاف لکھا تھا کہ رسم و رواج کی وجہ سے شادی نہ ہونے کے مسئلے میں صرف لڑکیاں ہی بے بس اور مظلوم نہیں بلکہ ہماری طرح کے سینکڑوں لڑکے بھی مظلوم اور بے اختیار

ہیں۔

اس سے یہ معلوم ہوا کہ مندرجہ بالا وجوہات کی وجہ سے صرف لڑکیاں نہیں بلکہ دونوں فریق کی زندگیاں متاثر ہو رہی ہیں، لیکن پھر سوال اٹھتا ہے کہ اگر دونوں جنس برابر متاثر ہیں تو کیا وجہ ہے کہ لڑکیوں کے تو بے شمار رشتے آپ کو ہر شادی دفتر میں مل جائیں گے لیکن لڑکوں کے رشتے بس گنے چنے ہی ہوتے ہیں، (خود ہمارے ادارے کے ضمیر بھائی جو فی سبیل اللہ رشتے کراتے ہیں، اسی بات کے شاکی ہیں کہ پورے ملک سے ان کے پاس رشتے کے لیے فون آتے ہیں، لیکن صرف لڑکیوں کے.... جب کہ دوسری طرف اگر فون آتے بھی ہیں تو وہ زیادہ تر بابوں کے ہیں، جن کو خدمت کے لیے چالیس سے اوپر کی خواتین کا رشتہ چاہیے ہوتا ہے....) اس کا جواب ہمارے کچھ بھائی یہ دیتے ہیں کہ لڑکیاں لڑکوں کے مقابلے میں چوں کہ زیادہ ہوتی ہیں، اس لیے لڑکیوں کی شادی کا مسئلہ ہوتا ہے، پھر اس کے حل کے لیے وہ مردوں کے لیے 'دوسری' شادی تجویز کر دیتے ہیں !

پہلی بات تو یہ کہ ہماری رائے میں یہ خیال ہی صحیح نہیں کہ لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکے کم ہوتے ہیں، کیوں کہ اللہ تعالیٰ جیسی خبیر و علیم ذات نے ہر شے کو ناپ تول کر بہترین اندازے کے ساتھ اتارا ہے.... آپ اپنے خاندان یا گلی محلے کا سروے کر لیں کہ کس گھر میں کتنے لڑکے اور کتنی لڑکیاں ہیں تو

معلوم یہی ہو گا کہ اگر کسی گھر میں لڑکیاں زیادہ ہوں گی تو کسی گھر میں لڑکے ہی لڑکے ہوں گے، یعنی معاملہ برابر سرابر سے زیادہ نہیں ہے.... پھر آج کے غارت گر دور میں خصوصاً الٹرا ساؤنڈ کی ایجاد کے بعد سے تو اعداد و شمار یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کی رحمت سے خائف لوگ ان کو دنیا میں آنے سے پہلے ہی ختم کر دیتے ہیں.... گو ہمارے ملک میں یہ ظلم بہت کم ہے.... لیکن دنیا بھر میں اس کی وجہ سے لڑکیوں کا کال پڑ گیا ہے۔ مثال کے طور پر دنیا کی سب سے بڑی آبادی والے ملک چین میں یہ تناسب دس لڑکوں کے مقابلے میں سات لڑکیوں تک پہنچ گیا ہے۔

اس سے یہ مطلب مت اخذ کر لیجیے گا کہ میں 'دوسری' شادی کے خلاف ہوں.... نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ دوسری شادی کے جواز کے طور پر یہ بات کہنا کہ چوں کہ لڑکیاں زیادہ ہوتی ہیں اور لڑکے کم.... اس لیے مردوں کو دوسری شادی کر لینی چاہیے تو یہ بات کہنا مناسب نہیں اس لیے کہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ رہی بات دوسری شادی کی تو بندہ بھی امیدوار اور دعاؤں کا خواستگار ہے....

یہ ساری باتیں جملہ معترضہ کے طور پر درمیان میں آ گئیں۔ عرض یہ کر رہا تھا کہ آج ہر ماں باپ کو اپنی بچیوں کی شادی کی تو پریشانی ہے، لیکن اپنے بوڑھے ہوتے بیٹوں کی کسی کو بھی فکر نہیں ہے.... اس لیے اپنا دل بڑا کیجیے اور

اللہ تبارک و تعالی کی ذات پر اعتماد کرتے ہوئے اگر آپ کے گھر لڑکیوں سے بڑے لڑکے ہیں تو لڑکیوں سے پہلے یا کم از کم ان کے ساتھ اِن لڑکوں کے رشتے بھی دیکھیے۔یقین جانیے، آپ کسی کی بچی کو اپنے گھر کی عزت بنا کر اس کا بوجھ ہلکا کریں گے ! تو انشاء اللہ کوئی آپ کی بچی کے سر پر بھی ہاتھ ضرور رکھے گا

غریب عوام اور دواؤں کی قیمت میں اضافہ

وہ مجہول سا بابا اکثر مجھے اپنے دفتر کی گلی میں نظر آتا ہے۔ عمر تو شاید اس کی پچاس پچپن سے زیادہ نہ ہو لیکن اس کے مدقوق چہرے پر مکڑی کے جالے کی طرح پھیلی شکنوں کی بہتات دیکھ کر کسی اسی سال کے بوڑھے کا دھوکا ہوتا ہے۔ ایک جھلنگا سی قمیص اور میلی بدرنگ دھوتی میں مستور سوکھے فاقہ زدہ بدن کو سخت مزدوری کرتے دیکھ کر مجھے بے حد ترس آتا ہے۔ میری نگاہ میں وہ بہت معتزز ہے، شاید اس لیے بھی کہ ہمارے دفتر (ناظم آباد) کے سامنے واقع آبادی میں وہ لوگ آباد ہیں جو کسی بھی قوم کے چہرے پر کلنک کے ٹیکے کی حیثیت رکھتے ہیں.... وہ ہٹے کٹے، ریشمی لباس میں ملبوس مرد جو حرام کے لاکھوں میں کھیلتے ہیں اور نت نئے سوانگ رچانے میں کمال رکھتے ہیں اور جن کی سونے چاندی میں لدی پھندی عورتیں اپنے ننگ دھڑنگ بچوں کو گود میں ہی ہر وہ گر سکھا دیتی ہیں، جس سے پیشہ آباء میں ترقی ہو اور وہ اپنی ہم جولیوں میں سرخ رو ہوں۔ اِن عورتوں کی استادی کا اندازہ تب ہوتا ہے جب سات آٹھ سال کی عمر میں ہی یہ بچے وہ کارنامے انجام دیتے ہیں کہ بندہ دنگ رہ جائے.... بسوں میں صدا لگاتے اِن بچوں کی سریلی آوازوں سے وہ غم ٹپکتا ہے کہ کم از کم دس بارہ مسافروں کے ہاتھ تو بے اختیار جیبوں میں چلے ہی جاتے ہیں.... بہت اچھی آواز اور نستعلیق زبان میں یہ وہ افسانے سناتے

ہیں کہ شقی القلب انسان بھی متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا.... پر کون جانتا ہے کہ آواز کا جادو جگا کر دن بھر میں اوسطاً پانچ چھ سو کمانے والا یہ بچہ شام میں اپنے محلے میں وہ عیاشیاں کرتا ہے کہ سفید پوشوں کے بچے سال بھر اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ قصہ مختصر ان نسباً میراثی اور پیشہ سے بھکاری لوگوں کے پاس شاید سب کچھ ہو لیکن ایک چیز کی شدید کمی ہے اور وہ ہے غیرت! ان لوگوں کے درمیان، مگر ان سے بہت مختلف وہ بابا پھر مجھے عزیز کیوں نہ ہوتا جو غربت اور مہنگائی کے ہاتھوں اپنی ہڈیاں گھلائے دے رہا ہے لیکن کسی کے احسان سے اس کا سر جھکا ہوا نہیں ہے۔

انہی باباجی سے میری چند دن پہلے ایک چھوٹی سی ملاقات ہوئی، جس کا حال سنانا مقصود تھا لیکن تمہید طول پکڑ گئی۔ ہوا یوں کہ میں گلوکوز کا ڈبہ لینے محلے کے میڈیکل اسٹور پہنچا تو مجھ سے پہلے کاؤنٹر پر وہ باباجی کھڑے تھے اور دکان دار سے بحث کر رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ دواؤں کی قیمت پر بحث ہو رہی ہے.... بقول باباجی کے ان کا بچہ پچھلے بیس دن سے بیمار ہے، اور وہ اس کے لیے روزانہ کی بنیاد پر دوا خریدتے ہیں، لیکن کل کے مقابلے میں دکاندار آج قیمت زیادہ بتا رہا ہے جو وہ ادا نہیں کر سکتا.... دکاندار کا کہنا تھا کہ دواؤں کی قیمتوں میں یکایک اضافہ ہو گیا ہے، اس لیے وہ مجبور ہے۔ پھر اس نے دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بابا کو یہ پیشکش کی کہ بقیہ رقم کل دے دے۔

میں نے دیکھا کہ یہ بات سن کر بابا جی کے چہرے پر پسینہ آ گیا، شاید خفت کا....انہوں نے انکار میں سر ہلایا اور اپنے ہاتھوں میں موجود میلے نوٹوں کو دوبارہ گننے لگے....

پھر میرے لیے انہوں نے جگہ چھوڑی اور ذرا سائیڈ میں ہو کر کسی اندرونی جیب میں ہاتھ ڈال کر کچھ نوٹ اور سکے نکالے۔ شاید اب وہ گھر کے راشن کے لیے مختص رقم اپنے بیٹے کی صحت پر خرچ کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ ان کا سر غیر اختیاری طور پر دائیں بائیں ہل رہا تھا۔ میں انہیں دیکھا کیا اور پسینے میں ڈوب گیا۔ اس وقت مجھے شرم آئی کہ میں تو گلوکوز خرید رہا ہوں جس کی اتنی خاص ضرورت نہیں.... وہ غذا کے ذریعے بھی پوری کی جا سکتی ہے لیکن یہ بوڑھا بابا اپنے بچے کی دوا کے لیے اپنے کھانے کی قربانی دے رہا ہے.... میرا دل چاہا کہ اسے دوا خرید دوں، لیکن جو شخص اتنا خوددار ہو کہ صرف قرضہ کی آفر پر اس کی جبیں پر پسینہ آ جائے، ایسے شخص سے کس منہ سے مدد کی بات کی جائے.... یوں میں چاہتے ہوئے بھی جرات نہ کر سکا اور بابا جی اپنے خون پسینے کی کمائی سے بیٹے کی دوا لیے دھیمے قدموں اپنے رستے ہو لیے!

دوسرے دن میں نے نیٹ پر دواؤں کی قیمت میں اضافہ کے حوالے سے خبریں تلاش کیں تو انکشاف ہوا کہ دوائیں مہنگی کرنے کی جو افواہیں ہم کئی ماہ سے سن رہے تھے، انہوں نے بالآخر حقیقت کا روپ لے لیا ہے، مگر ٹھنڈے کمروں میں بیٹھ کر یہ فیصلہ کرنے والے بالکل تصور نہیں کر سکتے کہ یہ حقیقت ایک غریب

آدمی کے نحیف وجود پر تازیانے سے کم نہیں۔

خبر تھی کہ غیر فعال وزارتِ صحت نے ملٹی نیشنل اور مقامی کمپنیوں کو مختلف دواؤں کی قیمتوں میں 20 سے 100 فیصد تک اضافہ کرنے کی منظوری دے دی ہے۔انڈسٹری ذرائع کے مطابق پہلے مرحلے میں تقریباً350 کے قریب دواؤں کی قیمت.ڑھانے کی منظوری دی گئی جب کہ بقیہ دواؤں میں اضافے کی منظوری آیندہ اجلاس میں دی جائے گی۔رپورٹ میں بتایا گیا تھا کہ دواؤں کی قیمتوں میں اضافے کے لیے وزارتِ صحت بورڈ کا اجلاس 8 فروری کو اسلام آباد میں منعقد ہوا تھا۔

واضح رہے کہ ڈرگ ریگولیشن کے حوالے سے وزارتِ صحت کے حکام کا پہلے یہ کہنا تھا کہ وزارت غیر فعال ہے اس لئے وہ ریگولیشن پر عملدرآمد کی پوزیشن میں نہیں مگر پھر انڈسٹری کے مفاد اور عوام کیخلاف فیصلے کیلئے وزارت نہ صرف فعال ہو گئی بلکہ اس نے ریگولیٹری اتھارٹی کے قیام سے قبل ہی قیمتوں میں اضافے کا اہم فیصلہ بھی کر ڈالا !

رپورٹ کے مندرجات پر مزید نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ زیادہ تر اضافہ ان دواؤں میں کیا گیا ہے جو عام استعمال کی دوائیں ہیں۔مثلاً ہر قسم کے کف

سیرپ (کھانسی کے شربت) کی قیمت میں 100 فیصد اضافے کی منظوری دے دی گئی ہے .... اس کے علاوہ ڈسپرین کے 600 والے پیکٹ کی قیمت میں 130 روپے، پیناڈول کے (Librex) لبریکس کی 20 گولیوں والے پیکٹ کی قیمت میں 20 روپے، ٹرائسل 500 گولیوں (Trisil)، گولیوں والے پیکٹ کی قیمت میں 40 روپے 200 والے پیکٹ کی قیمت میں 110 روپے کا اضافہ کیا گیا ہے۔ فاسٹم جیل (Fastum) کی قیمت میں 117 روپے کی منظوری دی گئی ہے اور اب اس کی قیمت 140 روپے کی بجائے 207 روپے ہو گی۔ سوموجیل (Somogel) کی قیمت 19 روپے بڑھا دی گئی ہے۔ سی پوریکس (Ceporex) کیپسول کی قیمت بھی 20 سے 100 فیصد بڑھائی گئی ہے۔ ان کے علاوہ دوسری اینٹی بائیوٹک اور ذیابیطس کی دواؤں کی قیمتیں بھی بڑھائی گئی ہیں!!

سوچنے کی بات ہے کہ مہنگائی کے اس ہمہ جہتی بم سے متاثر وہی ہوتے ہیں جو سفید پوش اور محنت کش لوگ ہیں .... اس سے نہ وہ لوگ متاثر ہوتے ہیں جن کے باتھ روم میں بھی ٹھنڈی مشینیں نصب ہیں اور نہ وہ لوگ جو بسوں، چوراہوں پر اپنی عزت نفس کا سودا کر کے روزانہ سینکڑوں کماتے ہیں .... متاثر تو باباجی کی طرح غیور انسان ہوتے ہیں جو اس ملک میں لاکھوں کی تعداد میں روتے سسکتے بمشکل زندگی کی گاڑی گھسیٹ رہے ہیں مگر اپنی سفید پوشی کا بھرم قائم رکھے ہوئے ہیں .... انہیں نہ کھانے کو پیٹ بھر روٹی دستیاب ہے اور نہ بیماری میں

سستا علاج ہی میسر ہے.... پھر یہ غریب لاچار لوگ جنہیں عرفِ عام میں عوام کہا جاتا ہے، خودکشیاں نہیں کریں گے تو اور کیا کریں گے ! کوئی ہے جو اس کا حل بتائے؟

اہلِ پاکستان کو درپیش صحت کے سنگین خطرات

ایک عربی کہاوت ہے کہ "جو شخص صحت رکھتا ہے وہ امید رکھتا ہے اور جو شخص امید رکھتا ہے وہ سب کچھ رکھتا ہے۔" یہ ایک حقیقت ہے کہ صحت نعمتِ خداوندی اور دولتِ بے بہا ہے، جس کے پاس یہ دولت ہے وہ دنیا کا سب سے دولت مند انسان ہے۔ اس نعمت سے فیض یاب ہوتے رہنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان اپنی صحت کا ہمیشہ خیال رکھے اور بیماریوں کے لاحق ہونے والے تمام خطرات سے آگاہ رہے۔
ہر سال ۷ اپریل کو عالمی یومِ صحت منایا جاتا ہے۔اس سال اس موقع پر انفیکشن کنٹرول سوسائٹی پاکستان کی طرف سے کراچی پریس کلب میں ایک پریس کانفرنس کا انعقاد کیا گیا، جس کا عنوان "اچھی صحت خوش و خرم زندگی" تھا.... یہ عنوان دراصل عالمی یومِ صحت کا وہ پیغام ہے جو ڈبلیو ایچ او (WHO) نے اس موقع پر جاری کیا۔ پریس کانفرنس میں میڈیا کے کثیر نمائندوں نے شرکت کی۔ ICSP کے صدر ڈاکٹر رفیق خانانی نے صحافیوں کے سامنے چند مثالوں کے ذریعے بڑی عمدگی سے صحت کے وہ بنیادی اور سادہ نکات بیان کیے جن پر عمل پیرا ہو کر انسان بہت سی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ اس موقع پر ڈاکٹر رفیق خانانی صاحب کی طرف سے ایک پریس ریلیز بھی جاری کی گیا جس میں صحت کے

حوالے سے چند بنیادی صحی نکات پیش کیے گئے، جن کا خیال رکھ کر انسان بہت سی پیچیدہ اور جان لیوا بیماریوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ یہ نکات مندرجہ ذیل ہیں:

☆ جسم اور ماحول کو ہمیشہ صاف رکھیں، کھانا کھانے سے پہلے، ٹوائلٹ کے بعد، اور مریض کی تیمارداری کے بعد ہاتھ باقاعدگی سے دھوئیں۔

☆ ہفتے میں 4 سے 5 مرتبہ 45 سے 60 منٹ کی اعتدال کے ساتھ ورزش دل کی بیماریوں سے محفوظ رکھنے میں مدد دیتی ہے۔ یاد رکھیے سب سے بہترین ورزش خصوصاً عمر رسیدہ افراد کے لیے پیدل چلنا ہے۔ ذیابیطس کے مریض دن میں کم از کم 60 منٹ پیدل چلیں۔

☆ ہمیشہ متوازن اور معیاری خوراک کا استعمال کریں جو حفظان صحت کے اصولوں کے عین مطابق ہو۔

☆ خوراک میں دودھ، پھل اور سبزیاں زیادہ استعمال کریں، نیز ریشہ دار اجناس کا استعمال کریں تاکہ قبض سے بچا جائے۔

☆ تیل اور گھی میں تلی ہوئی اشیاء سے پرہیز کریں تاکہ کولیسٹرول کی زیادتی، دل اور معدہ کی بیماریوں سے بچا جاسکے۔ اسی طرح خوراک میں مرچ، نمک اور شکر کم مقدار میں استعمال کرکے سادے کھانوں کو ترجیح دیں۔

☆ جلدی سونے اور جلدی اٹھنے کی صحت مند عادت اپنائیں اور اپنا زائد وزن متوازن رکھنے کی کوشش کریں۔

☆ ہر طرح کی نشہ آور اشیاء بشمول سگریٹ، گٹکا، نسوار اور تمباکو سے بنی دیگر اشیاء کے استعمال سے بچیئے۔

☆ غیر محفوظ انتقالِ خون سے اور غیر محفوظ سرنج کے استعمال سے بہت زیادہ احتیاط کریں۔ جنسی تعلقات میں اپنے شریک حیات تک محدود رہیں۔

☆ بے وجہ اندیشوں اور فکروں سے بچتے ہوئے پر امید اور خوش رہیں۔

☆ سادہ اور قدرتی طرزِ زندگی اپنایئے۔ یاد رکھیئے صاف پانی، صاف ہوا اور دھوپ اچھی صحت کے لیے بہت ضروری ہیں۔

ضعیف اور عمر رسیدہ افراد :

☆ زیادہ دیر کے لیے جھک کر کام کرنے سے پرہیز کریں۔

☆ استعداد سے زیادہ وزن اٹھانے سے پرہیز کریں۔

☆ زمین پر بیٹھنے کی بجائے مناسب بلند کرسی کا استعمال کریں۔

☆ باتھ روم میں کموڈ استعمال کریں تاکہ گھٹنوں کے امراض سے بچا جا سکے۔

☆ چھینک لیتے ہوئے اور کھانستے وقت ضرورت سے زیادہ زور لگانے کی کوشش ہرگز نہ کریں۔

☆ ناہموار اور پھسلن والی جگہوں پر مت جائیں کیونکہ ہڈیاں کمزور ہونے کی وجہ سے گرنے کے باعث ہڈیاں ٹوٹ سکتی ہیں۔

ملک عزیز پاکستان صحت کے حوالے سے کتنے سنگین خطرات کا شکار ہے؟ اس کے لیے

مندرجہ ذیل چند امراض کا جائزہ چشم کشا ہو گا۔

ہیپاٹائٹس: ملک بھر میں اندازاً 14 ملین لوگ ہیپاٹائٹس کے مرض میں مبتلا ہیں۔ جن میں سے تقریباً 8.8 ملین ہیپاٹائٹس سی کا شکار ہیں اور 5.6 ملین ہیپاٹائٹس بی کا شکار ہیں۔ایک رپورٹ کے مطابق صفائی سے عاری طبّی سامان، گندے استروں کا استعمال اور غیر محفوظ جنسی تعلقات اس مرض کے پھیلنے کی اہم وجوہات ہیں۔

پولیو: محکمہ صحت کی ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان دنیا میں واحد ملک ہے جہاں پولیو کیسز کی تعداد کم ہونے کی بجائے بڑھ رہی ہے اور سال دو ہزار گیارہ کے دوران ملک بھر میں ایک سو چوراسی (۱۸۴) پولیو کیسز رپورٹ ہوئے جن میں سب سے زیادہ تعداد بلوچستان کی ہے۔بلوچستان میں سال دو ہزار گیارہ کے دوران تہتر (۷۳) کیسز سامنے آئے۔ محکمہ صحت کے جاری کردہ اعداد و شمار کے مطابق ملک کی آبادی کے حوالے سے سب سے بڑے صوبے پنجاب میں سال بھر کے دوران صرف سات کیس، سندھ میں اکتیس، صوبہ خیبر پختونخوا میں اکیس، شمالی علاقہ جات میں باون جبکہ گلگت بلتستان میں ایک اور وفاقی دارالحکومت میں اس سال کوئی کیس رپورٹ نہیں ہوا۔اس کے مقابلے میں ہمسایہ ملک ہندوستان میں صرف ایک پولیو کیس سامنے آیا اور گذشتہ سال دسمبر میں عالمی ادارہ صحت ڈبلیو ایچ او نے انڈیا کو پولیو فری ملک قرار دے دیا تھا۔

تپ دِق (ٹی بی): امریکہ کے ایک امدادی ادارے کی رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر ایک لاکھ میں سے 295 افراد ٹی بی کے مرض میں مبتلا ہیں جبکہ ٹی بی کے انتہائی شکار ملکوں میں پاکستان کا نمبر چوتھا ہے۔رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر سال چار لاکھ ٹی بی کے نئے کیسز سامنے آ رہے ہیں، اور ان میں سے ستر ہزار زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں۔

کینسر: حالیہ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ہر سال تقریباً ایک لاکھ پانچ ہزار افراد کینسر کا شکار ہو جاتے ہیں۔ یعنی ہر پانچ منٹ میں ایک، ایک گھنٹے میں بارہ اور چوبیس گھنٹوں میں ایک سو اٹھاسی افراد اس موذی مرض کی مختلف قسموں کا شکار ہو رہے ہیں۔کینسر کی مختلف اقسام میں صرف بریسٹ کینسر کو دیکھیں تو اعداد وشمار سے یہ پتہ چلتا ہے کہ پاکستان میں بریسٹ کینسر کی شرح، کسی بھی ایشیائی آبادی سے زیادہ ہے یعنی ہر سال نوے ہزار پاکستانی خواتین اس مرض میں مبتلا ہوتی ہیں اور یہ ہر سال 40,000 عورتوں کی موت کا سبب بنتا ہے۔ محتاط اندازے کے مطابق ہر آٹھویں عورت بریسٹ کینسر میں مبتلا ہے۔ اسی طرح پاکستان میں تیزی سے بڑھتے ہوئے تمباکو نوشی کے رجحان اور گٹکا استعمال کرنے کی وجہ سے منہ کے کینسر میں بھی تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے۔

ذیابیطس: ذیابیطس مہلک بیماری ہے اور پوری دنیا بشمول پاکستان میں تیزی سے

پھیل رہی ہے جس کی وجہ سے ملک میں مشکل صورتحال کا سامنا ہے۔ انٹرنیشنل ذیابیطس فیڈریشن کے مطابق پاکستان میں 7.1 فیصد لوگوں میں ذیابیطس پائی جاتی ہے، اس اعتبار سے پاکستان ذیابیطس کے پھیلاؤ میں دنیا میں ساتویں نمبر پر ہے جو نہایت تشویش ناک صورتحال ہے۔ ذیابیطس کی وجہ سے پاکستان میں ہر سال 36 ہزار خواتین اور 53 ہزار مرد لقمہ اجل بن جاتے ہیں۔ دریں اثناء بچوں میں بھی ذیابیطس کا مرض معاشرے کے لئے خطرے کی علامت ہے اور اس کی بڑی وجوہات میں بچوں کا تا دیر ٹی وی دیکھنا، مستقل کمپیوٹر استعمال کرنا، فاسٹ فوڈ کا استعمال اور صحت مند جسمانی سرگرمیوں میں حصہ نہ لینا سرفہرست ہیں۔

وٹامن ڈی کی کمی: ایک طبّی جائزے کے مطابق بڑھاپے میں جسمانی معذوری کی ایک بڑی وجہ وٹامن ڈی کی کمی ہے۔ جن لوگوں کو وٹامن ڈی کی کمی نہیں ہوتی، ان کو اس معذوری سے 75 فیصد کم واسطہ پڑتا ہے۔ ماہرین کے مطابق پاکستان میں 90 فیصد آبادی وٹامن ڈی کی کمی کا شکار ہے۔ یہ کمی نہ صرف بچوں کی ہڈیوں پر اثر انداز ہو رہی ہے بلکہ ذیابیطس، بلڈ پریشر، نمونیا، کینسر، جسم میں دکھن کا احساس، پٹھوں میں کھنچاؤ اور ذہنی تناؤ کا باعث بھی بن رہی ہے۔ دوران حمل وٹامن ڈی کی مسلسل فراہمی سے نہ صرف اسقاط حمل میں کمی واقع ہو سکتی ہے بلکہ زچہ اور بچے کی افزائش کے لئے بھی یہ نہایت ضروری ہے۔ قدرتی ذریعہ کے طور پر سورج کی کرنوں سے وٹامن ڈی کی ضروری مقدار حاصل کی جا سکتی ہے تاہم شدید کمی پر قابو پانے کے لیے دھوپ اور خوراک کے ساتھ اضافی وٹامن ڈی کا

حصول ناگزیر ہے۔

حکایاتِ عرب

ہماری ویب کے قارئین کے لیے زندگی گزارنے کا ڈھنگ سکھانے والے رہنما قصے

جہالت ہر خرابی کا پیش خیمہ ہے:

اتفاق سے چار مختلف ممالک کے چار آدمی ایک جگہ جمع ہو گئے جن میں ایک ایران' دوسرا ترکی' تیسرا روم اور چوتھا بلاد عرب کا باشندہ تھا۔ مسافر سمجھ کر کسی نیک دل نے انہیں چاندی کا ایک درہم عطا کر دیا۔ اب ہر شخص اس درہم سے اپنی پسند کی چیز مول لے کر کھانے کا خواہش مند تھا۔

عرب نے کہا: "میری رائے میں اس درہم کے 'عنب' خرید لیں'، یہ عمدہ پھل ہے اور ہم چاروں کا پیٹ بھی بھر جائے گا۔"

ایرانی نے چلا کر کہا"خدا کی قسم ! میں یہ عنب عِنَب نہ خریدنے نہ دوں گا' میں تو 'انگور' ہی لوں گا' وہی پھل مجھے مرغوب ہے۔"

ترک نے ناراض ہو کر کہا"ارے بے وقوف ! کیا انگور ونگور کرتے ہو، اس درہم کے 'اوزم' خرید لو۔ یہ میرا پسندیدہ پھل ہے، تم بھی اسے کھا کر خوش ہو جاؤ

"گے۔

رومی نے کہا "میں تو 'استافیل' کھاؤں گا' اس کے سوا تم نے کوئی اور پھل خریدنے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔"

نتیجتاً ان چاروں کے درمیان خوب دھینگا مشتی اور مار پٹائی ہوئی کیوں کہ جہالت علم پر غالب آگئی۔ اس موقع پر ایک صاحبِ علم شخص کا وہاں سے گزر ہوا ' ماجرا جان کر اس نے کہا" احمقو! یہ ایک ہی پھل کے چار الگ الگ نام ہیں' پھل وہی ہے جو تم سب کو مرغوب ہے 'عنب' یعنی انگور....!!"

:فکر فردا

کسی ہرے بھرے جنگل میں ایک گائے رہتی تھی۔ علی الصباح وہ تازہ گھاس چرنے نکلتی' سارا دن گھاس چرتی اور سورج ڈوبنے تک خوب سیر ہو جاتی.... اور اس کا وزن خوب بڑھ جاتا۔ مگر پھر ساری رات وہ اس غم میں گھلتی رہتی کہ خدا معلوم اگلے روز گھاس چرنے کو ملے نہ ملے !؟ بس اسی فکر میں صبح تک وہ وہ پہلے کی طرح سوکھ کر دبلی پتلی ہو جاتی، یہاں تک کہ بدن کی ایک ایک پسلی نمایاں ہونے لگتی۔ خدا کی قدرت دیکھیے کہ ہر روز صبح سویرے وہ جنگل پھر سرسبز وشاداب ہو جاتا اور گھاس اونچی ہو جاتی تاکہ گائے اپنا پیٹ اچھی طرح بھر لے۔

یہ سلسلہ کئی دن تک جاری رہا۔ دن میں گائے گھاس چرتے چرتے فربہ ہو جاتی اور رات کو اس فکر میں گھلنے لگتی کہ اگلے روز کیا کھائے گی؟ گائے کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ جب ربّ کائنات روزانہ جنگل میں جانے سے قبل ہی اس کے رزق کا سامان بخوبی فراہم کر دیتا ہے تو پھر اگلے روز کی فکر میں اسے ہڈیوں کا گودا سکھانے کی کیا ضرورت ہے؟

آپ نے غور کیا کہ یہ گائے کون ہے؟ یہ انسان کا نفس ہے اور سرسبز جنگل یہ دنیا!!.... اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کو ہر روز اپنے وعدے کے مطابق رزق عطا فرماتا ہے، لیکن کم عقل اور تھڑولا آدمی اسی فکر میں سوکھ سوکھ کر کانٹا ہو جاتا ہے کہ ہائے! کل کیا کھاؤں گا؟ حالاں کہ روزِ پیدائش سے لے کر اب تک وہ برابر کھا رہا ہے اور رزق میں کمی نہیں آئی بلکہ عمر بڑھنے کے ساتھ اس کی ضروریات پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی ہیں پھر بھی برابر اپنا رزق کھاتے ہوئے بھی اللہ تعالیٰ کی رزاقی پر اس کا ایمان عموماً متزلزل رہتا ہے.... الا ماشاء اللہ!!

:عالم اور ملاح

علم نحو میں کامل ایک عالم کسی سفر پر جا رہا تھا۔ راستے میں دریا آیا۔ پار

اترنے کی غرض سے ایک کشتی پر سوار ہوا۔ دوران سفر اس نے از راہِ خود پرستی و شیخی

"ملاح سے پوچھا: "کیوں بھئی تم نے صرف و نحو پڑھی ہے؟

"ملاح نے جواب دیا: "نہیں۔

"عالم نے کہا: "افسوس تم نے اپنی آدھی عمر ضائع کر دی۔

ملاح کیا کہتا؟ خاموش ہو رہا.... یکایک کشتی ایک زبردست بھنور میں پھنس کر چکر کھانے لگی اور عالم کے حواس جواب دینے لگے۔ اس کی گھبراہٹ دیکھ کر ملاح نے پوچھا:

"حضرت ! آپ کو تیرنا بھی آتا ہے؟"

"....انہوں نے جواب دیا" بالکل نہیں

ملاح نے کہا: "حضرت ! تب تو آپ کی پوری زندگی ضائع ہو گئی، کیوں کہ چند لمحوں

"بعد کشتی غرق ہونے والی ہے۔

:لوگوں کی مثال

لوگوں کی مثال اس انسان کی سی ہے جو اپنی گائے بیچنے کے لیے بازار گیا، دن

ڈوبنے کو ہوگیا مگر کسی نے بھی اس کی گائے نہ خریدی، اس وقت اس کے پاس اس کا ایک دوست آیا اور اس نے اس سے کہا کہ تو اپنی گائے کے بارے میں یہ منادی کیوں نہیں کرتا کہ یہ نہ صرف حاملہ ہے بلکہ یہ عام طور پر ہمیشہ بچھڑا یا دو بچھڑے جنا کرتی ہے۔ اسے اپنے دوست کی یہ رائے بھلی معلوم ہوئی اور پھر اس نے اِس دوست کے مشورے کے مطابق منادی شروع کردی۔ پس جونہی بازار والوں نے اس کی آواز سنی، انہوں نے بڑی اچھی قیمت دے کر وہی گائے خرید لی۔ اس کے بعد وہ گھر لوٹ آیا اور دن بھر وہ اس بات کو یاد کرتا رہا اور یہ صورت حال اس کے ذہن میں خوب کھب گئی ۔وہ نہ بھولا کہ جونہی اس نے یہ اعلان کیا تھا کہ اس کی یہ گائے حاملہ ہے اور یہ عام طور پر ایک نہیں بلکہ دو بچھڑے جنا کرتی ہے تو کس طرح لوگ اسے خریدنے کے لیے ٹوٹ پڑے تھے۔ یہ صورت اور اس سے حاصل ہونے والی فکر اس کے ذہن میں نہ صرف خوب اچھی طرح جم گئی، بلکہ اس نے اسے اپنے افعال کے لیے ایک پیمانہ اور اپنے تصرفات کے لیے ایک قاعدہ کلیہ بنالیا اور پھر اس نے اس تجربے کو اپنی عقلی سطح کے مطابق اس سے ملتی جلتی دوسری صورتوں میں بھی استعمال کرنے کا فیصلہ کرلیا اور پھر ہوا یوں کہ اس کی ایک پیاری بیٹی تھی، جب وہ بلوغت کو پہنچ گئی تو اس نے اس کے لیے دلہا تلاش کرنا شروع کردیا تاکہ وہ اس کی دلہن اور گھر کی مالکہ بن جائے، لیکن قسمت نے اس کا کچھ زیادہ ساتھ نہیں دیا، جس کے نتیجے میں اس کی شادی میں تاخیر پر تاخیر ہوئی گئی۔ حتیٰ کہ شیطانی وسوسوں نے اس کی نیندیں حرام کردی

اور اسے یہ خوف کاٹنے لگا کہ وہ کہیں کنواری نہ بیٹھی رہے، آخر کار اس نے اپنے اس معاملے کو اپنے رشتہ داروں کے سامنے پیش کیا اور نوجوانوں کے سامنے بھی یہ مسئلہ رکھا لیکن افسوس کہ کوئی ایک بھی آگے نہ بڑھا اور نہ ہی کسی نوجوان نے اس کی بیٹی کا ہاتھ طلب کیا۔ چوں کہ وہ گائے بیچنے کا ایک تجربہ کرچکا تھا اور اسے اشباہ اور نظائر کی معرفت ہی نہیں بلکہ ایک دوسرے پر قیاس کرنے کی کچھ نہ کچھ واقفیت بھی اسے ہو چکی تھی۔ لہٰذا ایک دن وہ اپنے دل میں کہنے لگا کہ کیا مجھے خود تجربہ نہیں ہوا کہ لوگ صرف گائے کو خریدتے ہیں جو حاملہ ہو اور کثرت سے بچے دیتی ہو خواہ وہ گائے اس کی ہو یا کسی اور کی۔ تو معلوم ہوا کہ بکنے کا اصل سبب حاملہ ہونا اور بچے دینا ہے۔ تو اس نے اپنے اس تجربے کی بنیاد پر اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑا اور اسے بازار کی طرف لوگوں کے مجمع میں لے گیا اور اونچی آواز سے یہ کہنا شروع کردیا کہ "ہے کوئی جو ایسی نوجوان عورت سے شادی کرنا چاہے جو بہت محبت کرنے والی اور بہت بچے جننے والی ہے، جو اس وقت چار ماہ سے حاملہ ہے اور امید ہے کہ وہ ایک نہیں دو جڑواں بچے جنے گی۔"

آج بہتر ہے

تمہیں اپنے آپ کو چھڑانا تو ہے۔ بہتر یہ ہے اپنی قیمت آج دے لو۔ ابھی بازار کھلا ہے۔ قیمت تمہارے پاس ہے۔ مال ابھی سستا ہے، کوئی پل کی بات ہے پھر نہ

بازار رہے گا۔ نہ کوئی پیسہ ہاتھ میں ہوگا۔ قیمتیں آسمان سے باتیں کریں، سودا نہیں ہوگا۔ سب کچھ دوگے، مگر دینے کو پاس کچھ ہو تو.... اور لینے والا ماننے پر آئے تو۔ یہ سودا ہاتھ سے جاتا رہنے کا دن" یوم التغابن یعنی یوم حشر ہوگا.... "جس دن ظالم اپنے ہاتھ چبائے گا"۔

:امام صاحب کی ذہانت

امام ابو حنیفہ خلیفہ منصور عباسی کی مجلس میں داخل ہوئے۔ دربار میں ابوالعباس طوسی بھی تھا، جو کہ امام صاحب کے بارے میں بہت بری رائے رکھتا تھا۔ امام ابو حنیفہ اس سے باخبر تھے۔ ابوالعباس طوسی نے موقعہ تکا کر سوچا آج میں ابو حنیفہ کی جان لے سکتا ہوں۔ تب اس نے خلیفہ کی موجودگی میں امام صاحب سے فتویٰ طلب کیا:

فرض کیجئے امیر المومنین نے کسی شخص کو کسی آدمی کی گردن مارنے کیلئے طلب کیا اور" وہ شخص اس آدمی کو جانتا تک نہیں۔ کیا اس کیلئے جائز ہے کہ وہ حکم پر عمل کرتے ہوئے "اس آدمی کی گردن مار آئے؟

:امام ابو حنیفہ نے جوابی سوال کیا

"ابوالعباس۔ امیر المومنین نے اسے ناحق حکم دیا یا حق؟"

ظاہر ہے حق کے ساتھ" ابوالعباس نے معاملہ ہاتھ سے جاتے دیکھ کر کہا۔"

!"تو پھر حق پر عملدرآمد ضروری ہے اور اس میں کوئی پس و پیش جائز نہیں"

امام صاحب فیصلہ کن انداز میں فرمانے لگے۔ اس کے بعد امام ابو حنیفہ اپنے قریب بیٹھے ایک شخص سے کہنے لگے: اس نے مجھے باندھنا چاہا مگر میں نے اسے باندھ لیا! (تاریخ بغداد)

ڈاکٹروں کی سفاکانہ ہڑتال

ہمارے پیارے نبی خاتم النبیین حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے چھ سو سال پہلے تشریف لانے والے حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا و علیہ الصلوۃ و السلام ایک جلیل القدر پیغمبر تھے۔ آپ کے ہاتھ پر اللہ جل شانہ نے کئی معجزات ظاہر فرمائے۔ ان میں سے ایک معجزہ یہ تھا کہ آپ علیہ السلام کے ہاتھوں اللہ تعالیٰ مادر زاد نابینا کو بینا اور مرتے ہوئے کو شفا عنایت فرمایا کرتے تھے۔ اور یہ ظاہری بات ہے کہ آپ علیہ السلام یہ خدمت اس لیے نہیں کیا کرتے تھے کہ آپ کو اس کے بدلے میں معاوضہ یا کسی قسم کا ریٹرن دیا جائے، بلکہ یہ بطور خدمت خلق کے ہوتا تھا، کیوں کہ نبی اپنی امت کا سب سے بڑا خیر خواہ اور شفیق ہوتا ہے۔ آپ کا یہ معجزہ اتنا مشہور و معروف ہوا کہ اب تک وہ ڈاکٹر، طبیب یا معالج 'جو خدمت خلق کے جذبے سے لوگوں کے زخموں پر مرہم رکھے، ان کا علاج کرے، اسے مجازاً 'مسیحا' کہا جاتا ہے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لقب 'مسیح' سے ماخوذ ہے۔

اس تمہید سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ ہر ایم بی بی ایس کی ڈگری رکھنے والا اور ہر حکمت کی سند لینے والا 'مسیحا' نہیں ہوتا، بلکہ اس کے ساتھ 'خدمتِ خلق' مشروط ہے۔ خدمت خلق کا جذبہ ہو، تو ایک معمولی کمپوڈر اور نرس بھی مسیحا ہے

لیکن اگر کسی کا جذبہ کھوٹا اور نیت میں فتور ہو تو وہ چاہے طب کی کتنی ہی بڑی سندیں رکھتا ہو، مسیحا نہیں بلکہ ڈاکو اور موت کا سوداگر ہے....

اگر ہم انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا اس نظر سے جائزہ لیں کہ وہ کون سے شعبے ہیں جو سود وزیاں کی تنگنائیوں سے ہٹ کر صرف خدمت کے لیے وقف ہیں تو دو شعبے فوراً ذہن میں آ جاتے ہیں، ایک تعلیم و تربیت کا اور دوسرا طب کا۔ پہلے شعبے میں متعلّم بغیر کسی غرض کے طالب علموں کو علم اور ادب کے زیور سے آراستہ کرکے ان کو روحانی طور پر قوی اور مہذب بناتا ہے تو دوسرے شعبے میں طبیب ہر سود وزیاں سے بالاتر ہو کر بیمار جسموں پر دست شفا رکھتا ہے اور ان کے دکھ درد کو دور کرنے کی جان توڑ کوشش کرتا ہے.... یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں ان دونوں شعبوں کو جو احترام اور عزت حاصل رہی ہے، وہ کسی اور پیشہ کو حاصل نہیں رہی۔ اور ظاہری بات ہے کہ اس کی وجہ صرف ان کا کام نہیں بلکہ وہ بے غرض جذبہ ہے جو ان شعبوں کی بنیاد میں ہمیشہ کارفرما رہا ہے۔ خصوصاً تاریخ اسلام سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی ابتدا سے آج سے دو سو سال پہلے تک کبھی تعلیم کے لیے متعلّم نے یا علاج کے لیے طبیب نے معاوضہ کا سوال نہیں کیا۔

لیکن آج مغربی سرمایہ دارانہ تہذیب اس حد تک ہم پر حاوی ہو گئی ہے کہ صدیوں

کے آدرش اور اخلاق چند ٹکوں کی خاطر پاؤں تلے روند دیے جاتے ہیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک بھی ایسی صورتحال تھی کہ عمومی طور پر معالج حضرات چاہے کتنی ہی بھاری فیس لیتے ہوں، لیکن خاص حالات میں اور خصوصی لوگوں کے ساتھ رعایت کیا کرتے تھے.... وہ طبی اخلاقیات کا پیکر ہوا کرتے تھے .... فوری طور پر ایک ایسے ہی معالج کی مثال یاد آرہی ہے جو صحیح معنوں میں 'مسیحا' کہلانے کا مستحق تھا۔ ہم نے یہ واقعہ کتابوں میں پڑھا کیوں کہ واقعہ ہماری پیدائش سے کہیں پہلے کا ہے،شاید آپ نے بھی ڈاکٹر جمعہ کا نام سنا ہو جو اپنے وقت میں پاکستان کے مایہ ناز نیوروسرجن ہوا کرتے تھے.... سن 1970ء میں جب ڈاکٹر جمعہ پاکستان میں واحد نیوروسرجن تھے،انہی دنوں کی بات ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا ایک بیٹا عصمت جمعہ، ایک رات کراچی کی شاہراہِ فیصل پر موٹر سائیکل چلا رہا تھا کہ غلط لائن سے اچانک ایک گاڑی آئی اور عصمت کی موٹرسائیکل سے ٹکرا گئی۔ عصمت بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس کے سر پر اس شدت سے چوٹ لگی تھی کہ سر تقریباً کھل گیا تھا۔ اسے فوری طور پر جناح ہسپتال کراچی لایا گیا۔جہاں اس کے والد ڈاکٹر جمعہ رات کے دو بجے آپریشن تھیٹر میں ایک عام مریض کا آپریشن کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو آپریشن تھیٹر میں ان کے بیٹے کی حالت کے بارے میں بتایا گیا۔ ڈاکٹر صاحب نے آپریشن تھیٹر میں پڑے مریض کو دیکھا تو ان کے ضمیر نے اسے موت کے منہ میں چھوڑ کر اپنے بیٹے کو دیکھنا گوارا نہ کیا لہٰذا انہوں نے آپریشن جاری رکھا۔ آپریشن کامیابی سے ختم ہوا تو انہیں

! معلوم ہوا کہ ان کا عزیز بیٹا عصمت جمعہ انتقال کر چکا ہے

ایک طرف طبّی اخلاقیات کی یہ تابندہ مثال آپ نے ملاحظہ کی کہ زیر علاج عام مریض کی زندگی بچانے کے لیے اپنے بیٹے کی قربانی دے دی گئی اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ آج اسی ملک میں کچھ ڈاکٹرز جو اپنے آپ کو" ینگ" کے سابقہ کے ساتھ متعارف کراتے ہیں، وہ اپنے مطالبات منوانے کے لیے ہڑتال کر رہے ہیں، ایمرجنسی اور او پی ڈی کو تالے لگا رہے ہیں اور ہسپتالوں کے شیشے توڑ رہے ہیں۔ان کا اسٹائل ایسا ہے جیسے وہ طب کے شعبہ سے وابستہ نہیں بلکہ کسی فیکٹری کے مزدور ہوں جو اپنے مطالبات منوانے کے لیے فیکٹری میں تالا ڈال کر احتجاج ریکارڈ کر رہے ہیں۔ جب کہ وہ جانتے بھی ہیں کہ اس کا خمیازہ عوام کو کئی قیمتی جانوں کے زیاں کی صورت بھگتنا ہو گا۔

یہ کتنی حیرت انگیز بات ہے کہ وہ ایسے شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں جس کی بین الاقوامی طور پر یہ اہمیت ہے کہ خونریز جنگوں کے دوران بھی دشمن کی فوجیں ہسپتالوں پر حملہ نہیں کرتیں اور اس سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ دشمنوں کا وہ فوجی جس کے سینے میں اپنے فوجی نے سوراخ کیا ہو، وہ بھی اگر زخمی حالت میں ہسپتال میں آ جائے تو بین الاقوامی طبّی اخلاقیات یہ کہتی ہیں کہ اس صورت حال میں طبیباس کو دشمن کی نظر سے نہیں بلکہ صرف طبیب کی نظر سے دیکھے،اور

اس انسانی جان کو بچانے کے لیے سر توڑ کوششیں کرے۔ اس کی ان کوششوں کو کوئی بھی غداری نہیں قرار دیتا بلکہ اس کو سراہا جاتا ہے۔

اسی سال مارچ میں بھی کراچی میں بھی پیرامیڈیکل اسٹاف کی ہڑتال ہوئی تھی، جس کی وجہ سے کراچی اور اندرونِ سندھ کے دو درجن سے زائد بڑے اور معصوم بچے جان سے گزر گئے تھے۔ معلومات کے مطابق صرف ایک ہسپتال این آئی سی ایچ میں چھ بچوں کی ہلاکت ہوئی تھی۔ شاید یہ سفاکانہ ہڑتال پنجاب کے ینگ ڈاکٹرز کو بھا گئی کہ پھر انہوں نے بھی اس کی تقلید میں 19 جون کو پنجاب بھر میں ہڑتال کی کال دی اور ہسپتالوں کو تالے لگ گئے، جس کی وجہ سے جاں بلب مریض جن میں معصوم بچے بھی ہیں، سڑکوں پر مرتے دکھائی دیے۔ میو ہسپتال لاہور، الائیڈ ہسپتال فیصل آباد اور پنجاب کے دیگر بڑے شہروں کے ہسپتالوں میں غریب لوگ بروقت علاج کی سہولیات نہ ملنے کی وجہ سے جان کی بازی ہارتے رہے.... اور اس سانحہ کا سبب وہ لوگ ہوئے جو انسانیت کی خدمت کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اب پکڑ دھکڑ جاری ہے اور عارضی طور پر فوجی ڈاکٹرز بلوالیے گئے ہیں۔ یہ منظر نامہ نہایت خطرناک اور افسوس ناک ہے جو مقدس سمجھے جانے والے اس شعبہ کی ایسی نفرت انگیز تصویر کھینچ رہا ہے کہ لوگ برملا ان لوگوں کو ڈاکٹر کی بجائے ڈاکو کہہ رہے ہیں جنھوں نے اپنے ہی جیسے عوام کا اعتماد لوٹ لیا۔ یہ کیسی سنگ دلانہ حرکت ہے کہ کسی طبیب کے سامنے ایک معصوم بچہ تڑپ تڑپ کر جان دے دے اور وہ تنخواہوں میں اضافہ اور سروس اسٹرکچر کے بینر لیے اس کے سامنے بے

نیازی سے کھڑے رہیں۔ ایک عام آدمی بھی اس طرح نہیں کر سکتا تو پھر مسیحا کہلائے جانے والے ان سفید کوٹوں والوں کے دل اتنے سیاہ کیوں ہو گئے؟

ہم یہ نہیں کہتے کہ سب ہی ایسے ہیں؟ اس ملک میں لاکھوں معالج ایسے ہیں جو مریضوں کا درد رکھتے ہیں اور اس ظالمانہ طریقہ احتجاج کی شدت سے مخالفت کر رہے ہیں۔ سینئر ڈاکٹرز جنھوں نے اپنی زندگی اسی شعبہ میں گزار دی، وہ اس صورت حال سے دل گرفتہ ہیں اور یہی نہیں بلکہ ہماری معلومات کے مطابق نوجوان ڈاکٹرز کی ایک بڑی تعداد بھی اس ہڑتال کی حامی نہیں ہے مگر ہر جگہ ایک پریشر گروپ ایسا موجود ہے جو دباؤ ڈال کر ایسی صورت حال پیدا کر رہا ہے جو عام مریضوں کی موت پر منتج ہو رہا ہے۔

اب ایک نظر ان مطالبات کی طرف بھی ڈالتے ہیں، جو ینگ ڈاکٹرز کی ایسوسی ایشن (YDA) حکومت سے کر رہی ہے۔ بقول پنجاب حکومت ینگ ڈاکٹروں نے براہ راست بی ایس پی 18 پر بھرتی کا مطالبہ کیا ہے اس کے علاوہ دیگر سہولیات جن میں گھر، ٹیلی فون، پانچ ایڈوانس انکریمنٹ، پروفیسروں کے لئے دو خصوصی گرانٹ بھی شامل ہیں۔

گاڑیوں cc کے ڈاکٹروں کے لیے BSP1000 مطالبات یہیں ختم نہیں ہوئے بلکہ 18- BSP-20 کے لئے پٹرول کے ساتھ گاڑی اور BSP- کے لئے آسان اقساط پر قرضے گاڑیوں کا بھی cc کے ڈاکٹروں کے لئے ڈرائیور اور پٹرول کے ساتھ 211300

مطالبہ کیا ہے۔یہ مطالبات کتنے جائز ہیں اور کتنے ناجائز ہیں، ہم کیا کہیں ہم تو اتنا کا سرگرم رکن ہے، جس کی عمر ستائیس سال (YDA) کہتے ہیں کہ ایک نوجوان ڈاکٹر جو ہے اور جوبقول خود ماہانہ چالیس سے پچاس ہزار تنخواہ لے رہا ہے، وہ اگر سمجھتا ہے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے،اور یہ چاہتا ہے کہ اس کی خدمات کا ریٹرن اسے زیادہ ملنا چاہیے تو وہ مل مزدور کی طرح تو احتجاج نہ کرے کہ شفاخانوں کو تالے لگا دے بلکہ اپنے مطالبات کے لیے پرامن مظاہرے کرے، میڈیا کے ذریعے اپنی آواز بلند کرے.... مریض کشی کی بجائے مریضوں کو اپنا ہم نوا بنائے تو نیک نامی کے ساتھ شاید اسے اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہو بھی جائے۔

معاشرے میں اتنی بے حسی اور نفانفسی کی ہوا کیوں چل پڑی ہے؟ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام کی نحوستیں ہیں جس نے کسی آکٹوپس کی طرح ہمارے ہر شعبے کو بری طرح جکڑ لیا ہے۔ اب الا ماشاء اللہ ہر فرد کا مقصود و مطلوب صرف پیسہ ہے، چاہےوہ کسی کے خون کی ہولی کھیل کر حاصل ہو یا عزتوں کا سودا کر کے حاصل ہو!.... اللھم احفظنا منھم۔

ایک نومسلمہ کی ایمان افروز آپ بیتی

جمیلہ / پشپا

میرے والد کا نام شیو رام بھگت تھا، والدہ کا نام سومی بائی تھا۔ میرا تعلق پنجاب کے راج پورہ ضلع پٹیالہ کے بھگت خاندان سے تھا۔ ہم لوگ تین بہنیں تھیں۔ میرے اللہ کو مجھ سے پیار تھا اور میرے رب نے کرم کیا کہ ایمان کی دولت سے نوازا اور کفر کو مجھ سے دور کیا اور بظاہر ''مسلم عورت کی ستر پوشی'' میرے اسلام لانے کا سبب بنی۔

ہمارا گھرانہ غریب تھا۔ میری والدہ کی بہن کی شادی ایک بڑے گھرانے میں ہوئی۔ جب میری شادی ہوئی، اس وقت میری عمر ؟؟ سال تھی۔ میری خالہ نے سوچا کہ میری بھانجی بھی بڑے گھر میں آ جائے، اس لیے انھوں نے اپنے دیور کے بیٹے سے جو کہ سی بی آئی آفیسر تھے، میری شادی کرا دی۔ میری والدہ امیر غریب کے خوف کی وجہ سے شادی پر آمادہ نہ تھیں۔ ایک طرح زبردستی یہ شادی کرائی گئی۔ شادی کے بعد معلوم ہوا کہ جن سے میرا بندھن بندھا ہے، وہ بے حد لاپروا اور شرابی ہیں۔

سسرال میں میرا حال تو نوکر سے بھی بدتر تھا اور میں کٹھ پتلی کی طرح سسرال میکے میں گھمائی جاتی۔ 1980ء میں میری شادی ہوئی اور 1983ء میں میرا بیٹا پیدا ہوا۔ اس وقت میں بے حد ستم رسیدہ حالت میں اسپتال میں تھی۔ میری ماں نے بھی میری پروا چھوڑ دی۔ بے چاری کیا کرتی، حالات ہی ایسے تھے۔ میں نے لوگوں کے جھاڑو برتن کیے اور

ایسے حالات میں اللہ نے دو بیٹے اور ایک بیٹی کی مجھے ماں بنا دیا، اللہ نے مجھے دماغ بہت تیز دیا ہے۔

میں نے 1980ء میں سلائی کڑھائی کے کارخانے میں 250 روپے ماہانہ تنخواہ پر کام شروع کیا۔ وہیں سے میرا اسلام سے تعلق جڑا۔ وہ کارخانہ کسی ہندو کا تھا، لیکن اس میں نوکر مسلمان تھے اور مسلمان بریلوی خیال کے تھے۔ میں ساڑی پہن کر کارخانے جاتی اور میرا بلاؤز بغیر آستین کے ہوتا تھا۔ مسلم ورکر بولے: بہن جی، آپ ہمارا ایمان خراب کرتی ہیں! میں بولی: ایمان کیا؟ وہ بولے: ہم لوگ مسلمان ہیں اور ہمارے یہاں مسلم عورت ستر پوش یعنی پوری ڈھکی چھپی رہتی ہے اور اس لیے مردوں کا ایمان بھی سلامت رہتا ہے اور عورتوں کا بھی۔

میں نے کہا کہ ایمان کیا ہے؟ بولے کہ ایک کلمہ ہے۔ وہ پڑھا جاتا ہے۔ میں بولی کہ وہ تو مسلمان عورتیں ہیں، اپنے دھرم کی وجہ سے کرتی ہیں، مسلم ورکر بہت دردمندی سے بولے کہ بہن جی، آپ چاہے جو بھی ہوں، ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپ بھی ہماری ماں بہنوں کی طرح کپڑے پہنو۔ میرے دل میں ان کے ایمان کی، ستر پوشی کی بات گھر کر گئی اور میں سوچنے لگی کہ کیسا اچھا ایمان ہے ان کا، اور ان کے یہاں کس قدر عورت کی عزت کی جاتی ہے اور ان ورکرز کے ایمان کے اندر آنے کے لیے میرا دل بے قرار ہو گیا۔ اگلے دن میں نے کہا کہ بھائی میں

تمھارے ایمان میں آنا چاہتی ہوں، مجھے کیا کرنا ہوگا؟ بولے: ایک کلمہ ہے، وہ پڑھنا ہوگا۔ میں نے کہا: جلدی مجھے پڑھاؤ۔ بولے کہ ہم نہیں پڑھا سکتے، ہمارے بابا پڑھائیں گے۔ اور وہ فلاں دن آتے ہیں۔ اب مجھے اس فلاں دن کا بے قراری سے انتظار رہنے لگا۔ خدا خدا کرکے وہ دن آ گیا۔ ایک لمبا سا چوغا اور طرح طرح کی گلے میں مالائیں پہنے اور ہری ٹوپی پہنے بابا کارخانے میں تشریف لائے اور انھوں نے رومال پکڑوا کر کہلوایا: صلی علیک یا محمد۔ یا اللہ۔ یا محمد۔ یا علی المدد۔ کرمدد۔ یہ اس زمانے کا میرا ایمان تھا۔ جیسے کہا، جو بتایا، میں نے کہا اور پڑھا اور بہت زمانے تک ہر وقت یہ ورد کرتی رہی اور پھر مجھے بتایا گیا کہ قبروں پر جانا ہے، میں ان بابا کی مرید بن گئی۔ اور میں نے ہندوستان کے بڑے بڑے مزاروں پر حاضری دی اور جیسا وہاں ہوتے دیکھا، ویسے کرتی رہی۔

ادھر میں نے ساڑی کی جگہ سوٹ پہننا شروع کیا اور خود کپڑے ڈیزائن کرنا شروع کیے اور میرے ڈیزائن ڈریس کی بہت قیمت لگی۔ میں نے الگ سے مشین خریدی اور خود ڈیزائن کرکے ڈریس تیار کی اور بازار میں فروخت کی، میرا کاروبار چل نکلا۔ 1986ء میں او کھلا فیز۔ ۲ میں، میں نے اپنے کارخانے کی بنیاد ڈالی اور الگ سے مسلم ورکرز رکھے۔ مجھے کمانے کی دھن لگ گئی اور اللہ نے قابل بنا دیا کہ نہرو نگر، نئی دہلی میں ۳ منزلہ ایک پورا کیمپس خرید لیا۔ ہاں ایک

اور بات یاد آئی۔ جب میں کارخانے میں کام کرتی تھی، بابا کو خانقاہ کی ضرورت تھی، میری ماں نے میرے نام ایک دکان کر دی تھی، وہی ان کی کل جائداد تھی۔ بابا کو خانقاہ کے لیے زمین کی ضرورت تھی۔ میں نے اپنی ماں سے کہا: وہ دکان کے کاغذات دے دو مجھے ایک مکان خریدنا ہے۔ میں نے ماں سے جھوٹ بولا، ورنہ ماں بھی کاغذ نہ دیتی۔ میں نے کاغذات لے کر وہ دکان اس زمانے میں 12 ہزار کی فروخت کردی۔ ۱۱ ہزار ان بابا کو خانقاہ کے لیے دے دیے۔ ایک ہزار خود رکھے، اس وقت سروس کرتی تھی۔ 250 روپے تنخواہ، تین بچے اور خود اور مکان کا کرایہ، ایک ہزار کرایہ جمع کیا اور دلی کورٹ پٹیالہ ہاؤس میں جا کر باقی پیسے سے اسلام قبول کرنے کی کارروائی پوری کی۔ بس اس وقت اللہ کے نام پر دینے کی دھن سوار تھی۔ میں چاہتی تھی کہ کماؤں اور اللہ کے لیے لٹاؤں، مجھے کمانے کی دھن لگ گئی۔ نہرو نگر میں اللہ نے جائداد دلوا دی۔ وہاں جو ورکرز کام کرتے تھے، وہ نماز نہ پڑھتے تھے، البتہ نماز کے بہانے جاتے اور باہر جا کر پکچر دیکھنے چلے جاتے اور میں نمازیوں کو ہی کام دیتی تھی۔ مگر ورکر چالاکی کرتے۔ میں نے سوچا، مجھے ایسی جگہ کارخانے کی تلاش کرنی چاہیے، جہاں مسجد کارخانے سے ملی ہوئی ہو، تب میں نے حاجی کالونی، غفور نگر (جامعہ نگر، دہلی۔) میں زمین خریدی اور کارخانہ ادھر شفٹ کیا، لیکن ادھر چونکہ میں اکیلی کام کرتی تھی اور مسلم ایریا میں مسجد کی وجہ سے شفٹ ہوئی تھی، تاکہ ورکر نماز ضرور پڑھیں اور دیر تک غائب بھی نہ ہوں کہ کارخانے میں کام

کا نقصان نہ ہو، لیکن ادھر کے مسلمانوں نے مجھے بہت تنگ کیا کہ یہ کیسے مسلمان بنی ہے، لڑکوں سے کام کراتی ہے، طرح طرح کی باتیں ... میرا ذہن پریشان ہو گیا، حتیٰ کہ میرا کارخانہ ٹھپ ہونے لگا اور میں بچوں کے پاس نہرو نگر چلی گئی۔ کام بالکل بند ہو گیا۔ میں غریبی میں چلی گئی، فاقے ہونے لگے، میں نے کترن بیچنا شروع کی اور پھر کچھ سہارا شروع ہوا۔ پھر کچھ اور اچھی مسلمان بہنیں ملیں۔ انھوں نے سہارا دیا، اسی طرح مولوی ذوالفقار صاحب نے میری بڑی رہنمائی کی۔ انھوں نے مجھے اپنی ماں بنالیا اور حقیقی ماں کی طرح میرا خیال رکھنے لگا۔ میں نے حاجی کالونی (جامعہ نگر، نئی دہلی) میں پھر کارخانہ شروع کیا۔ اور نائٹی، ٹاپ اور پٹیالیہ شلوار کی ڈیزائننگ کرکے مارکیٹ میں فروخت کرنا شروع کر دی اور یہاں بھی میں نے عمارت بنالی اور خود بھی ادھر ہی شفٹ ہو گئی اور تب میں نے جانا کہ جس اسلام پر میں چلتی ہوں، قبر پرستی، وہ صحیح نہیں۔ کلمہ صحیح کیا ہے، اب معلوم ہوا۔ نماز یہاں آکر سیکھی، قرآن کریم پڑھا، تبلیغی جماعت کی بہنوں سے میل جول پیدا کیا۔ میں نے جب نماز سیکھی اور اس کو ادا کیا تو سمجھ میں آیا کہ حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''نماز مومن کی معراج ہے'' کا کیا مطلب ہے، نماز واقعی معراج ہے۔

رمضان المبارک کا مہینہ تھا۔ میں روزے برابر رکھتی رہی، نمازیں بھی ادا

کرتی، لیکن نماز کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکتی تھی۔ مجھے شوگر ہو گئی اور گھٹنوں نے کام کرنا بند کر دیا۔ جہاں میں رہتی ہوں، وہاں میرے ایسے پورشن ہیں کہ باآسانی کرائے دار بھی رکھتی ہوں۔ لیلۃ القدر آ گئی، سب لوگ کھڑے ہو کر نوافل میں مصروف تھے۔ میں بھی اس رات جاگ رہی تھی۔ پیروں کے درد کی وجہ سے اٹھ نہ سکتی تھی۔ کسی مسلم بہن نے بھی مجھے اس رات کے بارے میں کچھ خاص نہ بتایا۔ اور میرا دل پھٹا جا رہا تھا کہ کوئی آئے، مجھے تسلی دے، اس رات کی عظمت کے بارے میں بتائے۔ میں ایسے میں کیسے عبادت کروں، کوئی میری مدد کرے۔ پھر بے بسی کی کیفیت طاری ہوئی۔ میں بیٹھے بیٹھے سجدے میں جا گری اور اسی طرح مالک کے سامنے آہ و فغاں کی، تڑپ تڑپ کر روئی، روتے روتے زور زور سے میری چیخیں لگ گئیں۔ مجھے کچھ ہوش نہ رہا، بس اللہ اور میں فریادی! میری یہ بے بسی کہ عبادت اور نماز بھی کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکوں، اس کا احساس ہوا کہ یکایک مجھے لگا، میں کھڑی ہو سکتی ہوں اور میں سیدھی کھڑی ہو گئی اور اس رات میں نے کھڑے ہو کر خوب نماز ادا کی اور میں جو چلنے پھرنے سے معذور تھی، چلنے پھرنے لگی اور کئی سال تک میں ایسی رہی کہ مجھے کوئی بیماری نہیں تھی، میری شوگر بھی ختم ہو گئی۔ ہم بہت نکمے ہیں، پھر دنیا داری میں پھنس گئی اور پھر وہی بیماری۔

میں نے ''فضائل اعمال'' پڑھنا شروع کی۔ جب میں نے یہ پڑھا کہ جس کا بیٹا

حافظ قرآن ہو گا، آخرت میں اس بیٹے کی ماں کو تاج پہنایا جائے گا۔ میں تڑپ گئی کہ یا اللہ! اب میں کیا کروں! میرے دو بیٹے ہیں، ان کی شادی ہو چکی، بچے بھی ہو گئے، کیونکہ میں بس صلی علیک یا محمد، المدد، کرمدد اور قبروں پر جانے کو مسلمان ہونا سمجھتی تھی، بس خود ہی مسلمان بنی رہی، لڑکے خاندانی حالت پر ہیں، ان کی شادی میں نے ہندو لڑکی سے کی اور مجھے پھر اس نعمت سے محرومی نے دکھی کر دیا۔ میں زار و قطار روئی کہ سب حافظوں کی ماؤں کو تاج پہنایا جائے گا، میرے لیے کوئی تاج نہ ہو گا۔ میرا کوئی بیٹا حافظ نہیں۔ ایک پڑوسن دین دار تھیں، میرے ہر وقت کے رونے کو دیکھ کر کہنے لگیں کہ تم میرے بیٹے کو پڑھا لو، حافظ بنا لو۔ دوسروں نے کہا کہ کوئی غریب بچہ پڑھا لو۔ میں نے غریب بچے کی تلاش شروع کر دی۔ ایک بچہ جس کا نام احتشام تھا، اس کو پڑھانے کے لیے سہارن پور مدرسہ سوکڑی میں چھوڑا اور وہ الحمد للہ حفظ کر رہا ہے، پھر مجھے لوگوں نے کہا: ایسے تاج نہیں پہنایا جائے گا۔ آپ بن ماں باپ کا بچہ تلاش کرو۔ اس کو حفظ کراؤ۔ اب میں اور رونے لگی اور لگتا تھا کہ روتے روتے جان چلی جائے گی کہ ہائے محرومی! مجھے تاج نہ پہنایا جائے گا۔ اب میں نے کسی ہندو غریب کی جھگی جھونپڑی میں تلاش شروع کر دی۔ ایک بچہ اللہ نے مجھے ملایا، جو بن ماں باپ کا ہے، عبد اللہ اس کا نام رکھا۔ اسے رائے پور سہارن پور کی طرف لے کر گئی اور اسے پڑھا رہی ہوں۔ ماشاء اللہ اس کا 12 واں پارہ ہے، رائے پور میں پڑھ رہا ہے۔ دونوں بچوں کے

لیے کپڑا خرچ وغیرہ لے کر جاتی ہوں۔ میرا پوتا میرے پاس رہتا ہے۔ ?? سال کا ہے۔ اسے حوض والی مسجد میں بھیجا ہوا ہے، امن نام ہے، دعا کیجیے کہ وہ بھی حافظ ہو جائے، آمین! ''فضائل اعمال'' میں پڑھا کہ سود خور کے ساتھ یہ معاملہ ہوگا کہ اس کے پیٹ میں سانپ بچھو ہوں گے۔ ہمارے یہاں ہفتے میں اجتماع ہوتا ہے اور میں پنجاب وغیرہ بھی جاتی ہوں۔ وہاں ہندو بہنیں میرا وعظ سنتی ہیں۔ جالندھر میں میں نے جب یہ سود والی حدیث سنائی تو ہندو ہوتے ہوئے بھی سب نے یقین کرکے وہاں سود لینا دینا چھوڑ دیا، اور وہ بے چین رہتی ہیں کہ اپنے دھرم کی اور بات بتاؤ۔ لوگ پیاسے ہیں، مجھے تو کچھ زیادہ معلومات نہیں، بس قرآن (ہندی ترجمہ) اور ''فضائل اعمال'' پڑھی ہے۔ مسلمان اگر آگے آئیں تو لوگ پیاسے کھڑے ہیں۔ ذرا سے اشارے کی دیر ہے، دامن اسلام میں آ جائیں گے۔

میرے شوہر نے 25 سال سے میرا اور میرے بچوں کا کوئی خرچ نہیں اٹھایا۔ اب وہ پچھلے دنوں ریٹائر ہوئے اور انھوں نے فنڈ کے پیسے سے ایک فلیٹ خریدا اور حالات کچھ ایسے بنے کہ وہ فلیٹ انھیں گروی رکھنا پڑا۔ ناچار میرے نہرو نگر والے فلیٹ میں جہاں میرے دونوں لڑکے اپنی فیملی کے ساتھ رہتے ہیں، ان کو آنا پڑا۔ میں برابر سب رشتے داروں سے ملتی ہوں، جب کچھ دن باپ کو بیٹے اور بہو کے پاس رہتے ہو گئے تو بڑی بہو نے انہیں باہر کر دیا۔ اب یہ دوسرے بیٹے کے گھر میں گئے۔ دیکھتی کیا ہوں کہ ایک دن میری بڑی بہو ان کو کھانا ایسے

دیتی ہے، جیسے کسی کتے کو ڈالتے ہیں۔ میں نے کہا: تم اس طرح سلوک کرتی ہو، اس طرح تو لوگ کسی کتے کو بھی نہیں دیتے ہیں۔

خیر میں حسب معمول خرچہ دینے کے لیے رائے پور حفظ کرنے والے بچے کے پاس گئی تو وہاں جامعہ اسلامیہ دہلی کا ایک بچہ گیا، وہ وہاں حفظ کر رہا ہے، رائے پور میں رہتا ہے۔ اللہ نے اسے دین پر لگا دیا ہے۔ وہ بولا: ماں جی! مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔ میری سب کہانی کا حال اس نو مسلم بچے نے اسے بتا دیا ہو گا۔ بولا: آپ کے شوہر ہندو ہیں، آپ پر فرض ہے کہ آپ اپنے شوہر کو دین کی دعوت دیں۔ مجھے ان کے سلوک کی وجہ سے ان کے ساتھ کوئی تعلق محسوس نہ ہوتا تھا۔ میں نے کہا کہ بیٹے، وہ تو بہت بڑے شرابی ہیں، شراب کے بغیر رہ ہی نہیں سکتے۔ وہ بچہ بولا کہ اماں، اگر آپ کو شراب کا گلاس بھر کر بھی دین کی دعوت دینی پڑے، تب بھی آپ دین کی دعوت دیں۔ یہ دعوت دینا بہت ضروری ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ ضرور ایمان لے آئیں گے۔ آپ ایسے بھی جذبے والی ہیں۔ آپ یہ کام ہر حال میں کریں، اب میں گھر آ گئی۔ میں نے فون اٹھایا، ادھر سے فون انھوں نے اٹھایا، مگر میں کچھ ہمت نہ کر سکی۔ عجیب شرم محسوس ہوئی، مگر دل ہی دل میں اللہ سے گڑگڑاتی: اے اللہ، تو انھیں ایمان کی دعوت دینے کی مجھے ہمت عطا کر۔ میری بہن ہندو ہے، مگر سب کلمہ ورد جانتی ہے۔ وہ بھی بہنوئی کی ایسی درگت سے دکھی تھی۔ وہ روز کہتی کہ تو مسلمان بن

جا، تیری زندگی بن جائے گی۔ دیکھ میری بہن کی مسلمان بننے سے کیسی زندگی بنی ہوئی ہے۔ روز روز کہتی رہی۔ ایک دن دیکھتی کیا ہوں کہ زبردستی میرے شوہر کو میرے گھر لے آئی۔ میں ناراض ہوئی کہ تو اس ہندو شرابی کو کیوں لے کر آئی ہے؟ وہ بولی: یہ مسلمان بننے کو تیار ہے۔ غفار منزل کی مسجد میں صبح 10 بجے کسی مولوی صاحب کا بیان تھا۔ ان کو وہاں لے گئی اور وہاں پر مولوی صاحب نے ان کو کلمہ پڑھایا، پھر نکاح پڑھایا۔ وہ نکاح پڑھا کر جانے لگے، میں روٹھی روٹھی تھی، میرے بیٹے ذوالفقار نے ان سے کہا: میری جمیلہ ماں کو سمجھایئے کہ پردہ کیے بیٹھی ہیں۔ پردہ چھوڑیں اور ناراضگی بھی ختم کریں۔ مولوی صاحب نے مجھے سمجھایا، میری سمجھ میں بات آ گئی۔ مگر 25 سال سے الگ رہ رہی تھی، عجیب سا حجاب آتا ہے، ویسے جتنا کچھ ہو رہا ہے، خدمت کر رہی ہوں۔ آج ۲۲ دن ہو گئے انھوں نے شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا۔

میرے دونوں لڑکے اگرچہ ہندو ہیں، لیکن بسم اللہ، الحمد للہ سب پڑھتے ہیں۔ بڑی بہو تو کٹر ہے، لیکن چھوٹی بہو بہت نرم دل ہے۔ چھوٹا بیٹا میرے ساتھ کام کرتا ہے، بلکہ اب فیکٹری، دکان سب کچھ وہی سنبھالتا ہے۔ بس بہو سے ڈرتا ہے۔ مجھے ان کو اسلام کی دعوت دینا ہے۔ ویسے میرا یہ منہ بولا بیٹا ذوالفقار اور بہو مثالی بہو بیٹے ہیں۔ میں ان کے ساتھ حج بھی کر چکی ہوں۔

ایک مرتبہ میں نے خواب دیکھا کہ میرا ایک کمرہ ہے، جو بے حد حسین اور طوطیا رنگ کا ہے، اس کے رنگ کا حسن بیان سے باہر ہے۔ وہاں میں اور ایک آدمی مسجد میں پڑے ہوئے ہیں۔ بے حد حسین، ناقابل بیان عورتیں، ہیرے جواہرات، زمرد، موتیوں کے تھال لیے بیٹھی ہوئی ہیں۔ دوسرا خواب کہ میں لاانتہا اونچائی پر کھڑی ہوں، بے حد سفید لباس میں اور میرے چاروں طرف بے حد سفید لباس ہیں اور بے حد شفاف پانی ہے۔ میری آنکھ کھل گئی۔ تعبیر تو اللہ جانتا ہے، کیا ہے، مگر بے حد سکون محسوس ہوتا ہے۔ ایک بار دیکھا کہ چٹیل میدان ہے، میں اور میرا پوتا امن میرے ساتھ ہے کہ زبردست زلزلہ آیا، بڑا خوف ناک، میں الحمد شریف پڑھنے لگی ہوں کہ ایک دم زلزلہ الحمد پڑھنے سے رک جاتا ہے۔

مسلمانوں کے لیے میرا پیغام ہے کہ ایک دوسرے کی خیر خواہی کریں، ہندوؤں سے میل جول رکھیں۔ یہ دوریوں کی سرحدیں گرائیں۔ ہندو قوم اسلام دھرم (مذہب) کے بارے میں جاننے کو بے چین اور متجسس رہتی ہے۔ قریب آئیں، ان شاء اللہ لوگ جوق در جوق اسلام میں کھنچے چلے آئیں گے۔

ظہور مہدی سے قبل کے رمضان میں ظہور پذیر ہونے والی چند نشانیاں

امیر عالم

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت آنے والے ہر قسم کے فتنوں کے بارے میں نہ صرف خبردار کیا بلکہ مستقبل میں رونما ہونے والے اہم واقعات کے بارے میں بھی آگاہ کیا ہے۔ خاص کر ظہورِ امام مہدی اور خروج دجال سے متعلق احوال و واقعات کو تفصیلاً بیان کیا ہے۔ یہاں تک کہ حق و باطل کے ان دونوں اماموں (یعنی حق کے امام حضرت مہدی اور کفر کے امام دجال) کے ظہور و خروج سے ماقبل کے حالات کو بھی قدرت تفصیل سے بیان کیا ہے اور کچھ نشانیاں خصوصی طور سے بیان کی ہیں تاکہ کسی ان پڑھ جاہل مسلمان کو بھی حق و باطل کی پہچان میں کسی شک و شبہ نہ رہے۔

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ اجمعین اور سلف و صالحین کی یہ عادت تھی کہ وہ اس معاملے میں (یعنی ظہورِ امام مہدی اور خروج دجال کے معاملے میں) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمودات کو ہمیشہ مستحضر رکھتے اور اگر اس حوالے سے ایسی کوئی چیز اپنے گرد و پیش میں پاتے تو اس کو رسول اللہ کے بیان کردہ نشانیوں اور احوال کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کرتے اور تاکہ ایسی کسی بھی حقیقت کا سامنا ہونے کی صورت میں کوئی تردد باقی نہ رہے۔

صحیح احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ مدینہ میں ایک یہودی کے ہاں پیدا ہونے والے بچے کے بارے میں ابن صیاد کے حوالے سے میں کئی صحابہ کرام کا یہ تجسس رہا کہ کہیں یہ دجال تو نہیں ہے؟اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو نشانیاں دجال کے حوالے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتائی گئی تھی اس کی بنیاد پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ابن صیاد میں موجود صفات کی وجہ سے فکر مند رہے کہ کہیں یہ وہی دجال تو نہیں۔

اسی طرح حضرت مہدی کے ظہور سے متعلق بیان کی گئی احادیث کے بارے میں سلف کا یہ طریقہ چلا آرہا ہے کہ وہ اس کے متعلق نشانیوں کو ہمیشہ اپنے سامنے رکھتے ہیں،تاکہ حضرت مہدی کے ظہور کے وقت حق وباطل کے درمیان ہونے والے معرکے میں وہ حق کے ساتھ کھڑے ہوں اور باطل ان کو دھوکہ نہ دے سکے۔

حضرت مہدی کے ظہور سے ماقبل، قریب ترین نشانیوں میں سے ایک رمضان المبارک میں ایک زور دار آواز کا سنائی دینا ہے چاہے وہ چیخ کی صورت میں ہو یا دھماکہ کی صورت میں اور یہ ہوگا نصف رمضان کی رات یعنی پندھرویں شب کو اور وہ جمعہ کی بھی شب ہوگی۔اسی طرح اس رمضان میں سورج گرہن کا ہونا،آسمان پر ستون کی مانند کسی چیز کا روشن ہونااور سب سے بڑھ کراس رمضان میں ملک شام میں سفیانی کی جانب سے مسلمانوں کا قتل عام کرنا وغیرہ۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس رمضان المبارک میں دنیاکے اکثر علاقوں بشمول حرمین شریفین سمیت جمعہ کی شب پندرھویں شب ہوگی۔یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ یہ پہلا موقع نہیں کہ رمضان المبارک میں جمعہ کی شب میں پندھرویں شب ہو اور یہ بات بھی ذہن میں رہے کہ کہ کسی بھی ایسے اتفاق کے بارے میں حتمی طور پر نہیں کہاجاسکتا کہ یہ وہی رمضان المبارک ہے جب تک کہ وہ واقعہ ظہور نہ ہوجائے اور آگے آنے والے نشانیاں بھی (جو کہ احادیث میں بیان کردی گئی ہیں) اس کی تصدیق نہ کردیں۔ رمضان المبارک کی ان نشانیوں سے متعلق گوکہ احادیث ضعیف ہیں مگران کی تعداد کثیر ہے اور چونکہ یہ احادیث کسی عقیدے اور شرعی مسئلہ سے متعلق بحث نہیں کرتی، صرف ان میں واقعات سے متعلق "خبر" ہے لہٰذا ایسے کسی بھی موقع پر ہمیں ان احادیث کو پیش نظر رکھنا چاہیے اور اگر اس سے مشابہ کسی واقعہ کا ظہور ہو جائے تو اس سلسلے میں علماء کرام اور اہل علم پر لازم ہوگا کہ اصل حقیقت کو جانیں اور امت کی صحیح رہنمائی کریں۔اس واقعہ سے متعلق احادیث درج ذیل ہیں:

رمضان میں چیخ یا دھماکہ سنائی دینا :

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رمضان میں ایک زبردست آواز آئے گی۔ صحابی نے پوچھا "یارسول اللہ! یہ آواز رمضان کے شروع میں ہوگی، یا درمیان میں یا آخر میں؟" آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا 'نصف رمضان میں۔ جب نصف رمضان میں جمعہ کی رات ہوگی تو آسمان سے ایک (زوردار) آواز آئے گی جس سے ستر ہزار (یعنی بے شمار) لوگ بے ہوش ہوجائیں گے اور ستر ہزار اندھے ہوجائیں گے اور ستر ہزار بہرے ہوجائیں گے (ایک اور روایت کے مطابق" ستر ہزار راستہ بھٹک جائیں گے اور ستر ہزار لڑکیوں کی بکارت زائل ہوجائی گی۔" (بحوالہ السنن الوارد الفتن)۔ صحابہ اکرام رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا کہ" یارسول اللہ! تو آپ کی امت میں سے اس آواز سے محفوظ کون رہےگا؟" آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا" جو (اس وقت) اپنے گھروں میں رہے اور سجدوں میں گر کر پناہ مانگے اور زور زور سے تکبیریں کہے، پھر اس کے بعد ایک اور آواز آئے گی۔ پہلی آواز جبرئیل کی ہوگی اور دوسری آواز شیطان کی ہوگی۔ (پھر فرمایا کہ واقعات کی ترتیب یہ ہوگی کہ) آواز رمضان میں ہوگی اور "معمعۃ" (دراصل جنگ کی گھن گرج یا شور شرابہ ہوگا جو کہ) شوال کے مہینے میں ہوگی اور ذی قعدہ میں قبائل عرب بغاوت کریں گے اور ذی الحجہ میں حاجیوں کو لوٹا جائے گا۔ رہا محرم کا مہینہ تو محرم کا ابتدائی حصہ میری امت کے لئے آزمائش ہے اور اس کا آخری حصہ میری امت کے لئے نجات ہے۔ اس دن وہ سواری مع کجاوے کے جس پر سوار ہو کر مسلمان نجات پائے گا، اس کے لئے ایک لاکھ

سے زیادہ قیمت والے اس مکان سے بہتر ہوگی جہاں کھیل و تفریح کا سامان ہو" (المعجم الکبیر للطبرانی ج ۱۳ص ۱۷۲ رقم: ۵۲۴۷واسنادہ فیہ کلام

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رمضان میں آواز ہوگی اور ذی قعدہ میں قبائل کی بغاوت ہوگی اور ذی الحجہ میں حاجیوں کو لوٹا جائے گا"۔ (مجمع الزوائد ج ۷ص ۳۱۰

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "رمضان میں ایک آواز سنائی دے گی، شوال میں شور شرابہ ہوگا اور ذی قعدہ میں قبائل کی باہمی کشمکش، اس سال حاجیوں کو لوٹا جائے گا اور منیٰ میں بڑا کشت و خون ہوگا، بہت سے لوگ قتل ہوجائیں گے، وہاں اس وقت خونریزی ہوگی جبکہ وہ جمرہ عقبہ میں ہوں گے"۔ (الفتن نعیم بن حماد ج اص ۱۳۱)

رمضان میں ایک آواز سنائی دے گی، شوال میں شور شرابہ ہوگا اور ذی قعدہ میں" قبائل کی باہمی کشمکش، اس سال حاجیوں کو لوٹا جائے گا اور محرم میں ایک نداء دینے والا آسمان سے نداء دے گا کہ جان لو یہ (مہدی) اللہ کا خلیفہ ہے اس کی سنو اور اطاعت کرو"۔ (الفتن نعیم بن حماد ج اص ۱۳۱

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ "
وسلم نے فرمایا: اگر رمضان میں چیخ سنائی دے گی تو شوال میں شور شرابہ ہوگا !اور ذی
قعدہ میں قبائل کی بغاوت ہوگی اور ذی الحجہ میں خون بہے گا اور محرم کا مہینہ تو کیا ہی
مہینہ ہوگا۔۔۔ہم نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ! یہ چیخ کیسی ہوگی ؟آپ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: پندرہ (۱۵) رمضان المبارک جمعہ کی رات کو ایک چیخ (یا
دھماکہ) ہوگا جو سونے والوں بیدار کردے گا، کھڑے ہونے والوں کو بٹھادے گا
شریف زادیاں اپنی خلوت گاہوں سے جمعہ کی رات کو نکل آئیں گی۔اس سال زلزلے،
کثرت سے آئیں گے۔جب تم جمعہ کے دن فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنے گھروں میں داخل
ہو کر دروازے اور کھڑکیاں بند کرلینا، اپنی چادریں اوڑھ لینا، اپنے کان بند کرلینا، اور
جب تمہیں چیخ کا احساس ہو تو اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوجانا اور یہ پڑھنا "سبحان القدوس
پاک ہے وہ ذات جو نقائص سے پاک ہے)"ربنا القدوس" (ہمارا رب جو نقائص سے) "
پاک ہے) تو جو ایسا کرے گا وہ نجات پائے گا اور جو ایسا نہیں کرے گا وہ ہلاک ہوجائے
گا"۔(الفتن نعیم بن حماد ج ا ص ۱۳۲)

: رمضان میں روشن ستون کا ظاہر ہونا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رمضان میں آسمان پر چمکتے ستون کی مانند"
ایک علامت ظاہر ہوگی، شوال میں بلائیں ہوں گی اور ذی قعدہ میں

ہلاکت اور ذی الحجہ میں حاجیوں کو لوٹا جائے گا۔ محرم کا مہینہ تو کیا بات ہے محرم کے مہینے کی" (الفتن نعیم بن حماد ج ا ص ۱۳۱

اس حوالے سے بہت ساری روایات اور بھی آئی ہیں۔

: رمضان میں خلاف توقع سورج گرہن کا ہونا

محمد بن علی رحمہ اللہ کا قول ہے کہ ہمارے مہدی دو نشانیاں ہیں جو زمین و آسمان کی" تخلیق سے لے کر آج تک نظر نہیں آئیں۔ رمضان کی پہلی رات چاند کو گرہن لگے گا اور پندرہ رمضان کو شورج کو گرہن لگے گا۔ جب سے اللہ نے زمین و آسمان کو پیدا کیا ایسا نہیں ہوا"۔ (سنن الدار قطنی ج ۵ ص ۱۱ رقم: ۱۸۱۶

یہ بات حقیقت ہے کہ سورج گرہن ہمیشہ چاند کی شروع کی تاریخوں میں ہوتا ہے جبکہ چاند گرہن ہمیشہ ایام بیض یعنی ۱۴، ۱۳اور ۱۵تاریخ کو ہوتا ہے لیکن ظہور مہدی سے ماقبل رمضان میں یہ ترتیب بدل جائے گی۔

: ظہور مہدی سے قبل سفیانی کا خروج اور اہل شام کا قتل عام

امام زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ تمہیں سفیانی کے خروج کے دوران آسمانی علامت" نظر آئے گی"۔ (الفتن نعیم بن حماد ج ا ص ۱۳۱

ولید سے روایت ہے کہ (آخر زمانے میں سفیانی کے ہاتھوں) ہم اہل دمشق پر رمضان" کے دنوں میں مصائب کے پہاڑ ٹوٹتے دیکھے گے۔ پس لوگوں کی کثیر تعداد رمضان کے مہینے میں ہلاک ہوگی"۔ "دمشق کی طرف اس (سفیانی) کا ظہور ہوگا اس کے ساتھ قبیلہ کلب کے لوگوں کی اکثریت ہوگی۔ لوگوں کا خون بہانا اس کی خاص عادت ہوگی یہاں تک کہ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کرکے بچوں کو ہلاک کردیا جائے گا، وہ جب حضرت مہدی کے خروج کی خبر سنے گا تو ان سے جنگ کرنے کے لئے لشکر بھیجے گا"۔ (شرح مشکوۃ مظاہر حق جدید، ج ۵، ص ۴۳ واسنادہ صحیح)

ان روایات کے علاوہ بھی ظہور مہدی سے قبل رمضان المبارک میں مختلف نشانیوں سے متعلق کثیر روایات آئی ہیں جو کہ ہمیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں، لہٰذا اسلامی ملک شام میں مسلمانوں کا قتل عام کس بات کی طرف اشارہ کررہا ہے؟ شام کے موجودہ صدر کا قبیلہ کلب سے تعلق رکھنا کیا معنی رکھتا ہے؟ کیا سفیانی کا ظہور ہوچکا ہے؟

اس حوالے سے قطعی طور پر کوئی بات نہیں کہی جاسکتی کیونکہ اصل معاملہ تو اللہ علیم و خبیر کے ہی علم میں ہے۔ بحرحال علمائے کرام کو اور خاص کر احادیث کا علم رکھنے والے اہل علم کو ان واقعات کی طرف توجہ کرنی چاہیے اور آنے والے حالات پر بھی گہری نظر رکھنی چاہیے تاکہ یہ امت مسلمہ باطل کی ہمنوائی

سے بچ سکے اور حق کو پہچان سکے۔

: نوٹ:اس مضمون کی تیاری میں ان کتب سے رہنمائی لی گئی

تیسری جنگ عظیم اور دجال۔۔۔ مولانا عاصم عمر حفظہ اللہ (۱)

(ہر مجدون۔۔۔الاستاذ جمال الدین الامین (جامعہ الازہر، مصر (۲)

جب احساس ہی مر جائے

عید نام ہے خوشی کا، اللہ تعالیٰ کے انعام کا.... اس دن حسب استطاعت اچھے کھانے پہننے اور خوشی کے اظہار کا حکم ہے، یہی وجہ ہے کہ اس دن کا روزہ رکھنا حرام ہے، یہ سب بجا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ خوشی کا تعلق دل سے ہے، یہ دل سے پھوٹتی ہے تو چہرے دمک اٹھتے ہیں، مگر جب دل میں خوشی کی رمق نہ ہو تو مصنوعی غازے اور سرخی بھی چہرے پر دمک نہیں لا سکتے۔ کئی سالوں سے عید خصوصاً میٹھی عید خوشی کی نوید نہیں بلکہ غم والم کے نوحے سناتی آتی ہے۔ شریعت کی اتباع میں ہم نئے کپڑے بھی پہنتے ہیں اور اچھے کھانے بھی لیکن جب دل اداس ہو تو سب کچھ بجھا بجھا سا لگتا ہے۔ پچھلا رمضان اور عید اہل کراچی کو بھولی نہ ہوگی.... اور خاص وہ لوگ تو اسے کیسے بھول سکتے ہیں کہ جن کے لعل اور سر کے تاج عین ماہِ رمضان میں درندگی اور بہیمیت کی نذر ہو گئے.... کیسے لرزہ خیز ایام تھے وہ، ایک طرف روزے، تراویح اور قرآن کی بہاریں تھیں تو دوسری طرف قومیت کے نام پر خون، تشدد اور سر کٹی بوری بند لاشیں تھیں۔ جن کے گھر اس شیطنت میں اجڑ گئے، عید کا سورج تو ان کے سر پر بھی چمکا ہو گا لیکن ....

اس بار اللہ کا لاکھ لاکھ فضل و احسان رہا کہ پچھلی بار کی بانسبت اس بار

ماہ رمضان خیر و عافیت سے گزرتا رہا۔ گو قومیت اور لسانیت کا ناگ گاہے گاہے پھنکارتا رہا لیکن دن میں دو تین ٹارگٹ قتل تو اب معمول کی سی بات لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی کو میرے اس جملہ میں بے حسی اور سنگ دلی کی بو آئے لیکن اول تو وہ اس شہر ستم گر کا باسی نہیں ہو گا جس میں لہو کی قیمت سے زیادہ اب اس موبائل کی قیمت ہے، جس کو چھینتے ہوئے کسی اضطراری حرکت پر بے تکلف ایک جیتے جاگتے آدمی کو لہو میں نہلا دیا جاتا ہے.... دوم اس سے یہ نفسیاتی نکتہ او جھل ہو گا کہ زیادہ باخبری بھی بے حسی طاری کر دیتی ہے۔ پرنٹ و الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے خبروں کا ہجوم ایک انسان کو نارمل نہیں رہنے دیتا۔ اس لیے اندرون شہر کی خبریں پڑھ سن کر کراچی کے باسیوں کے نزدیک بہت سی خاص باتیں بھی اب عام ہو گئی ہیں ۔اور یہ ٹارگٹ کلنگ و غنڈہ گردی اہلیان کراچی کے روز مرہ میں شامل ہو گیا ہے، اسی لیے عموماً آنکھوں میں آنسو تب ہی آتے ہیں جب کوئی اپنا اس کا شکار ہو جاتا ہے!

اس کا مشاہدہ مجھے 28 رمضان کو ہوا، جب میں ایک جاننے والے کے گھر کسی کام سے گیا۔ ان کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہماری بات چیت چل رہی تھی کہ خبر آئی، نارتھ کراچی میں حالات اچانک خراب ہو گئے ہیں اور ایک مخصوص علاقے میں ٹارگٹ کلنگ میں پانچ نوجوان جاں بحق ہو گئے ہیں۔ اتفاق سے اسی خاص علاقے میں اس گھرانے کا ایک نوجوان کسی کام سے گیا ہوا تھا۔ گھر والوں کو فکر

لاحق ہوئی تو اس کا نمبر ملایا، مگر سیل خلاف معمول آف تھا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ کال کی تو بند.... گھر بھر میں تشویش کی لہر دوڑ گئی۔ پھر جس سے ملنے وہ نوجوان گیا تھا، اسے کال کی گئی تو یہ انکشاف ہوا کہ ابھی تک نوجوان ان کے پاس آیا ہی نہیں....

ساتھ ہی ان صاحب نے نصیحت بھی کر دی کہ حالات بہت کشیدہ ہیں، آج کوئی یہاں کا رخ نہ کرے۔ سب مزید گھبرا گئے۔ وہ بار بار کال ملاتے رہے لیکن فون بند ہونے کا میسج آتا رہا۔ پھر اگلے آدھے پون گھنٹے میں اس کے کئی دوستوں سے رابطہ کیا گیا، لیکن اس کا کچھ پتا نہ تھا۔

آخر گھر کی مستورات کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا اور نوجوان کی والدہ تو چیخ کر رونے لگیں جس کی وجہ سے مرد بھی گھبرا گئے۔ انہوں نے اندر جا کر تسلی دی، پھر بالآخر میں اور نوجوان کے دونوں بڑے بھائی متاثرہ علاقے میں جانے کا سوچ کر گھر سے نکلے۔ اتفاق دیکھیے کہ اسی وقت سامنے سے ان کا بھائی مسکراتا ہوا آ رہا تھا۔ اسے دیکھ کر بھائیوں کی سانس میں سانس آئی۔ معلوم ہوا کہ اسے کسی وجہ سے دیر ہو گئی تھی اس لیے وہ متاثرہ علاقے میں جا نہیں سکا تھا۔ فون چارج نہیں تھا اس لیے بند تھا۔ وہ لڑکا گھر گیا تو اس کی والدہ کافی دیر تک اس سے چمٹے روتی رہیں۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ سے سب کچھ معمول پر آ گیا۔ اندر ٹی وی سے شہر کی کشیدہ صورت حال مانیٹر کی جا رہی تھی۔ وہ

پانچ نوجوان جو عید سے دو دن پہلے دہشت گردی کا نشانہ بنا دیے گئے،ان کے بارے میں بتایا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے چینل بدل دیا اور اب شاید انڈیا کا کوئی چینل تھا جس کا اندازہ گانوں سے بخوبی ہو رہا تھا۔ میں گھر سے نکلا تو یہی سوچ رہا تھا کہ دس منٹ پہلے اس گھر میں رونا پیٹنا ہو رہا تھا مگر اپنے بچے کی خیریت معلوم ہونے کے بعد موسیقی اور ڈرامے سے یوں لطف اندوز ہوا جا رہا تھا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ چند کلومیٹر کے فاصلے پر کچھ کلمہ گو نوجوانوں کی ناگہانی موت پر ان کے گھر والوں پر کیا گزر رہی ہو گی، اس کا احساس کسی کو بھی نہیں تھا۔

میں نے سوچا کہ یہ چھوٹا سا ٹیسٹ کیس ہے، ساری امت مسلمہ پر طاری سفاکانہ بے حسی ماپنے کا.... پچھلے چند ماہ سے.برما کے مسلمانوں کو جس درندگی سے ذبح کیا جا رہا ہے، ان کے مال و متاع کو لوٹا جا رہا ہے،ان کے گھروں کو نذر آتش کیا جا رہا ہے اور ان کی عزتوں کو تار تار کیا جا رہا ہے.... یہ ہرگز کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے لیکن اجتماعی اور انفرادی طور پر بھی ہماری بے حسی کا یہ عالم ہے کہ یوں لگتا ہے کہ ہم نے انہیں جانوروں سے بھی کسی نچلی سطح پر سمجھ لیا ہے کیوں کہ آئے دن میڈیا پر جانوروں کے حقوق پر کوئی نہ کوئی خبر آتی رہتی ہے لیکن.برما کے مظلوم ہزاروں مسلمانوں کی جان و عزت شاید میڈیا کے نزدیک کسی خبر کا درجہ نہیں رکھتی۔میڈیا اور حکومت کو تو رہنے دیجیے ایک

عام پاکستانی کو بھی شاید اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ جہاں ایک طرف برمی مسلمان بھائی تاریخ کی بدترین خونریزی کا شکار ہو رہے ہیں تو دوسری طرف شام میں سرکاری فوج کے ہاتھوں شامی مسلمانوں پر بدترین تشدد کیا جا رہا ہے، ایک ایک دن میں ساٹھ ستر افراد کو نہایت بہیمانہ انداز میں پھانسی دی جا رہی ہے ! یہی نہیں اپنے ملک کا یہ حال ہے کہ انتیس رمضان المبارک کو جب وزیرستان میں عید منائی جا رہی تھی تو ایک ڈرون حملے نے ایک گھر کو مکینوں سمیت جلا کر راکھ کر دیا اور اسی دن کراچی میں 17 افراد دہشت گردی کا نشانہ بنا دیے گئے۔ یہ خاک و خون کے مناظر ایک طرف اور دوسری طرف منظر نامہ یہ ہے کہ ایک خبر کے مطابق اس بار رمضان میں عید کی تیاری کے سلسلے میں خرید و فروخت کا ریکارڈ ٹوٹ گیا ہے۔ ضروریات اور آسائشات سے بڑھ کر فضولیات اور نمود و نمائش کی اشیاء پر پانی کی طرح پیسہ بہایا گیا ہے۔
خوشی کا موقع ہو تو نہ خوشی منع ہے اور نہ خوشی کا اظہار لیکن گھر میں کوئی بیمار ہو یا اس سے بڑھ کر گھر میں موت ہو تو بہرحال خوشی اور غم کو اپنی حدود میں رکھنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہم اپنے پریشان حال مسلمان بھائیوں کی مدد نہیں کر سکتے، ان کے ساتھ کوئی مالی تعاون نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی خوشیوں میں، اپنی دعاؤں میں اپنے غم زدہ بھائیوں کو تو یاد رکھ سکتے ہیں کہ شاید اسی طرح باری تعالیٰ کی بارگاہ میں ہمارا عذر قبول ہو جائے ....

لیکن جب احساس ہی مر جائے تو اتنا بھی کون کرے!

اک عبرت اثر لطیفہ

پاکستان میں پرنٹ میڈیا دو واضح حصوں میں بٹا ہوا ہے.... یہ اردو اخبارات اور انگریزی اخبارات کا فرق ہے۔ آپ کو ایک خبر اردو اخبارات میں شہ سرخی میں ملے گی اور اس پر طویل تبصرے بھی کالم کی صورت ہوں گے ، لیکن یہی خبر انگریزی اخبارات میں سرسری نظر آئے گی اور اس پر تبصرے اگر ہوں گے بھی تو اردو اخبارات کے مقابلے میں بالکل دوسرا پہلو لیے ہوں گے۔ اسی طرح کئی خبریں انگریزی اخبارات میں تو نظر آئیں گی مگر اردو اخبارات میں نہایت سرسری اور بعض اوقات بالکل نظر نہیں آئیں گی۔ یوں لگتا ہے کہ زبان کی بنیاد پر یہ فرق جو دراصل موضوعات کا فرق، سوچ اور وژن کا فرق ہے، اپنی اپنی جگہ ایک خاص کلاس کی نمایندگی کرتا ہے، یعنی اردو اخبارات عوام کے لیے اور انگریزی اخبارات (ایک خاص انداز کے) خواص کے لیے ہوتے ہیں۔ اس تمہید کا مقصد بس یہ ہے کہ صحافت سے تعلق رکھنے والوں کو اپنے خاص شعبہ میں رہتے ہوئے اردو ، انگریزی پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور کمرشل میڈیا سب جگہ حسب توفیق چرناضرور چاہیے۔ یوں نہ صرف اپنے موضوع کی خبروں سے آدمی اپ ٹو ڈیٹ رہتا ہے بلکہ مختلف حلقہ فکر رکھنے والے لوگوں کی کسی خاص موضوع پر سوچ کا اندازہ بھی اسے بخوبی ہو جاتا ہے۔

تمہید طول پکڑتی جا رہی ہے، آج کا میرا موضوع صحافت اور میڈیا ہر گز نہیں.... بلکہ آج تو آپ کو ایک 'عبرت انگیز' لطیفہ سنانا ہے جو میں نے ایک انگریزی اخبار ایکسپریس ٹریبون کی ویب سائٹ پر ملاحظہ کیا، جسے پڑھ کر بے ساختہ ہنسی بھی آئی اور کچھ اپنے قابل وزیروں کی کارکردگی کا بھی معلوم ہوا۔

ہو سکتا ہے کہ آپ کو خبر کچھ خاص نہ لگے کیوں کہ پاکستان میں اس سے بھی زیادہ عبرت اثر لطیفے آئے دن سننے میں آتے رہتے ہیں.... کبھی پانی بطور ایندھن کی ساٹھ سالہ پرانی تھیوری کو نیا لباس پہنا کر اپنی تحقیق اور ایجاد باور کرانا اور پھر اس ایجاد کے ذریعے پانی سے کار بلکہ جہاز اڑانے کے اونچے اونچے بے بنیاد دعوے کرنے والے بڑے طمطراق کے ساتھ سامنے آتے ہیں تو کبھی کوئی اور نعرہ مستانہ بلند کر کے ملک و قوم کی قسمت راتوں رات بدلنے کا دعویٰ کرتا ہے.... بہرحال میڈیا کی بے مثال ترقی اور تیز ترین ذرائع کی وجہ سے اب کیسی بھی خبر ہو، زیادہ عرصہ تک چھپی ہوئی یا محدود نہیں رہ سکتی، حتیٰ کہ چوکس صحافی لوگوں کے بیڈ رومز ہی نہیں بیت الخلاء کی خبریں بھی نکال لاتے ہیں۔

لیجیے پھر بات کہاں سے کہاں نکل گئی، میں عرض کر رہا تھا کہ میں نے انٹرنیٹ پر جگالی کرتے ہوئے ایکسپریس ٹریبون پر یہ خبر دیکھی جو شائع تو جولائی

میں ہوئی تھی لیکن اپنی نظروں سے مہینہ بعد گزری۔ خبر کا موضوع صحت کے شعبے سے منسلک ایک خاتون وفاقی وزیر کی جعل سازی ختم کرنے کی وہ کوشش تھی جس نے خود ان کی قابلیت اور ان کی منسٹری کے ماتحت چلنے والے دواؤں کی ریگولیشن کے ادارے کی اہلیت کا پول کھول دیا۔ آپ حیران ہوں گے، کہ جعل سازی ختم کرنے کی جدوجہد تو بڑی اچھی بات ہے، اس میں قابلیت اور اہلیت کا سوال کہاں سے آگیا۔ تو جناب تھوڑا صبر کرکے خبر کے مندرجات اچھی طرح پڑھ لیجیے، پھر آپ کو سب لگ پتہ جائے گا۔

ہوا یوں کہ ہماری مذکورہ ہونہار وفاقی وزیر صاحبہ جب ضرورت سے فارغ ہونے کے لیے بیت الخلا تشریف لے گئیں تو انھوں نے اپنے فضلے میں ثابت دوا کی وہ گولی پائی، جو وہ ڈاکٹر کے نسخے کے مطابق لے رہی تھیں۔ یہ دیکھ کر انہیں نہایت تشویش ہوئی کہ یہ دوا کی گولی جو انہوں نے کھائی تھی، پورے نظام انہضام سے گزر کر کیسے ثابت نکل آئی؟ اس کا مطلب دو اور دو چار کی طرح یہی ہوا کہ اس گولی کے ساتھ کچھ مسئلہ ہے! اپنی منسٹری کے ماتحت چلنے والے دواؤں کی ریگولیشن کے ادارے اور شاید اس دوا کی "مستقل ضرورت" کی وجہ سے انہوں نے فوری تحقیقات کا حکم دے دیا۔ انہوں نے سوچا ہوگا کہ چلو اس بہانے غریبوں کا بھلا بھی ہو جائے اور اپنا بھی کچھ نام ہو جائے۔ فوراً ایک شکایت نامہ متعلقہ ادارے کو بھیجا گیا۔ کوالٹی کنٹرول کے چیئرمین ڈاکٹر

عبدالرشید نے ادویات کے نمونے لینے کے آرڈرز جاری کیے، جسے وصول کرتے ہی وفاقی ڈرگ انسپکٹرز کراچی اور اسلام آباد میں اس دوا کے سیمپل جمع کرنے دوڑے۔ اب آگے بڑھنے سے پہلے بارے کچھ اس مظلوم دوا کے پڑھ لیجیے۔اس دوا کو جو کہ براؤن رنگ کی تہہ چڑھی ہوئی ایک گولی ہے اور جس کا کمپنی نیم (Adalat 30) ہے ایک جرمن کمپنی تیار کرتی ہے اور یہ ہائی بلڈ پریشر یا انجائنا کی تکلیف میں پچھلے دس بارہ، سال سے پاکستان میں استعمال ہو رہی ہے۔اب شاید کسی کو حیرت ہو کہ پچھلے دس سالوں میں ہزاروں لوگوں نے اس دوا کو استعمال کیا ہو گا لیکن کبھی کوئی شکایت سامنے نہیں آئی کہ مذکورہ دوا کی گولی جسم سے ثابت خارج ہو رہی ہے، لیکن حیرت کی کوئی بات نہیں، دورانِ فراغت فضلہ کا معائنہ کرنے کی مکروہ عادت ہر ایک میں تو نہیں ہوتی ! خیر تو جب دوا سینٹرل لیبارٹری کراچی پہنچی تو وہاں موجود تجزیہ کار ڈاکٹر عبید علی کو خاصا صدمہ ہوا کہ کسی نے بھی یہ دیکھنے کی زحمت نہیں کی کہ اس گولی میں دوا کا ایکٹو جز یعنی نیفے ڈیپن (Nifedipine) اس خول میں ایک لیزر سے کیے ہوئے سوراخ میں موجود ہوتا ہے۔ یہ دوا جسم میں جا کر اس سوراخ میں سے نکل جاتی ہے جب کہ خول ویسے کا ویسا ہی فضلے میں آ جاتا ہے۔

اس گولی کے بنانے والوں نے تو بڑی عرق ریزی کے بعد اسے اس طرح تیار کیا تاکہ یہ دوا جسم میں اس طرح خارج ہو کہ اخراج قابو میں رہے اور دیر تک ہوتا رہے۔ لیکن گولی بنانے والے کے خواب و خیال میں بھی نہیں ہو گا کہ اس کی یہ تکنیک دس پندرہ سال بعد پاکستان میں تشویش پھیلانے کا سبب بن جائے گی، حالانکہ اس دوا کے ساتھ موجود اطلاعی پرچے میں صاف لکھا ہوتا ہے کہ اسے لیزر سوراخ میں داخل کیا گیا ہے۔ کسی نے وہ اطلاعی پرچہ نہ پڑھا، اگر پڑھا تو سمجھا نہیں اور نہ ہی انٹرنیٹ کے اس زمانے میں کسی نے ایک بٹن دبا کر اسکی خصوصیات جاننے کی کوشش کی۔ یوں جرمنز کی بنی ہوئی اس دوا نے وزیر صاحبہ کے گھر بلکہ بیت الخلاء سے لیبارٹری تک کا سفر طے کر ڈالا۔ وفاقی خاتون وزیر صاحبہ جنھوں نے بزعم خود پاکستان میں ہونے والی ایک بڑی جعل سازی پکڑی اور پھر اس جعل سازی کو ختم کرنے کے لیے اپنی منسٹری کے ذریعے زمانے بھر میں ہلچل مچائی.... اس انکشاف کے بعد خاموش ہیں۔ اب ہم نہیں بلکہ وہ لوگ جن کا کام ہی تنقید کرنا ہے، کہہ رہے ہیں کہ وزیر صاحبہ آخر کیسے اس وزارت کو چلا رہی ہیں ؟اس خبر سے موصوفہ ہی نہیں بلکہ کنٹرول یونٹ کے چیئر مین ، جن کے ساتھ ڈاکٹر کا سابقہ لگا ہوا ہے اور دیگر ڈرگ انسپکٹرز کی پیشہ ورانہ مہارت اور قابلیت کی سطح کا بھی بخوبی پتہ چلتا ہے !تو جناب یہ ہے وہ سوال جو ہم نے ایک وزیر کی قابلیت اور ایک ڈرگ ریگولیشن

ادارے کے کرتا دھرتاؤں کی اہلیت پر اٹھایا تھا.... آپ ہم سے متفق ہیں کہ نہیں؟

میں نے کیوں اسلام قبول کیا

میں نے کیوں اسلام قبول کیا (۳)
وکاس نند برہما چاری (معظم حسین)

[نومسلموں کی ایمان افروز آپ بیتیاں ہم پیدائشی مسلمانوں کا ایمان تازہ کر دیتی ہیں۔ ان نومسلموں کی حق کے لیے دی جانے والی قربانی اِن کے ایمان کو پہاڑوں کی چوٹی تک پہنچا دیتی ہے، جب کہ ہمیں چوں کہ بغیر محنت اور قربانی کے اسلام ماں کی گود میں مل گیا، اس لیے ہمیں اس کی قدر نہیں۔ میں نے اس سلسلے میں دو نومسلم خواتین کی ایمان افروز آپ بیتیاں 'ہماری ویب' پر شایع کیں تو بہت ہی اچھا رسپانس ملا۔ اب اس سلسلے کو مستقل کرنا چاہتا ہوں۔ آپ تمام خواتین و حضرات سے درخواست ہے کہ اپنے تاثرات اور تحریر سے کیا سبق ملا، ضرور شیئر کریں۔ محمد فیصل]

میرا آبائی وطن ہندستان میں مغربی بنگال کا ایک علاقہ مدنا پور ہے۔ 25 اکتوبر 1955 میری تاریخ پیدائش ہے۔.بردوان یونیورسٹی مغربی بنگال سے میں بنگالی ادب میں بی اے آنرز کیا اور بعد ازاں سنسکرت ادب کی اعلیٰ ترین ڈگری ''کاویا تیر تھ'' حاصل کی۔

قبولِ اسلام سے قبل میں وکاس نند برہما چاری ضلع پرولیا مغربی بنگال میں شیام سندر آشرم کے تحت ایک مٹھ میں تقریباً سات برس تک مہاراج کی حیثیت سے رہا۔ میرے والد بردوان اسٹیٹ کے راج پروہت تھے۔ اس وقت ان کی مٹھ میں دو تا ڈھائی ہزار شاگرد رہتے تھے۔ جو ان سے ویدک گرنتھوں اور ہندو دھرم کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مٹھ دراصل ہندو راجا مہاراجاؤں کی طرف سے تحفے میں دی گئی زمینیں اور جاگیریں ہوتی ہیں جن کو آباد کرکے وہ اپنے دھرم کی اشاعت کا کام کرتے ہیں۔

سنسکرت ادب میں ''کاپیا تیرتھ'' جیسی اعلیٰ ڈگری حاصل کرکے میں ویدک گرنتھوں کا پرچار کرتے ہوئے دھارمک خدمت انجام دے رہا تھا لیکن کسے معلوم تھا کہ اللہ تعالی مجھے سنسکرت زبان ہی کے ذریعے اسلام و دین کی خدمت کی سعادت عطا کرنے والا ہے۔ جس کا اظہار 1992ء میں قبول اسلام اور ہدایت کی شکل میں ہوا اور میں وکاس نند برہما چاری سے معظم حسین بن گیا۔

ایک دھارمک میلے میں میں اپنے دھرم کی کتابیں مفت تقسیم کر رہا تھا کہ کسی مسلمان نے مجھ سے یہ سوال کیا، بھائی صاحب، آپ کی گرنتھوں میں کیا مذہب اسلام اور اللہ کے آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر بھی آیا ہے؟ کیا اس معاملے میں آپ ہماری کچھ مدد کر سکتے ہیں؟ میں نے کہا اس قسم کا کوئی ذکر موجود نہیں۔ اس پر اس مسلمان نے مجھے کئی حوالے دیے۔ اسوقت میری

انا کو ٹھیس پہنچی کہ میں سنسکرت کا ماہر، ویدوں کا عالم ہوں لیکن ایک مسلمان مجھ سے زیادہ پراچین گرنتھ کے بارے میں جانتا ہے۔ چوں کہ حق تعالیٰ کی جانب سے ہدایت کا فیصلہ ہو چکا تھا اور حق کا بیج میرے دل میں گھر کر چکا تھا اس لیے میں نے حق کی تلاش کا سفر شروع کیا۔ ہندو دھرم کی پرانی کتابوں کو بار بار دیکھا اور مختلف جگہوں پر جا کر ویدوں کے متعلق مزید معلومات حاصل کیں۔ آخر میں اپنے والد کے استاد گرودیو پنچاتن کا پیا تیرتھ سے ملاقات کے لیے گیا اور ان سے پوچھا کہ کیا ویدوں اور گرنتھوں میں مذہب اسلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کچھ لکھا ہے۔ انہوں نے چند اشارے اور نکات فوراً بتا دیے، لیکن ساتھ ہی بری طرح ڈانٹ بھی دیا کہ تمہارا اس سے کیا کام؟ پوجا پاٹ میں ان چیزوں کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ تم یہ سب کیوں جاننا چاہتے ہو۔

مجھے حق کی تلاش تھی، لہٰذا میں نے اپنا سفر جاری رکھا۔ میں مسیحی مشنری بھی گیا، بدھ مت کے مذہبی مقامات پر بھی حاضری دی، لیکن کہیں سے اطمینان بخش جوابات نہ مل سکے، اس جد وجہد میں ایک دن میری ملاقات جامعہ العلوم کھڑک پور مغربی بنگال کے مفتی محمد عثمان سے ہو گئی۔ میں نے ان سے اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں سوالات کیے تو انہوں نے مدرسے میں آنے کی دعوت دی۔ وہاں انہوں نے اسلام کی بنیادی تعلیمات اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

سیرت کی تفصیلات بتائیں۔ قرآن کریم کی مختلف آیات سن کر میرا سینہ اسلام کے لیے کھل گیا، حتیٰ کہ مزید جستجو کے بعد میں 15 اگست 1992ء کو مفتی عثمان صاحب ہی کے ذریعے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جو بھی حق کا ساتھ دیتا ہے تو باطل اس کے مدمقابل آ کھڑا ہوتا ہے۔ قبول اسلام کے بعد میرے لیے بھی مصائب کا پہاڑ کھڑا ہو گیا۔ اپنا منصب، جاگیر اور سب کچھ چھوڑنا پڑا۔ گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ جسم کے کپڑوں کے ساتھ خالی ہاتھ، خالی جیب چار ماہ تک در در کی ٹھوکریں کھائیں اور مختلف آزمائشوں سے گزرنا پڑا۔ آخر میں نے مفتی صاحب کے مدرسے میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے بعد لکھنو کا سفر ہوا جہاں چند اہل علم اور بزرگوں کی سرپرستی میں تقریباً چار سال تک دعوت و تبلیغ کے مشن میں کام کرنے کا موقع ملا۔ اس کے بعد ایک ہندی رسالے ''وشوا ایکتا سندیش'' میں ویدک گرنتھ پر مضامین لکھنے کا سلسلہ شروع کیا اور ویدک گرنتھ کے حوالے سے توحید، رسالت اور آخرت پر روشنی ڈالنی شروع کی۔ اور ساتھ ہی یہ بتانا شروع کیا کہ شرک اور مورتی پوجا کی ابتدا کیسے ہوئی۔

والد صاحب کی عمر 92 برس اور والدہ کی عمر 90 برس تھی۔ انتقال سے چند برس قبل ایک دن میں نے انہیں ایک اللہ کی عبادت کی دعوت دی۔ والد صاحب چونکہ

خود پروہت تھے اس لیے میں نے ان کو ان ہی کی زبان میں سمجھانا شروع کیا۔ ویدوں اور گرنتھوں کے مختلف حوالے دیے۔ مرنے کے بعد کے حالات بیان کیے اور جنت دوزخ کی تفصیلات بیان کیں۔ میری والدہ نے کہا کہ آپ دونوں باپ بیٹا آپس میں اسلام کے بارے میں گفتگو کرو میں تم دونوں کی باتیں سن کر اپنا فیصلہ دوں گی۔ تفصیلی گفتگو کے بعد ماتا جی نے کہا کہ انہیں تو اسلام کے بارے میں اطمینان ہو رہا ہے۔ بعد ازاں دونوں نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کے بعد وہ تقریباً دو برس زندہ رہے۔ لیکن میرے دوسرے بھائیوں نے انہیں گھر ہی میں نظر بند رکھا۔ میں نے ان کی لاکھ منت سماجت کی کہ مجھے کوئی وراثت نہیں چاہیے بس مجھے ماں باپ دے دیجیے لیکن کسی نے میری ایک نہ مانی۔ میرے والدین میرے بھائیوں کے پاس ہی فوت ہوئے، اس پر بھی میں نے انہیں بہت سمجھایا کہ ان کی میتوں کو میرے سپرد کر دو تاکہ میں ان کی اسلامی طریقے سے تدفین کر سکوں مگر وہ بضد رہے اور انہیں نذر آتش کر دیا۔ اور میں صبر کے گھونٹ پی کر ان کے حق میں مغفرت کی دعا کرتا رہا۔

وید تقریباً دس تا گیارہ ہزار برس قبل کی کتاب ہے لیکن فی الوقت موجودہ شکل میں تقریباً ساڑھے تین ہزار قبل کی ہے اس سے پہلے اسے کتابی شکل نہیں دی گئی تھی۔

ہندو شریعت میں رشی منو کی لکھی ہوئی ایک کتاب 'منوسمرتی' یا جیون ودھان گرنتھ ایک معروف کتاب مانی جاتی ہے جس میں یہ لکھا ہے کہ ویدک اصولوں کے مطابق کس طرح زندگی گزاری جائے۔ میں نے منوسمرتی کے بہت سے اصولوں کو اسلامی مسائل اور طور طریقوں کے بہت قریب پایا۔ اسی طرح پران میں 'جل پلاون منو' کے عنوان سے نوح علیہ السلام کی کشتی کا پورا واقعہ موجود ہے۔ ویدوں میں نبیوں کو منو کہا گیا ہے۔ آدم علیہ السلام کو پہلا منو کہا گیا ہے اور آدم علیہ السلام کی ساتویں نسل میں کشتی کا پورا واقعہ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ 'کلکی پران' میں خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں تمام تفصیلات درج ہیں کہ کلکی اوتار کس طرح پیدا ہوں گے؟ آپ کی والدہ کا نام سمتی (جس کا معنی امن والی ہے) یعنی آمنہ اور والد کا نام وشنو بھگت یعنی مالک کی عبادت کرنے والا (عبداللہ) ہوگا اور انہیں جنگ میں مالک کی مدد ملے گی اور ان کے چار خلفاء دنیا سے شر وفساد کو مٹا دیں گے۔

اتھر وید کا ایک اپنشد ہے جسے اللہ اپنشد کہتے ہیں۔ اس میں دس منتر ہیں۔ جس میں توحید رسالت اور اسلامی عقائد کا کھلا اظہار ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی کبریائی بیان کرنے کے لیے ایک منتر ہے۔

ہند ہوتارو، مندرو، اندر ہوتاروم، ہاسوندرا، اللہ جیشٹھنگھ، اللہ شر شٹھنگھ''

''پرم پرن،.برہمان اللہ ہوالام

یہ اِندر کی تعریف میں کہے گئے الفاظ ہیں کہ وہ ساری کائنات کا بادشاہ ہے اس کا نام اللہ ہے وہ بہت بڑا ہے وہ سب کچھ کر سکتا ہے اس میں کوئی کمی نہیں ہے اور وہی برہما (اللہ) ہے۔

مسلم بھائیوں سے میری درخواست ہے کہ وہ اسلام جیسی نعمت کی قدر کریں اور اسلام پر مکمل عمل کریں اور دوسروں کو حق و صداقت کی دعوت دیں۔

ہندوؤں کو میں یہ سندیس دینا چاہتا ہوں کہ اس سارے سنسار کا مالک وایشور ایک ہی ہے بس اسی کو مانو، اور اسی کی مانو، اور جس کلکی اوتار کا آپ انتظار کر رہے ہیں وہ چودہ سو برس پہلے عرب کی دھرتی پر آ چکے ہیں ان کا نام ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ وہی سمتی یعنی آمنہ کے لعل اور وشنویس یعنی عبداللہ کے بیٹے ہیں انہوں نے ہی کم وقت میں جزیرہ عرب و قرب و جوار میں کے علاقے میں ساری برائیاں مٹا دیں۔ ان ہی کو مالک کی طرف سے جنگ بدر میں کھلے طور پر مدد حاصل ہوئی اور ان ہی کے خلفاء کرام حضرت ابوبکر، عمر، عثمان، علی رضی اللہ عنہم) نے ایک بڑے حصے کو فتح کیا اور حق کا) بول بالا کیا۔ اس لیے اس کلکی اوتار کو مان لو اسی میں تمہاری دنیا اور آخرت کی بھلائی ہے۔

ایک سچا مسلمان بننے کا سوال؟

محمد اسماعیل ریحان

اتوار 26 اگست 2012 ء کو بی بی سی اردو ڈاٹ کام پر وسعت اللہ خان کا مضمون "میں سچا مسلمان کیسے بنوں؟" پڑھنے کا موقع ملا جس میں موصوف نے یہ سوال اٹھاتے ہوئے کہ وہ سچا مسلمان بننے کے لیے کیا کریں، یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ اس وقت سنی دیوبندیوں کے ہاں سچا مسلمان بننے کے لیے اہل تشیع کو نہ صرف قتل کرنا بلکہ ان کا نام ونشان تک مٹاڈالنا ضروری ہے۔ چنانچہ موصوف سوال کرتے ہیں: "ایک سنی دیوبندی گھرانے میں پیدا ہونے والا وسعت اللہ خان خود کو ایک اچھا مسلمان ثابت کرنے کے لیے کہاں تک جائے، کیا کرے؟ شاید شیعوں کو مارنے سے میرا کام نہیں چلے گا۔ شاید اور بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ تو کیا بو علی سینا کی قبر پر جاکے تھوک دوں؟ بابائے الجبرا الخوارزمی کے فارمولے جلا دوں؟ بابائے کیمیا جابر بن حیان کی ہڈیاں زمین سے نکال لوں؟ بابائے فلکیات البیرونی کے مزار کو آگ لگا دوں؟ مورخ المسعودی کی تاریخِ اسلام حرام سمجھ لوں؟ حضرت معروفِ کرخی کے تصوف، ملا صدرا کے نظریہ وجودیت اور سید علی ہمدانی کی تبلیغ کو شرک کے خانے میں رکھ دوں؟ عمر خیام کی رباعیات چھلنی کر دوں؟ شاہ نامہ والے فردوسی کا تہران یونیورسٹی میں لگا مجسمہ گرا دوں؟............"

موصوف نے اس خامہ فرسائی میں دو قسم کی مغالطہ آرائیاں کی ہیں۔ ایک فکری
اور دوسری تاریخی۔ فکری مغالطہ یہ ہے کہ وہ یہ جتانا چاہ رہے ہیں کہ اہل تشیع کا قتل عام
اوران کو نیست ونابود کرنادورِ حاضر کے اہل سنت نے اپنامذہب، وطیرہ اور
شعار بنالیاہے اوراس فریضے کی ادائی کے بغیر وہ کسی کو اچھامسلمان ماننے کے لے ے
تیار نہیں۔ اس مغالطے کی تردید کے لیے اتنا کہنا کافی ہے کہ موصوف اس بارے میں
علمائے اہل سنت خصوصاً علمائے دیوبند کی جانب سے کوئی ایک فتویٰ پیش کردیں جس میں
یہ کہاگیاہو کہ اہل تشیع کو قتل کرنادین وایمان کا حصہ ہے اور اس کے بغیر کوئی شخص پختہ
مسلمان نہیں ہوسکتا۔ جب وہ کوئی ایسافتویٰ پیش نہیں کرسکتے تو پھر اس شکوے شکایت کی
کیاتک ہے کہ ""ایک سنی دیوبندی گھرانے میں پیدا ہونے والا وسعت اللہ خان خود کو
ایک اچھا مسلمان ثابت کرنے کے لیے کہاں تک جائے، کیا کرے؟ شاید شیعوں کو
مارنے سے میرا کام نہیں چلے گا۔ شاید اور بہت کچھ کرنا پڑے گا۔" موصوف سے
آخر کون سے سنی دیوبندی عالم نے کہاہے کہ وہ شیعوں کی جان ومال پر دست درازی
کیے بغیر اچھے مسلمان ثابت نہیں ہوسکتے۔ اس وقت پاکستان میں کروڑوں کی تعداد میں
دیوبندی موجود ہیں۔ اگر بھارت اور بنگلہ دیش کے دیوبندیوں کو شامل کرلیاجائے
تو میرے خیال میں یہ تعداد تین چارگنا ہوجائے گی۔ ان میں سے کسی کو یہ شبہ نہیں
ہوا۔ صرف بی بی سی کے ایک تبصرہ نگار کو یہ شک کیسے ہوگیا کہ سنی دیوبندی مسلک میں
اس قسم کی

دہشت گردی فرض کادرجہ رکھتی ہے۔ کیا موصوف کا یہ خیال ہے کہ دیوبندی مسلک کا ہر فرد ایسی دہشت گردی کو اپنا دین و ایمان تصور کرتا ہے؟ دعویٰ تو اتنا بڑا اور دلیل ایک بھی نہیں۔ کیا صحافت صرف تہمتیں دھرنے اور سنگین الزامات عاید کرنے کا نام ہے؟ بہرحال اگر موصوف نے یہ سب کسی غلط فہمی کے تحت لکھا ہے تو کسی بھی وقت علمائے دیوبند سے رابطہ کرکے دیکھ لیں، ان سے تحریری فتویٰ لے لیں۔ غلط فہمی ہے تو دور ہو جائے گی۔

موصوف کے الفاظ "شاید گلگت اور بلتستان کے شیعوں کو بالکل ٹھیک سزا مل رہی ہے...." سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے شمالی علاقہ جات میں کچھ اہل تشیع کے دہشت گردی کا نشانہ بننے سے متاثر ہو کر قلم اٹھایا ہے۔ شمالی علاقے ہوں یا جنوبی، ہر جگہ دہشت گردی کی وارداتیں افسوس ناک ہیں اور اس میں ہم سب موصوف کے شریک رنج و غم ہیں۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ تصویر کا ایک ہی رخ کیوں دیکھتے ہیں؟ اگر آپ گلگت بلتستان میں اہل تشیع کے قتل کو زبردستی سنی دیوبندی مذہب کا حصہ مان رہے ہیں تو کراچی میں اہل سنت کی مسلسل ٹارگٹ کلنگ کو دیکھ کر آپ کو یہ غلط فہمی کیوں نہیں ہوتی کہ اہل تشیع کے نزدیک بھی اہل سنت کی جان و مال حلال ہیں۔ اگر اس قسم کی دہشت گردی کو شیعہ مذہب کا حصہ نہیں مانا جاتا بلکہ اسے چند مشتعل افراد یا نامعلوم قاتلوں ہی کے کھاتے میں ڈالا جارہا ہے تو شیعوں کے قتل کو اہل سنت کے مذہب کا حصہ کیوں اور کس دلیل سے

تصور کیا جا رہا ہے؟

اہل سنت کی تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اہل تشیع کو معاشرے میں اپنے ساتھ بطور اسلامی مملکت کے شہریوں کے پوری وسعتِ قلبی کے ساتھ جگہ دی ہے۔ بڑے بڑے فاتحین اسلام کے ہاں وہ معزز عہدوں پر رہے۔ ان کی قابلیت کا لحاظ کرتے ہوئے انہیں ہر سہولت دی گئی۔ کبھی ان کو گھٹانے یا گرانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر اہل سنت کا مسلک ومذہب دوسرے فرقوں کی نسل کشی ہوتا تو آج شاید اسلامی دنیا میں کوئی اور جماعت نہ ہوتی مگر خلفائے اسلام اور فاتحین نے ہمیشہ رواداری کا سلوک کیا۔

باجود اس کے کہ متعدد مواقع پر اہل تشیع کے بعض گروہوں یا افراد کی طرف سے انہیں سازشوں اور غداریوں کا سامنا بھی کرنا پڑا مگر انہوں نے چند افراد کے جرائم کی سزا پوری قوم کو دینے کی کوشش کبھی نہیں کی۔

اہل سنت کی یہی "وسعت ظرفی" پاکستان میں بھی برقرار ہے جس کا مظاہرہ نو، دس محرم کو سب دیکھتے ہیں کہ اکثریت گھروں میں محصور ہوتی ہے اور اقلیت پورے تزک واحتشام سے فوج، پولیس، خفیہ ایجنسیوں اور تمام سرکاری مشینری کے کڑے پہرے میں ماتمی جلوس لے کر گزرتی ہے۔ ملک کے کلیدی عہدوں تک میں شیعہ سنی کا کوئی امتیاز نہیں ہے۔ یہ سنی اکثریت کی عملی رواداری نہیں تو اور کیا ہے۔ اس کے باوجود اہل سنت کو موردِ الزام ٹھہرانا وہ بھی اس طرح کہ دوسرے فرقے سے جنگ

وجدال کو اس کے عقائد وارکان میں داخل ہونے کا دعویٰ کر دینا کہاں کا انصاف ہے؟ جہاں تک باہمی کشیدگی اور قتل وغارت کی بار بار اٹھنے والی لہروں کا تعلق ہے، ان کی حقیقت وسعت اللہ خان جیسے صحافی سے مخفی ہے نہ اربابِ حکومت سے۔ اس پر ایسی مغالطہ آرائیوں کے دبیز پردے ڈالنے کا مقصد کیا ہے؟ اس سے اشتعال کم ہوگا یا مزید بڑھے گا۔ مسئلہ حل ہوگا یا مزید الجھے گا۔ سب جانتے ہیں کہ دہشت گردی اگر ہے تو دونوں طرف سے، یعنی کچھ مشتعل اور انتہا پسند افراد دونوں صفوں میں موجود ہیں جنہیں کوئی مذہبی سند حاصل ہے نہ کوئی فتویٰ ان کی کارروائیوں کی حمایت کرتا ہے۔ یہ ہے حقیقت۔ اس کو مان لیں۔ اس کے بعد خود بخود یہ سوال پیدا ہوگا کہ آخر یہ لوگ کیوں لڑ رہے ہیں؟ اس کا جواب ان ہی لڑنے والوں سے پوچھیں تو ہر ایک دوسرے کو اشتعال انگیز تحریر و تقریر کا الزام دے گا۔ اب تک ایسی کارروائیوں میں جتنے افراد کو سزا ہوئی ہے، عدالتوں میں ان کے بیانات کا حاصل یہی ہے۔ یہی جڑ ہے سارے فساد اور قتل وغارت کی۔ کیا حکومت کے پاس اس کا حل نہیں؟ ضرور ہے۔ آج ہی اصحاب رسول، اہل بیت اور مقدس شخصیات کی توہین کے ارتکاب پر کڑی سزا کا قانون پاس کر دیا جائے اور اس پر عمل درآمد ہو اور توہین آمیز لٹریچر پر سخت پابندی لگا دی جائے تو پھر دیکھیے امن وامان کی فضا قائم ہوتی ہے یا نہیں۔ یہ تجاویز فریقین کے مشترکہ اجلاسوں میں اہل

سنت قائدین برسوں سے حکومت کو دے رہے ہیں مگر حکومت کی نامعلوم مصلحتیں آڑے آجاتی ہیں۔

موصوف نے اپنی تحریر میں بہت سے مشاہیر اہل سنت کو اہل تشیع کی طرف منسوب کردیا ہے۔ ان کی اس جسارت پر شدید حیرت ہے۔ ان تاریخی مغالطہ آرائیوں پر اگلی نشست میں بات کریں گے۔ا

کفر کے اندھیروں سے ایمان کے اجالوں تک

اک نومسلمہ کے ساتھ اللہ کی مدد

خیر النساء سابقہ شالنی دیوی۔ انڈیا

میں تھانہ بھون ضلع مظفر نگر (یو پی) کے قریب ایک گاؤں کی رہنے والی ہوں۔ میرا سابقہ نام شالنی دیوی تھا۔ میرے والد کا نام چودھری بلی سنگھ تھا۔ میری شادی ہریانہ میں پانی پت ضلع کے ایک قصبے میں کرپال سنگھ سے ہوئی۔ اپنے پہلے شوہر کے ساتھ چودہ سال رہی۔ اب سے آٹھ سال پہلے میرے اللہ نے مجھے اسلام کی دولت سے نوازا۔ اللہ کے شکر سے میرے پانچ بچے ہیں جو میرے ساتھ مسلمان ہیں۔

مجھے بچپن ہی سے اپنے ہاتھوں کی بنائی ہوئی مورتیوں کی پوجا دل کو نہ بھاتی تھی۔ میں پیڑ، پودوں، پھولوں، چاند، ستاروں کو دیکھتی تو سوچتی کہ ایسی خوب صورت اور سندر چیزوں کو بنانے والا خود کتنا سندر ہو گا؟ میرے سسرال کے گاؤں میں یو پی کے بہت سے مسلمان کپڑے وغیرہ کی تجارت کے لیے آتے تھے۔ وہ مجھے ایک مالک کی پوجا اور اللہ کے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی

باتیں بتاتے۔ میرے ساتھ میرے بچے بھی بڑی دل چسپی سے ان کی باتوں کو سنتے۔ ان کے جانے کے بعد میرے بچے مجھ سے کہتے کہ ماں ہم سب مسلمان ہوتے تو کتنا اچھا ہوتا۔ آخرکار پروردگار نے مجھ پر نظرِ رحمت کی اور میں نے مسلمان ہونے کا فیصلہ کر لیا اور گنگوہ کے علاقے کے دو مسلمانوں کے ساتھ جا کر اپنے بچوں سمیت مسلمان ہو گئی۔ اسلام قبول کرتے ہی میرے گھر والوں اور سسرال والوں نے قیامت برپا کر دی۔ میرے چھوٹے چھوٹے بچوں کو بے حد ستایا۔ ہم سب کو جان سے مارنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر موت زندگی کا مالک ہماری حفاظت کرتا رہا۔ میرے اللہ پر مجھ کو بھروسا رہا اور ہر موڑ پر میں مصلّی پر جا کر فریاد کرتی رہی، اور اللہ نے میری ہر موڑ پر مدد کی۔

میں کس منہ سے اپنے مالک کا شکر ادا کروں۔ میرے گھر والوں اور سسرال والوں نے جو بڑے زمیندار بھی ہیں، مجھے منانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر جب میں نے فیصلہ سنا دیا کہ میں مر تو سکتی ہوں مگر اسلام سے نہیں پھر سکتی تو پھر انہوں نے میرے ساتھ بے حد سختیاں کرنا شروع کر دیں۔ ایک دن اسی تکرار میں انہوں نے مجھے پیڑ سے لٹکا دیا۔ دسیوں لوگ مجھے لاٹھی ڈنڈوں سے پیٹنے لگے مگر وہ لاٹھیاں نہ جانے کہاں لگ رہی تھیں۔ میں اللہ سے فریاد کرتی رہی۔

مجھے ایسا لگا کہ مجھے نیند آ گئی ہے یا میں بے ہوش ہو گئی ہوں۔ بعد میں مجھے ہوش آیا تو پولیس وہاں موجود تھی اور وہ لوگ بھاگ گئے تھے۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ اس پٹائی میں خود میرے چچا اور جیٹھ کے ہاتھ ٹوٹ گئے۔ وہ میرے بچوں کو مجھ سے چھین کر لے گئے۔ میرے بڑے بیٹے جس کا نام میں نے عثمان رکھا ہے، اس کو گھر لے جا کر بہت مارا۔ وہ دو روز بعد کسی طرح جان بچا کر وہاں سے بھاگ گیا۔ تھانہ بھون میں اس نے اپنے ایک مسلمان دوست کے ہاں پناہ لی مگر میرے سسرال نے اسے وہاں بھی ڈھونڈ لیا۔ اس کو مارنے کے لیے وہ بہت سے بدمعاشوں کو چھروں اور چاقوؤں کے ساتھ لے آئے۔ تیرہ سال کا بچہ اور آٹھ دس لوگ چھریوں سے اسے مارنے لگے۔ میرے بچے نے چھری چھیننے کی کوشش کی۔ اسی کوشش میں نہ جانے کسطرح چھری خود مارنے والوں میں سے ایک کے پیٹ میں گھس گئی۔ اور وہ فوراً مر گیا۔ اتنے میں ایک بس آ گئی۔ بس والے نے بس روک دی۔ سواریاں اتریں تو وہ سب لوگ بھاگ گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ وہاں ایک لڑکا تھا جس کے سارے جسم پر زخم تھے اور ایک شخص مرا ہوا پڑا تھا۔ پولیس آئی اور میرے بیٹے کو جیل بھیج دیا۔ جیل میں اس کی پٹائی ہوتی رہی۔ اس نے صاف بیان دیا کہ چھری چھینتے ہوئے میرے ہاتھ سے اس کے پیٹ میں گھس گئی۔ لڑکے کو آگرہ جیل بھیج دیا گیا۔ میں رات رات بھر مصلے پر پڑی رہتی۔ میں نے سہارے کے لیے ایک مسلمان سے نکاح بھی کر لیا۔ عورتیں مجھے ڈراتیں کہ تیرے بچے اب تجھے ملنے والے نہیں۔ اور تیرے بچے کی ضمانت کوئی نہیں کرائے گا۔

میرا بیٹا عثمان آگرہ جیل میں نماز پڑھتا اور دعا کرتا۔ ایک دن اس نے خواب میں دیکھا کہ ایک پردہ آسمان سے آیا اور لوگ کہہ رہے ہیں کہ بی بی فاطمہ آسمان سے عثمان کی ضمانت کرانے آئی ہیں۔ ایک ہفتے بعد آگرہ کی ایک دولت مند عورت نے عثمان کی ضمانت کرائی۔ وہ مظفر نگر آیا کرتی تھیں۔ ضمانت ہو گئی تو میں نے اسے دین سیکھنے کے لیے تبلیغی جماعت میں بھیج دیا۔ میں اپنے چار بچوں کی وجہ سے رویا کرتی اور میرے بچے بھی بہت تڑپتے۔ میری بچی چھپ کر نماز پڑھتی۔ اس کو نماز پڑھتا دیکھ کر میرے سسرال والوں نے اس پر مٹی کا تیل چھڑک دیا اور آگ جلانا چاہی مگر میرے اللہ نے اسے بچا لیا۔ انہوں نے چار بار دیا سلائی جلائی مگر ایک بال بھی نہیں جلا۔ پھر انہوں نے مشورہ کرکے کھیر پکائی اور کھیر میں زہر ملا دیا۔ وہ کھیر میری دونوں بچیوں کو کھلا دی مگر انہیں کچھ بھی نہ ہوا۔ میری جٹھانی کہنے لگی کہ اس کا مطلب ہے کہ یہ تو زہر ہی نہ تھا۔ اس نے کھیر چکھی اور فوراً مر گئی۔

میرا بیٹا عثمان جماعت سے آیا۔ میں اور وہ پانی پت کے پاس ایک جگہ جا رہے تھے۔ کہ ہمارے سسرال والوں نے ہمیں گھیر لیا۔ انہوں نے گولیاں چلائیں۔ مگر ایک فائر بھی ہمیں نہ لگا، گولیاں ہمارے دائیں بائیں سے گزر جاتی تھیں۔ آخر تیئیسواں فائر انہیں کے ایک آدمی کے لگ گیا اور وہ مر گیا۔ اس پر وہ

بھاگ گئے۔ میں اپنے اللہ سے بچوں کو مانگا کرتی، میرے اللہ مجھے میرے بچے مل جائیں۔ ایک روز ایک عالم مولوی غوث علی شاہ مسجد میں آئے انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی ماں کا قصہ سنایا کہ اللہ نے فرعون کے گھر میں ان کو ان کی ماں سے کیسے ملایا۔ میں گھر گئی اور سجدے میں گر گئی میرے اللہ جب تو موسیٰ علیہ السلام کو ان کی ماں کی گود میں پہنچا سکتا ہے تو میرے بچوں کو کیوں نہیں ملا سکتا۔ میں تجھ پر ایمان لائی ہوں میں فریاد کرنے کس سے جاؤں۔ میں تیرے علاوہ کسی سے فریاد نہ کروں گی۔ ساری رات سجدے میں پڑی رہی۔ اسی عالم میں سو گئی۔ خواب میں دیکھا کہ کوئی کہہ رہا ہے اللہ کی بندی خوش ہو جا تیرے بچے تیرے ساتھ ہی رہیں گے۔ صبح میرا بیٹا عثمان پانی پت سے کرنال کے لیے بس اڈے گیا۔ اس نے دیکھا کہ تینوں بہنیں چھوٹے بھائی کے ساتھ بس سے اتریں۔ وہ موقع پا کر بھاگ آئے تھے اور اندازے سے پانی پت آ رہے تھے۔ عثمان چاروں کو لے کر خوشی خوشی گھر آیا۔ میں پھر ساری رات سجدے میں پڑی رہی۔ شکرانے میں۔ اس کے بعد پانچ چھ بار ایسا ہوا کہ میرے سسرال والے مجھے اور میرے بچوں کو تلاش کرتے کرتے آئے۔ ہم انکو دیکھ لیتے مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ اندھے ہو گئے ہیں کہ وہ ہمیں نہیں دیکھ پاتے تھے۔ مجھے ہر موڑ پر میرے مالک نے سہارا دیا میں اسکا کسطرح شکر ادا کروں۔

عثمان نے قرآن مجید پڑھ لیا۔ ہر سال تبلیغی جماعت کے ساتھ بھی جاتا ہے۔ میں

دعا کرکے اسے بھیج دیتی ہوں کہ حفاظت کرنے والا میرا مالک ہے۔

بڑی دو بیٹیوں کی شادی کر دی ہے دونوں داماد بہت دین دار اور نیک ہیں۔ میری بیٹیاں بھی بہت پکی اور سچی مسلمان ہیں۔ ان کی شادی کے وقت میرا بیٹا جیل میں تھا میرے اللہ نے اس کی ضمانت کا انتظام کر دیا۔ اور اس نے خود اپنی بہنوں کو خوشی خوشی رخصت کیا۔ اب وہ اللہ کے فضل سے بری ہو گیا ہے۔ چھوٹی بچی اور بچہ مدرسے میں پڑھ رہے ہیں۔

میں نے ایمان لانے کے بعد قدم قدم پر اللہ کی مدد دیکھی مجھے نماز میں بہت مزہ آتا ہے۔ میں نے چھ سال سے تہجد، اشراق، چاشت اور اوابین نہیں چھوڑی۔ میں نے کیا نہیں چھوڑی میرے مالک نے چھوڑنے نہیں دی۔ جب بھی کوئی ضرورت ہوتی ہے مصلے پر جاتی ہوں اور اپنے مالک سے فریاد کرتی ہوں مشکل حل ہو جاتی ہے۔

ہمارے مسلمان بھائی بہن جن کو باپ دادوں سے اسلام مل گیا ہے انہیں اس کی قدر نہیں۔ انہیں بھی چاہیے کہ وہ بھی اللہ پر کامل یقین کریں اور پھر اس کی مدد دیکھیں۔

اب میرا ارادہ قرآن مجید حفظ کرنے کا ہے۔ اور اپنی دونوں بچیوں کو بھی دین کا سپاہی اور داعی بنانا ہے۔ چھوٹے بچے کو چاہتی ہوں کہ وہ بھی اجمیر والوں کی طرح لاکھوں لوگوں کو مسلمان بنائے۔ مجھے امید ہے میرے اللہ میری تمنا ضرور پوری کرے گا اس نے آج تک میری کوئی درخواست رد نہیں کی۔

انقلابی ایجادات کے دعوے اور پاکستان میں تعلیم کا شعور

اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کا نظام اسباب کے ساتھ جوڑا ہے۔ اسی لیے اسے دارالاسباب کہا جاتا ہے۔ علت و معلول اس دنیا میں لازم و ملزوم ہیں۔ بے شک اللہ تعالیٰ کی مشیت و قدرت کسی سبب کی محتاج نہیں۔ وہ جیسا چاہتے ہیں، جب چاہتے ہیں، بغیر اسباب کے اپنی قدرت سے کرتے ہیں۔ لیکن عمومی طور پر نظامِ کائنات میں حکمتِ الٰہیہ یہی کارفرما نظر آتی ہے کہ ہر علت کا کوئی معلول بھی ضرور ہوتا ہے۔ کامیابی ہے تو ضرور اس کے پیچھے صحیح نہج پر اَن تھک محنت اور اخلاص بھی ضرور ہوگا۔ ناکامی ہے تو اس کے پیچھے کاہلی اور طفیلا پن بھی ہوگا۔

کوئی قوم روز بروز ترقی کے مدارج طے کرکے بامِ عروج پر پہنچ رہی ہے اور اپنی سربلندی کے پھریرے دنیا میں لہرا رہی ہے تو یہ ترقی اور سربلندی اس قوم کو پلیٹ میں رکھ کر نہیں دی گئی ہے بلکہ اگر کھوجا جائے تو اِس کے پیچھے کئی نسلوں کی اَن تھک محنت، فکر اور اپنے مقصد سے عشق نظر آئے گا۔ اس قوم میں باہمی اتحاد اور جوش و جذبہ کے ساتھ تحمل و تدبر کی غیر معمولی صفات بھی ضرور ہوں گی۔ اس کے برعکس ایک قوم ماضی کی رفعتوں کے گیت گا رہی ہو لیکن حال یہ ہو کہ پستی میں پاتال کو شرما رہی ہو اور ذلت میں سرتاپا غرق ہو تو

یقین جانیے اس کی وجہ تقدیر یا صرف دشمنوں کی ریشہ دوانیاں نہیں بلکہ یہ ذلت وپسپائی .... اس قوم کی کاہلی، طفیلاپن اور باہمی انتشار کی نشانی ہے

اب مندرجہ بالا دونوں مثالوں کو آپ ملک عزیز پاکستان اور پاکستان کے بدخواہ ممالک پر منطبق کیجیے تو آپ بخوبی جان جائیں گے کہ ہماری انتہائی پستی کی وجہ کیا ہے اور جن کو ہم اپنا حریف سمجھتے ہیں، ان کی سربلندیوں کی وجہ کیا ہے؟ یہ بات نہیں کہ ہمیں اسباب نہیں دیے گئے ہیں۔ ہم پر تو قدرت کی بے بہا فیاضیاں ہیں، بلکہ شاید میں یہ دعویٰ کر سکتا ہوں کہ قدرتی نعمتوں میں پاکستان کے خطہ کا پوری دنیا میں کوئی مقابل نہیں.... ایک چھوٹے سے خطہ میں، اتنے قدرتی مگر متنوع وسائل کا ایک ساتھ جمع ہونا اور پھر ان کو برتنے کے لیے صلاحیتوں سے مالا مال ایک انبوہ کثیر....! بے شک اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو کون جھٹلا سکتا ہے!.... لیکن پینسٹھ سال میں ہوا کیا، ہم پوری دنیا میں تو کیا صرف اپنے خطہ جنوبی ایشیا ءمیں بھی کوئی نمایاں کارکردگی نہیں دکھا سکے۔ یہاں کوئی یہ نہ کہے کہ ہم ایٹمی قوت بن گئے ہیں جو دنیا میں ہمارے علاوہ صرف چھ ممالک کے پاس ہے! تو جناب یہ مناسب دلیل نہیں کیوں کہ اپنے غیر سب جانتے ہیں کہ ہمارا ایٹمی قوت بنا محض بھارت کی اسلحہ کی دوڑ کے ردعمل کے طور پر ایک دباو ٔ کا نتیجہ تھا۔ اگر مخصوص حالات و عوامل نہ ہوتے، تو ہم ایسا سوچتے بھی نا، کیوں کہ ٹیکنالوجی کا تعلق تو تعلیم کے ساتھ ہے

اور تعلیم کا ہمارے ملک میں یہ حال ہے کہ پوری دنیا کی پانچ سو بہترین یونیورسٹیوں میں ایک بھی پاکستان میں نہیں.... اور صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ تمام عالم اسلام کا یہی حال ہے جس کا پاکستان بزعم خود لیڈر بنتا ہے۔ ایک حالیہ جائزے کے مطابق دنیا بھر میں ایک سال کے دوران شایع شدہ ایک کروڑ پندرہ لاکھ (11.5 ملین) تحقیقی مقالہ جات میں اسلامی ممالک کے مقالات کی تعداد محض دو فیصد کے قریب ہے۔ بد قسمتی سے اس معاملے میں ہم باقی دنیا سے بہت پیچھے بلکہ دوڑ کے میدان میں شامل ہی نہیں۔ آپ ایمانداری سے اپنے چاروں طرف دیکھ لیجئے، کیا آپ موجودہ دور کی کسی بھی ایسی اختراع کو پاکستانیوں یا مسلمانوں کی ایجاد کہہ سکتے ہیں جس سے ساری دنیا مستفید ہو رہی ہو؟

ہمارے پاس اٹھارہ کروڑ کی آبادی کا تین چوتھائی جوانوں کی صورت میں موجود ہے لیکن یہ وہ نوجوان ہیں جو بے سمت خود رَو جھاڑیوں کی طرح بڑھ رہے ہیں۔ ان کی اکثریت کو قلم پکڑنا نہیں آتا، ہاں اسلحہ استعمال کرنا خوب جانتے ہیں۔ اور بات یہیں تک رہتی تو غنیمت تھی، اب تو پچھلے دو تین سالوں سے تواتر کے ساتھ ایک مذاق یہ کیا جا رہا ہے کہ پاکستان ییں اچانک ایسے افراد سامنے آ رہے ہیں جو بڑے دھڑلے سے سائنس کے میدان میں کسی دھماکے دار ایجاد کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اور ستم پر ستم یہ ہے کہ ان کے دعوے کو سائنسی انداز میں پرکھے بغیر مین اسٹریم میڈیا وہ دھمال مچاتا ہے کہ یہ دعوے دار راتوں رات شہرت کی

بلندیوں پر پہنچ جاتے ہیں.... لیکن صرف چند مہینوں کے بعد تجربات سے یہ ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ دعوے محض ڈھکو سلے تھے۔ مثال کے طور پر 2011ء میں پنجاب کے شہر سرائے عالمگیر کے رہائشی غلام سرور نے صرف ایک پیالی پانی سے گاڑی کو ایک ہزار کلومیٹر چلانے کا دعویٰ کیا اور مقامی و قومی سطح پر خوب مقبولیت پائی۔ قومی سطح کے اخبارات نے تو اس ایجاد کو فروغ نہ دینے پر حکومت پاکستان کی خوب مذمت کی اور دعویٰ کو جانچنے کا انتظار کیے بغیر دھڑا دھڑ کالم شایع کیے۔ غلام سرور کے بعد ایک نوجوان عمار افضل صاحب کو بھی ایک جینئس کے طور پر میڈیا نے پیش کیا۔ دعویٰ یہ کیا گیا کہ عمار کی صلاحیتوں" سے براہ راست امریکہ نے کسبِ فیض کیا اور اس مسئلے کو جسے دنیا بھر میں" کوئی حل نہ کر سکا، برخوردار عمار نے چند منٹ میں حل کر دیا لیکن .... بعد میں اس کے غبارے سے بھی ہوا نکل گئی اور معلوم یہ ہوا کہ سب فراڈ اور جھوٹ تھا۔ یوں عمار صاحب بھی ایک جینئس فراڈیے ثابت ہوئے۔ عمار کے بعد جولائی 2012ء میں ایک بار پھر میڈیا یں خیر پور سے تعلق رکھنے والے آغا وقار کے حوالے سے پانی سے چلنے والی کار کا تذکرہ شروع ہوا۔ انہوں نے ایک ایسی کار بنانے کا دعوی کیا جو کلی طور پر اپنی توانائی پانی سے اخذ کرتی ہے اور بغیر کسی ایندھن کی موجودگی کے باآسانی چارج بھی ہو جاتی ہے۔ سندھ سے تعلق رکھنے والے اس جوان کو نا صرف میڈیا ہیرو بنا کر پیش کرتا رہا بلکہ اس بار یہ دعویٰ قوم پرستی کو فروغ دینے کا بھی ایک ذریعہ بنا۔ کیوں کہ آغا وقار

کی لسانی شناخت کو خوب ابھارا گیا اور سندھ کے وزیر قانون نے اس ایجاد کو سندھی قوم کی صلاحیت کا ایک نمونہ قرار دیا۔

اپنے پیش رو کے مقابلے میں آغا وقار صاحب ٹی وی شوز میں بڑی باتیں کرتے دکھائی دیے، مثلاً یہ تھیوری کہ پانی کو برق پاشیدگی کے ذریعے گیسوں میں توڑ کر بطور ایندھن انجن میں چلایا جا سکتا ہے، خالص ان کی انقلابی تھیوری ہے۔ یہ ایسا کھلا جھوٹ تھا جو شاید پاکستان میں ہی بولا جا سکتا ہے۔ آج سے ڈیڑھ سو سال پہلے کے سائنس دان بھی یہ جانتے تھے کہ پانی کو گیسوں میں توڑا جا سکتا ہے اور انجن میں جلایا جا سکتا ہے اور آج سے پچاس سال پہلے پانی کے ذریعے یورپ میں گاڑی چلانے کے کئی کامیاب تجربے بھی ہو چکے ہیں، جس کے بارے میں انٹرنیٹ پر خاصا مواد موجود ہے۔ معلوم یہ ہوا کہ یہ کوئی روکٹ سائنس نہیں ہے، مگر بات یہ ہے کہ یہ طریقہ بڑے پیمانے پر اور ایفی شینسی کے ساتھ قابلِ عمل نہیں ہے ورنہ امریکہ، جاپان جیسے کارساز ممالک جن کے پاس بے پناہ وسائل بھی موجود ہیں، اب تک اس میں کامیاب ہو چکے ہوتے۔ اس کے برعکس ہمارے پاکستانی موجد تمام ثابت شدہ سائنسی اصولوں کو ڈھا کر بغیر کسی توانائی کے صرف پانی سے کلی طور پر انجن چلانے کا دعویٰ کر رہے تھے، اور اسے انتہائی سستا اور قابل عمل میتھڈ بھی بتا رہے تھے! یہاں تفصیل کا موقع نہیں کہ سائنس دانوں نے ان بے نظیر دعووں کا جو پوسٹ مارٹم کیا ہے، وہ پیش کیا جائے

لیکن اب بہرحال اس کا بکواس ہونا ثابت ہو چکا ہے۔

بات گھوم پھر کر وہیں آ جاتی ہے کہ بے شک ہمارے پاس بہترین صلاحیتوں والے نوجوان موجود ہیں، مثال کے طور پر دس سالہ ارفع کریم مرحومہ، بارہ سالہ بابر اقبال، تیرہ سالہ موسیٰ فیروز، پندرہ سالہ شاداب رسول اور سترہ سالہ شاہ زیب حسین کا نام لیا جا سکتا ہے جنھوں نے اپنی کم عمری میں ہی دنیا بھر سے اپنی صلاحیتوں کو منوا لیا۔ انہوں نے جھوٹے دعوے کرنے کی بجائے اپنے کام سے دنیا کو متاثر کیا جس کے نتیجہ میں ان کو دنیا کے انتہائی معتبر اداروں سے ایوارڈ اور سرٹیفیکٹ ملے ہیں، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ملک کا نام روشن کرنے والے ان ہونہار بچوں کی صلاحیتوں کو ہمارے میڈیا نے اس طرح ہائی لائٹ نہیں کیا جس طرح ان ایجادیوں کو کیا ہے جن کے عجیب وغریب دعوے پاکستان کی جگ ہنسائی کا باعث بنے۔ یہ چند بچے ہمارے لیے فخر کا باعث ہیں لیکن درحقیقت یہ سارے بچے اپنے والدین کی انفرادی توجہ اور خاص ماحول کی وجہ سے سامنے آ سکے ہیں، ورنہ کروڑوں کی آبادی کے اس ملک میں عمومی طور پر علم و تحقیق کے لیے ایسی سازگار فضا نہیں کہ قابل جوہر چھٹ کر اوپر آ سکے اور اپنا اور اپنے ملک کا نام روشن کر سکے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ بچوں کے رجحان کے پیش نظر ان کے روشن مستقبل کے لیے

راہیں تلاش کی جائیں۔ انہیں فنون کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بہترین سہولیات مہیا کی جائیں۔ بد قسمتی سے ہمارے ملک کے تعلیمی نظام میں نقائص کی وجہ سے بچوں کے رویے اور رجحانات کو جانچا اور پرکھا نہیں جاسکتا۔ اگر ہم اپنے تعلیمی نظام کی خرابیوں کی نشان دہی کرکے ان کا حل تلاش کرلیں، اگر ہم اپنے ملک میں ایک بھی عالمی معیار کی جامعہ بنا سکیں، جہاں ذہین اور صلاحیت مند طلباء کو میرٹ کی بنیاد پر ہر طرح کی سہولیات دی جائے تاکہ وہ خالص علمی انداز میں تحقیق کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے طلباء کوئی ایسا اچھوتا کام کرکے دکھائیں جو دنیا بھر میں ہمارے لیے سبکی کے بجائے فخر کا موجب بن سکے۔

آخر میں جون ایلیا مرحوم کے مضمون سے ایک اقتباس: "تم نے تاریخ سے ایسا کون سا معاہدہ کیا ہے کہ تم وقت سے ہٹ کر چلو اور وقت تمہیں راستہ دے دے۔ کیا ہنر کی نقالی ہنر سے جیت سکتی ہے؟ کیا خریدی ہوئی مہارت حقیقی مہارت کا سامنا کر سکتی ہے؟

پیٹ تو آخر اپنا ہے !

ہمارے ہاں پاکستان میں بالعموم میٹھی عید کے بعد سے شادیوں کا سیزن شروع ہوتا ہے جو بقر عید کے بعد تک جاری رہتا ہے۔ پچھلے دنوں کئی شادیوں میں شرکت کا دعوت نامہ ملا۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے اکثر حضرات سے تو معذرت کر لی، لیکن ایک دعوتِ ولیمہ میں شرکت کرنا ہی پڑی۔ ہم دیے گئے وقت پر پہنچے تو دیکھا کہ حسبِ روایت میزبان تک نہیں آئے تھے ۔ آدھے گھنٹے کے بعد میزبان تشریف لائے۔ مہمان اپنے اپنے ذوق کے مطابق گروپ بنا کر بیٹھے تھے۔ مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ہو رہا تھا۔ ہم جس ٹیبل پر تھے، وہاں کافی سنجیدہ اور علمی گفتگو بلکہ بحث ہو رہی تھی۔ اپنی دلیل میں عجب نکتے اور حوالے پیش کیے جا رہے تھے۔ ہم خاموش رہے کہ نہ ایسا تجتی علم ہمارے پاس تھا اور نہ اتنی اونچی آواز رکھتے تھے کہ اتنے شور میں اپنی بات اگلے کے کان میں انڈیل سکیں، سو سن کر سر دھنتے رہے۔ تقریباً سوا گیارہ بجے کھانا شروع ہونے کا اعلان ہوا اور .... اور پھر وہ ہڑبونگ مچی کہ بقول کسے چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ ساری بقراطیت، سارے فلسفے قورمے۔بریانی کی خوشبوؤں میں تحلیل ہو گئے۔ سوٹ بوٹ پہنے، باوقار، مہذب لوگ کھانا لگنے کی آواز سنتے ہی وحشی درندوں کی طرح کھانے کی میز پر چڑھ دوڑے۔ بوٹی سے بوٹی اچھلتی تھی، توند سے توند ٹکراتی تھی۔ الامان الحفیظ کیا نظارہ تھا !

کسی دانشور نے بالکل صحیح کہا ہے کہ دستر خوان، سفر اور معاملات کسی بھی شخص کے اندرون کو جانچنے کے بہترین وسیلے ہیں۔آپ دیکھیں گے کہ ایک شخص کا حلیہ بڑا مہذب، باتیں بڑی شاندار اور انداز بڑے پر شکوہ ہوتے ہیں۔ چہرے پر بے نیازی ایسی کہ جیسے کسی کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن آپ کبھی ان کے ساتھ دستر خوان پر بیٹھیں، کبھی ان کے ساتھ سفر کریں یا کوئی معاملہ ان کے ساتھ کرکے دیکھیں تو ایک ایک کرکے سارے ملمع اترتے جائیں گے۔ بہرحال یہ ہمارا آج کا موضوع نہیں، آج تو ہم بات کرنا چاہ رہے ہیں کھانے کی ناقدری کے بارے میں اور خصوصاً شادی میں کھانے کی ناقدری کے بارے میں۔

شادیوں کا کھانا شاید بہت سے لوگوں کا آخری کھانا ہوتا ہے۔ کبھی کبھار تو یوں لگتا ہے جیسے شادی میں جانے کے دو ہی اہم مقاصد ہیں۔ ایک کھانا کھانے سے پہلے کھانے کے بارے میں اندازے لگانا، اور دوسرا کھانا آنے پر اس پر ٹوٹ پڑنا۔ ویسے تو کھانا کھانے کا وقت ہی دیکھنے کے قابل ہوتا ہے لیکن اس سے پہلے کا وقت بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہوتا ایسے میں لوگ بار بار اس دروازے کی طرف دیکھتے ہیں جہاں سے کھانا لانے والوں کا نزول ہوتا ہے۔ یہ وقت گذارنا بھی کئی لوگوں کے لیے بڑا مشکل کام ہے۔

ویٹر پہلے تو کھانے کی ڈشوں کے نیچے لیمپ رکھے گا پھر ان میں گرم پانی ڈالے گا پھر پلیٹیں اور کہیں آخر میں جا

کر قابوں کے ڈھکنے کھلنے کی کرخت مگر انتہائی مطلوب آواز سنائی دیتی ہے۔

ہمارا تو بلڈ پریشر چوں کہ ہائی رہنے لگا ہے، اور شادیوں کے کھانے میں نمک خوب ہوتا ہے۔ اس لیے مجبوراً اب ہم مقابلے میں نہیں اترتے اور گویا مہذب بننے کی اداکاری کرتے ہیں۔ خیر تو اس دن نفسا نفسی کا منظر دیکھتے ہوئے ہم چپکے بیٹھے خوبانی کے میٹھے سے انصاف کر رہے تھے۔ اور ہماری ٹیبل میں پلیٹوں کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ ہم نے اندازہ کیا تو انکشاف ہوا کہ تین قسم کے سالن، بریانی، نان، رائتہ، سلاد، چٹنی اور کولڈ ڈرنک کا انتظام کیا گیا تھا! یوں اگر ایک میز کے گرد چار آدمی ہیں تو کم از کم دس پندرہ پلیٹیں ٹیبل پر تھیں اور ہر پلیٹ کم ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کناروں سے ابلی پڑ رہی تھی۔

یقیناً کوئی کتنا ہی پیٹو ہو، تین چار لبالب پلیٹ کھانا نہیں کھا سکتا۔ اور کھانا بھی وہ جس میں شوربہ کم اور ڈھیروں ڈھیر مرغ کی ٹانگیں زیادہ لشکارے مار رہی ہوں، یعنی فل مرغن غذا! لیکن جب اتنا کھایا نہیں جا سکتا تو نکالا کیوں جاتا ہے؟ تو اس کا آسان جواب ہے ندیدہ پن جسے آپ حرص کہہ لیں، جو ہمارے دل کے نہاں خانوں میں چھپی بیٹھی ہے، اور جس کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔ پھر ہوتا کیا ہے؟ بمشکل تھوڑا تھوڑا ہر پلیٹ سے چکھا ہی ہوتا ہے کہ معدہ ساتھ

چھوڑنے لگتا ہے۔ تھوڑی دیر اور اپنے اوپر جبر کیا جاتا ہے، لیکن کب تک؟ آخر جوٹھے سالن سے بھری پلیٹیں یونہی پڑی رہ جاتی ہیں جو بالآخر کچرے کی نذر ہو جاتی ہیں۔ ایک طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ پوری دنیا میں غذا کی قلت ہو رہی ہے۔ ہزاروں بچے روزانہ بھوک سے یا غذائی کمی سے موت کے منہ میں جا رہے ہیں۔اور دوسری طرف حال یہ ہے کہ صرف امریکہ میں 50 فی صد خوراک کوڑے کی زینت بنتی ہے۔ برطانیہ میں 20 ملین ٹن خوراک ضائع کر دی جاتی ہے۔ جاپان میں 101.6 ارب ڈالر مالیت کی خوراک تلف ہو جاتی ہے۔ برصغیر میں کھانا ضایع کرنے کے اپنے ڈھنگ ہیں، جس میں سرفہرست شادی ہے۔ پاکستان کا حال تو سب کے سامنے ہے، پڑوسی ملک ہندوستان بھی اس معاملے میں پیچھے نہیں۔ ایک ایک حالیہ جائزے کے مطابق صرف بنگلور میں ہر سال شادیوں میں نو سو پچاس ٹن غذائی اشیاء ضائع ہو جاتی ہیں۔ ہر برس تقریباً اسی ہزار شادیاں ہوتی ہیں اور ہر شادی میں اوسطاً ایک تہائی کھانا ضائع ہوتا ہے۔یعنی سالانہ تین سو اتنالیس کروڑ روپے کا کھانا شادیوں میں برباد ہوتا ہے جب کہ وہاں بھوک اور غذائی قلت کا حال ہمارے ہاں سے بھی بدتر ہے۔

ایک تحقیق کے مطابق ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے بڑے شہروں میں جس

قدر خوراک کا ضیاع ہوتا ہے اس کے دسویں حصے سے دنیا میں بھوک سے مرنے والے لاکھوں افراد کو دووقت کا کھانا فراہم کیا جا سکتا ہے۔ غذا کو کچرے میں پھینکتا ہوا انسان اس بات سے لاتعلق ہے کہ ٹھیک اسی لمحے بے شمار انسان بھوک سے مر رہے ہیں۔

بھوک سے مرنے والے انسانوں کے اعداد و شمار ہوش ربا ہیں اور دور جدید کے انسان کی بے حسی پر ماتم کناں بھی، صرف شمالی کوریا میں اب تک پچاس لاکھ افراد قحط کے ہاتھوں ہلاک ہو چکے ہیں۔ اس وقت بھی ۵۱ لاکھ سے زائد انسان افریقی ممالک میں مرنے کے قریب ہیں۔

پاکستان غذائی قلت کے شکار سولہ ممالک کی فہرست میں شامل ہے۔ مشیر عالمی ادارہ صحت کے مطابق پاکستان میں غربت، مہنگائی کی وجہ سے عوام کو بنیادی خوراک تک رسائی نہیں۔ اسی وجہ سے پاکستان میں پانچ سال سے کم عمر پینتالیس فیصد بچے غذائی قلت کا شکار ہیں۔ اس لیے بحثیت ایک مسلمان ہماری ذمہ داری ہے کہ کھانے کی ناقدری سے خود بھی بچیں اور دوسروں کو بھی سمجھائیں تا کہ اضافی خوراک اس انسان کے پیٹ میں چلی جائے جو خالی ہے۔

اوپر پاکستان میں غذائی قلت سے متعلق آپ نے رپورٹ پڑھی، اب حیرت انگیز طور پر اس کے برعکس ایک اور رپورٹ ملاحظہ فرمائیے جوان حضرات و خواتین کے لیے ہے جو شادیوں میں، آئے دن ہوٹلنگ میں، اور گھر میں مرغ مسلم سے حلق تک پیٹ

بھرتے ہیں۔جی ہاں ! طبّی ماہرین نے پاکستانیوں میں بڑھتے ہوئے موٹاپے کو قابلِ تشویش قرار دیا ہے۔ان ماہرینِ صحت کا کہنا ہے کہ پاکستان کی لگ بھگ پندرہ سے اٹھارہ فی صد آبادی موٹاپے کا شکار ہے۔ موٹاپا جو "امّ الامراض" ہے، بلاشبہ ہائی بلڈ پریشر، ذیابیطس، امراضِ قلب، کینسر اور جوڑوں کے درد سمیت کئی سنگین امراض کا سبب بنتا ہے۔اور اس موٹاپے کی کوئی جینیاتی وجہ نہیں بلکہ الم غلم کھانا اور خوب کھانا ہے۔ سو میرے ہم وطنو! کسی اور کے لیے نہ سہی اپنی صحت کے لیے ہی سادہ کھانے کو اور ضرورت کے مطابق کھانے کو ترجیح دیں۔آیندہ کسی شادی میں جانا ہو تو ہمارا یہ شعر گنگنا لیجیے گا

تکہ آئے یا بریانی آئے

ہاتھ ہولے رکھنا ہے

کھانا چاہے غیر کا ہو

پیٹ تو آخر اپنا ہے

فحاشی کی اصل تعریف اور وزیر اطلاعات کا اعتراف

دنیا کے ہر ملک میں وقتاً فوقتاً کوئی نہ کوئی قومی اہمیت کا ایشو سر اٹھاتا رہتا ہے جسے عموماً پارلیمنٹ میں بحث مباحثہ کرکے حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور نیت میں اخلاص ہونے کی وجہ سے بحث کا کوئی نہ کوئی مثبت نتیجہ بھی سامنے آ جاتا ہے لیکن پاکستان شاید وہ واحد ملک ہے ،جہاں پالیسی بحث کسی حل کی تلاش کے لیے نہیں ،بلکہ محض "چسکے" لینے کے لیے ہوتی ہے۔اور چونکہ ہماری پارلیمنٹ کا دوسرا نام یار لوگوں نے "مچھلی بازار" رکھ چھوڑا ہے، اس لیے ہمارے ہاں اکثر قومی مسائل پر مباحثہ پارلیمان میں نہیں بلکہ ٹی وی اسکرین پر لائیو ہوتا ہے ، گویا عوام کو زیادہ "باخبر" رکھنے کے جنون میں مبتلا میڈیا کسی بھی حساس موضوع پر بحث کو بیچ چوراہے پر لے آتا ہے۔

ذرا یاد کیجیے،اب سے آٹھ دس سال پہلے کے دور کو، جب ملکی فضا میں ایک لفظ "دہشت گردی" نے ہلچل مچا رکھی تھی۔ ایک طرف دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد اپنی دہشت گردی کے عملی ثبوت بے گناہ انسانوں کے خون کی ہولی کھیل کر دے رہا تھا تو دوسری طرف ملک عزیز پاکستان کے نامی گرامی دانشور لفظ "دہشت گردی" کے معنی متعین کرنے کے لیے بحث ومباحثہ کر رہے تھے.... نتیجہ کیا

انکلا؟ کچھ نہیں

اب پھر پچھلے سات ماہ سے ہمارے ہاں ایک بحث چھڑی ہوئی ہے،اور وہ یہ کہ "فحاشی" دراصل ہے کیا بلا؟

ہوا یوں کہ اب سے چند مہینے پہلے میڈیا کے ضابطہ اخلاق اور غیر اخلاقی پروگرامز سے متعلق ایک کیس کی سماعت کرتے ہوئے عدالت عظمیٰ نے پیمرا کو جو کہ ملک میں الیکٹرانک میڈیا کو کنٹرول کرنے کا ادارہ ہے، حکم دیا کہ تمام فحش نشریات بند کر دے۔ پیمرا کے چیئرمین نے کمالِ ہوشیاری سے فحش کی تعریف سے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ فحاشی کی تعریف متعین کرنے کیلئے ایک مباحثہ کرانا چاہتے ہیں۔ وہ خوب جانتے تھے کہ اس طرح کے مباحث کا نتیجہ کیا نکلنا ہے؟ سو وہی ہوا سپریم کورٹ کے حکم پر پیمرا اور کچھ مذہبی اور سماجی دانشوروں کے درمیان "فحاشی" کی تعریف کے ضمن میں خوب بحث ہوئی، لیکن نتیجہ کیا نکلا.... حسب روایت کچھ نہیں

مباحثہ میں ایک طرف مذہبی اور سماجی دانشوروں میں اوریا مقبول جان، طلعت حسین اور انصار عباسی صاحب تھے جو دراصل خود میڈیا کے ہی نمائندے اور سکہ بند صحافی ہیں۔ان کے ساتھ قاضی حسین احمد اور محمد حسین محنتی بھی تھے،جب کہ دوسری طرف پیمرا کے عہدیداران، ان کے چیئرمین ڈاکٹر عبدالجبار، جاوید

جبار اور ڈاکٹر مہدی حسن وغیرہ تھے۔ دونوں طرف سے دلائل دیے گئے، نادر نکات پیش کیے گئے لیکن حسب روایت اس مجلس میں یہ لوگ "فحاشی" کی کسی متفقہ تعریف پر نہیں پہنچ سکے۔ لبرل طبقے کے نمائندہ جاوید جبار اور مہدی حسن کہتے ہیں کہ پاکستانی میڈیا میں کچھ بھی قابل اعتراض نہیں، اور میڈیا اپنی ذمہ داری بخوبی ادا کر رہا ہے۔ قاضی صاحب نے فحاشی کی تعریف یہ بیان کی جو مواد گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر نہ دیکھا جاسکے وہ فحش ہے۔ لیکن اس تعریف سے پھر یہ سوال سامنے آتا ہے کہ کون سا گھر انہ اس سلسلے میں معیار کے طور پر رکھا جائے، قاضی صاحب کا گھر یا لبرل طبقے کے نمائندے مہدی حسن کا گھر.... کیوں کہ اس تعریف کے رُو سے ہر شخص یا گھرانے کے نزدیک فحاشی کا اطلاق الگ الگ مواد پر ہوگا۔ قاضی صاحب کے سامنے اپنا گھر یا اپنے جیسے دوسرے شرفاء کے گھرانے ہوں گے، جہاں شرعی پردہ کیا جاتا ہوگا اور وہاں تو شاید گھر والوں کے ساتھ بیٹھ کر خبریں بھی نہیں دیکھی جاتی ہوں گی لیکن اس کا کیا کریں کہ اس ملک میں ایسے گھرانے بھی ہیں جہاں شراب اتنی ہی عام ہے جتنا عام گھروں میں پانی.... اسی ملک میں ایسے لوگ بھی بستے ہیں جو مغرب کی تقلید میں ہم جنسیت پر فخر کرتے ہیں بلکہ کچھ شرم ناک خبروں سے تو یہ تک معلوم ہوا ہے کہ مغربی ثقافتی یلغار کی رو میں کچھ لوگ اپنے محارم کے ساتھ بھی تعلقات رکھنے میں کوئی عار محسوس نہیں

کرتے اور وہ مغربی ممالک کے طرز میں یہاں بھی "اسپرم بینک" کے طرز پر کھلی بے حیائی کے مراکز قائم کرنے کے آرزو مند ہیں! اب بھلا بتایئے ان لوگوں کا اپنے اہل کے ساتھ بیٹھ کر "کچھ" بھی دیکھنا کچھ معنی رکھتا ہے؟

اب اتفاق دیکھیے کہ قاضی صاحب نے فحاشی کی جو تعریف بیان کی، آج کئی ماہ بعد ۴۱ دسمبر کے اخبارات میں بالکل یہی الفاظ وزیر اطلاعات جناب قمر زمان قائرہ نے بھی ادا کیے۔ انہوں نے کہا کہ ٹی وی چینلز واقعی فحاشی پھیلا رہے ہیں۔ ایسے پروگرام نشر کیے جاتے ہیں جو میں اپنی بیٹی کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتا۔ یہ بات ایک دینی تشخص رکھنے والے شخص نے نہیں بلکہ اس شخص نے کہی ہے جو اکثر لبرل طبقے کی نمائندگی کرتا ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اتنی بڑی بات کہنے کے باوجود وہ اگلے ہی جملے میں پھر بات کو الجھا دیتے ہیں اور فحاشی کو ملکی و علاقائی کلچر سے ڈیفائن کرنے لگتے ہیں۔

دراصل یہ وہی راگنی ہے جو اس بحث کے ضمن میں نہ صرف پیمرا عہدیداران اور مذہبی دانشوروں کے درمیان ہوئی بلکہ قوم کے مختلف طبقات کے درمیان ہر میڈیا پر خوب چلی۔ ہر جگہ فحاشی کی تعریف کو دین سے سمجھنے کے بجائے بحث کو ثقافت، سماجی روایات اور معاشرے میں عام چلن کے اعتبار سے سمیٹا گیا۔ لبرل طبقے کے مطابق فحاشی کی تعریف متعین کرنے میں مختلف علاقوں اور طبقوں کے

مختلف کلچر یعنی ثقافت و اقدار کو مد نظر رکھنا ہو گا۔ان کی دلیل یہ ہے کہ شہروں میں اگرچہ متوسط گھرانوں میں کچھ پردہ ہوتا ہے لیکن انہی متوسط گھرانوں کی اکثریت عشق و محبت پر مبنی ٹی وی ڈرامے بھی شوق سے دیکھتے ہیں اور شادی بیاہ کی رسم و رواج میں گھر کی بہو بیٹیاں ڈانس بھی کرتی ہیں جسے خوشی کے نام پر کچھ برا نہیں سمجھا جاتا۔تو پھر وہی ڈانس گانا جب ہم اسکرین پر دکھائیں تو وہ فحش کیسے ہو گیا۔وہ کہتے ہیں کہ دیہاتوں میں عام عورت بغیر پردے کے کھیتوں میں مزدوری کرتی ہے اور کسی کو اعتراض نہیں ہوتا تو ہم اسکرین پر عورت کو دکھائیں تو وہ کیوں مسئلہ ہے؟

دہشت گردی" ہو یا" فحاشی"ان کی تعریف کے لیے ہم اپنے آپ کو معیار بنائیں گے تو" آپ کا مخالف کبھی اس بات کو نہیں مانے گا کیوں کہ اس کا گھر اور اس کی تربیت اس کو کچھ اور باور کراتا ہے.... اسی طرح اگر ہم یہ کہیں کہ عوام کی اکثریت اسلام پسند ہے اور وہ یہ سب نہیں چاہتے تو یقین مانیے ، دل کو بہلانے کو تو خیال اچھا ہے لیکن حقائق اس کے بالکل برعکس ہیں۔ کیوں کہ اب "عوام" وہ تیس سال پہلے والے عوام نہیں رہے۔ اُس وقت جو لوگ صرف پی ٹی وی کی نشریات دیکھتے تھے اور وہ بھی بچوں کے ساتھ نہیں، آج کیبل پر شوق سے سب کے ساتھ بیٹھے انڈین فلمیں دیکھتے ہیں ۔ وہ لوگ جو تیس پینتیس سال پہلے خبریں پڑھنے والی نیوز کاسٹر کا دوپٹہ سرکنے پر اعتراض کرتے تھے، آج اپنی معصوم

بچیوں کو ٹھمکا لگاتے دیکھ کر پھولے نہیں سما رہے ہوتے۔

غرض مذہبی و سماجی دانشوروں سے یہی درخواست ہے کہ وہ لبرل طبقے کی ہوشیاری کو سمجھیں اور اپنے آپ کو، صلحاء و علماء کو یا عوام کی اکثریت کو دلیل نہ بنائیں، کیوں کہ وہ آپ کو دنیا بھر کی اور مسلمان ممالک کی مثالیں دینا شروع کر دیں گے، اس لیے سیدھا سیدھا قرآن وسنت سے دلیل دیں اور بس.... آیئے دیکھتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک فحاشی کیا ہے ؟کیوں کہ یہی فحاشی کی اصل تعریف ہے۔

☆ اللہ تبارک وتعالیٰ کا ارشاد ہے: مفہوم "اللہ حکم کرتا ہے انصاف کرنے کا اور بھلائی کرنے کا اور قرابت والوں کے دینے کا اور منع کرتا ہے بے حیائی سے اور نامعقول کام سے اور سرکشی سے۔ (النحل: ۹۰

☆ حضور کا ارشاد ہے کہ مجاہرہ (کھلم کھلا فحش حرکات کرنا یا پوشیدہ حرکات کا اعلان کرنا) کرنے والوں کی معافی نہیں۔ (گھر گھر میں چلتے یہ ڈانس شوز، ڈراموں میں بے ہودہ ڈائیلاگ، یہ میاں بیوی کا کردار کرنے والے اصلاً نامحرم مرد و عورت کا بے ہودہ (مساس کیا فحاشی کے زمرے میں نہیں آتا؟ کیا یہ سب مجاہرہ نہیں؟

☆ فحاشی کے برعکس اسلام نے حیا کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اسے جزوایمان قرار

دیا۔ نبی اکرمصلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے۔ دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ اگر تجھ میں حیا نہیں تو جو جی میں آئے کر۔

☆ اسلام نے فحاشی و بے حیائی کے ہر مظہر کو ممنوع قرار دیا ہے۔اس نے نہ صرف زنا بلکہ اس کے محرکات تک کو ممنوع قرار دیا۔اسی لیے زنا کے محرکات یعنی بدنظری، گندا لٹریچر، بیہودہ گوئی، حتیٰ کہ گندے خیالات تک سے بھی روکا گیا ہے۔

میڈیا کی ہلاکت خیزیاں

پاکستان میں میڈیا کو فحاشی پھیلانے کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے پچھلے کالم میں کچھ عرض کیا تھا، لیکن امریکا میں پچھلے ہفتے ہونے والے سانحہ سے یہ خیال ہوا کہ میڈیا خاص طور پر الیکٹرانک میڈیا کے بھیانک اثرات اس سے زیادہ ہمہ گیر ہیں، جتنا ہم سوچتے ہیں۔ امریکا جس نے تمام اقسام کے میڈیا کو نہ صرف بے حد ترقی دی بلکہ اس کے دور رس اثرات کو سمجھتے ہوئے گویا اس کو ایک قسم کے انتہائی پر اثر ہتھیار میں تبدیل کر دیا۔ وہ ہتھیار جس کے ذریعے کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں کی مخصوص ذہن سازی کر کے اپنا مطلب بخوبی نکال لیا جاتا ہے، اور وہ اربوں انسان اس ذہنی افیون کے اثرات اس طرح قبول کرتے ہیں کہ بے انتہا ظلم دیکھتے ہوئے بھی خاموش تو کیا رہتے ، اس کے برعکس مظلوم کو ظالم سمجھ لیتے ہیں، یوں اس میڈیا نے بلا مبالغہ بموں اور میزائلوں سے زیادہ ہلاکت پھیلائی ۔ عراق میں مبینہ ہتھیاروں کا جھوٹا دعویٰ ہو یا افغانستان میں طالبان کے عوام پر فرضی ظلم کے قصے، پاکستانی ایٹم بم کا دہشت گردوں کے ہاتھوں میں جانے کا واویلا ہو یا سوات میں لڑکی پر کوڑے مارنے کی جھوٹی ویڈیو.... یہ سب اسی میڈیا کی کارستانی ہے جس نے صبح شام جھوٹ کی کاشت کی اور اپنے مذموم مقاصد یں اس حد تک کامیاب ہو گئے کہ سچ ، سچ ہوتے ہوئے بھی

دفاعی پوزیشن پر آگیا۔

معاشرہ پر اثر انگیزی کے حوالے سے فلم سب سے پر اثر میڈیا ہے۔ فلم کا اثر ناظرین پر بہت جلد اور گہرا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے حکومتوں نے فلمکے میڈیا کو بھی بھرپور استعمال کیا۔ خصوصاً امریکا نے ہالی ووڈ کے ذریعے اپنے نظریات مثلاً نیو ورلڈ آرڈر اور اپنی ثقافت کو پوری دنیا پر مسلط کیا۔ مثال کے طور پر روسیوں کے خلاف جہادِ افغانستان سے چونکہ امریکیوں کا مفاد بھی وابستہ تھا، اس لیے اس نے اس وقتکی مقبول ترین فلم سیریز کے کردار "ریمبو" کو ایک فلم میں جہاد افغانستان کا ہیرو بنا کر پوری دنیا کو اپنے مقصد سے ہم آہنگ کر لیا۔ اسی طرح یہودیوں نے بھیہٹلر کو دنیا کا ظالم ترین آدمی باور کرانے اور اپنے اوپر ڈھائے جانے والے فرضی ظلم کی داستان 'ہولوکاسٹ' کو عالمگیر طور پر منوانے کے لیے پرنٹ میڈیا کو استعمال کیا اور اس میں جان ڈالی فلم کے ذریعے سے۔ جب یورپ میں ناظرین ہولو کاسٹ پر بننے والی فلموں کو دیکھ کر سینما سے باہر آتے تو ان کے چہرے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہوتے اور ان کے دل میں یہود کی مظلومیت کا نقشہ اچھی طرح جم چکا ہوتا۔ اس کے علاوہ بھی سنیما نے گزشتہ چار دہائیوں میں نفرت، بدلہ، طاقت کے زور

پر کچھ بھی کر لینے کا تصور ،اسمگلنگ اور منشیات مافیا کی طاقت، عریانیت، فحاشی، ذو معنی جملے،گالی گلوچ اور بیہودہ مکالموں تک کا سفر طے کرکے پوری دنیا کی تین نسلوں کو متاثر کیا اور ان کی اخلاقیات کو تباہ کر دیا۔جرائم پر بننے والی فلمیں جرائم کی بیخ کنی کی بجائے جرائم کی نرسری بن گئیں۔ نوجوانوں نے ان فلموں سے عصمت دری، قتل ،تاوان اور اغواکے نت نئے طریقے سیکھے۔انہوں نے ان فلموں سے انسپائر ہو کر جلد دولت مند بننے کے لیے ڈکیتی ،چوری ،دن دہاڑے قتل اور لوٹ مار کو اپنا مقصد زندگی بنایا۔اسی طرح عشق محبت کے نام پر بننے والی ہوسناک فلموں نے جوان لڑکیوں اور لڑکوں کو آوارگی ،عیاشی، عیش کوشی، عصمت فروخت کرنے اور عزت لوٹنے کی جانب راغب کیا جس کے نتیجہ میں آج صرف امریکا میں ہر منٹ میں اوسطاً تینخواتین عصمت فروخت، کرتی ہیں جبکہ اس سے زائد کے ساتھ زنا بالجبر کیا جاتا ہے۔

سینما کی شر انگیزی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سینمادماغ پر افیون جیسا اثر کرتا ہے۔اور اس کے اسی غیر معمولی تاثر کی وجہ سے تشدد، ڈکیتی، عصمت دری، خود کشی اور قتل وغارت یہ سب جرائم اتنے پرکشش ہو جاتے ہیں کہ پھر کچے ذہن کے نوجوان حقیقی زندگی میں اس کی نقل کرنے لگتے ہیں، یوں جیمزبانڈ جیسے قاتل اور عیش پرست کردار کو اپنا ہیرو سمجھنے والے نوجوان المیوں کو جنم دیتے ہیں۔

ایسے ہی المیے پچھلے دو سالوں سے تواتر کے ساتھ امریکا میں جنم لے رہے ہیں۔
دوسروں کے آشیانوں کو پھونک کر تماشا دیکھنے والے خود اپنے ہی ہتھیار کا شکار ہو گئے ہیں۔جی ہاں امریکا میں کسی عام شہری کی طرف سے فلمی تشدد و قتل وغارت سے متاثر ہو کر عوامی مقامات پر فائرنگ کرکے معصوم لوگوں کی جان لینے کے گزشتہ دو سال میں دس بڑے واقعات ہوئے ہیں۔ قابلعبرت بات یہ ہے کہ اس طرح کے سب سے زیادہ واقعات تعلیمی اداروں میں ہوئے اوراس قتل و غارت کے ذمہ دار قاتل تقریباً سب ہی نوجوان اورطالب علم تھے۔ سب سے بڑا واقعہ 2007ء میں ہوا، جب ورجینیا ٹیک یونیورسٹی میں ایک ۳۲ سالہ طالب علم نے اندھا دھند فائرنگ کرکے بتیس طلبا واساتذہ کی جان لے لی تھی۔اس واقعہ کے بعد تو لائن لگ گئی۔ امریکی نوجوانوں کو قتل وغارت کا یہ طریقہ کار ایسا بھایا کہ پانچ سالوں میں بارہ ایسے واقعات رونما ہوئے جن میں تعلیمی اداروں میں معصوم بچوں کو بے دریغ گولیوں سے بھون دیا گیا۔
تازہ سانحہ ۱۴دسمبر بروز جمعہ کو امریکی ریاست کنیٹی کٹ میں ایک پرائمری سینڈی ہک سکول میں پیش آیا، جہاں زیر تعلیم بچوں کی عمریں پانچ اور دس برس کے درمیان تھیں۔ اس دن اسی اسکول کے سابقہ طالب علم بیس سالہ ایڈم لانزا کی وحشیانہ فائرنگ کے نتیجے میں بیس بچوں سمیت چھبیس افراد ہلاک ہو گئے۔ یہ کسی بھی امریکی اسکول یا یونیورسٹی میں ورجینیا سانحہ کے بعد دوسری بدترین

ہلاکت ہے۔ درندگی کے اس واقعے میں ہلاک ہونے والے بچوں کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ سے یہ معلوم ہوا کہ یہ بچے جنگی اسلحے کا نشانہ بنے ہیں۔

جمعہ کو ہونے والے واقعہ سے پہلے ماہ جولائی میں امریکی ریاست کولوراڈو کے شہر ڈینور میں ایک سینما کے باہر بھی کچھ منظر فلموں جیسا ہی بن گیا تھا، جب فلم بیٹ مین کے پریمیئر شو سے پہلے چوبیس سالہ نوجوان نے (جس نے فلم بیٹ مین کے ولن کا ماسک پہن رکھا تھا) فلم بینوں پر اندھا دھند گولیاں برسا کر بارہ افراد کو ہلاک اور پچاس کو زخمی کر دیا تھا۔

ماہرین کے مطابق ان سارے واقعات میں ہونے والی قتل وغارت کا مقصد صرف اپنی وحشی ذہنیت کو تسکین پہنچانا تھا۔ فلم کے ہیرو اور ولن کی طرح اسلحے کے زور پر طاقت کا مظاہرہ اور بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلنے کی مہمیز انہیں ایکشن فلموں سے ہی ملی تھی۔ کولوریڈو والا واقعہ تو خاص طور پر اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس میں قاتل نے ولن کا ماسک پہن رکھا تھا۔

سانحہ سینڈی ہک اسکول کے بعد امریکا میں وائٹ ہاؤس سمیت تمام سرکاری عمارات پر قومی پرچم سرنگوں کر دیا گیا۔ اور باراک اوباما نے آنسو بہاتے ہوئے کہا کہ ان کا دل اتنا ہی دکھی ہے کہ جتنا متاثرہ بچوں کے والدین ہوں گے۔

اے کاش ! وہ اور ان کے پیش رواں لاکھوں بچوں کے والدین کا دکھ بھی محسوس کر لیتے جو ان کی میڈیا وار کے نتیجے میں عراق میں اور پھر بعد ازاں افغانستان میں ہلاک ہوئے۔ اے کاش ! وہ ان فلسطینیوں بچوں کا بھی غم کھا لیتے جو انہی کے سرپرستی میں .... وحشی اسرائیل کی درندگی کا شکار ہوتے ہیں

مکافات عمل کا عالمگیر قانونِ قدرت حرکت میں آ گیا ہے اور شاید اپنے ہی میڈیا گزیدہ نوجوانوں کے ہاتھوں اپنے معصوم بچوں کا قتل عام ہی اُن کو اس بات کا احساس دلا دے کہ دوسروں کے گھروں کو آگ لگانے والے کا اپنا گھر بھی جلتے دیر نہیں لگتی۔

سربلندی کے لیے محنت شرط ہے

الیگزنڈر فلیمنگ 1881ء میں سکاٹ لینڈ کے ایک دیہاتی گھر میں پیدا ہوا۔اس نے تعلیم اسکاٹ لینڈ اور لندن سے حاصل کی اور بہت جلد ڈاکٹری کی سند حاصل کر لی۔

پہلی اور دوسری عالمی جنگ میں وہ برطانوی فوج میں ڈاکٹر تھا۔ اس وقت طبّی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ کسی ایسی دوائی (اینٹی بایوٹک) کی تلاش تھی، جو مضر صحت جراثیموں کو تو مارے مگر انسانی جسم کو کم سے کم ضمنی اثرات کا سامنا کرنے پڑے۔ فلیمنگ نے اپنی ساری زندگی اس مقصد کے لیے وقف کر دی۔ 1928ء میں اس کے اپنے الفاظ میں اس نے حادثاتی طور پر پنسلین کو دریافت کر لیا۔

ہوا یوں کہ ایک دن وہ جراثیم پہ تحقیق کر رہا تھا۔ جراثیم پہ تحقیق کرنے کے لئے انہیں خاص قسم کی پلیٹوں پہ اگانا پڑتا ہے جنہیں پیٹری ڈش کہتے ہیں۔ جیسے جیسے انکی آبادی بڑھتی ہے پلیٹوں پہ گچھے نمودار ہوتے ہیں۔ جنہیں مختلف تحقیقات کے لئے کام میں لایا جاتا ہے۔ وہ ایک بہت اچھا تحقیق داں تھا، لیکن لیب اتنی صاف نہیں رکھ پاتا تھا۔ ایک دفعہ وہ ان ساری پلیٹوں کو ایک جگہ جمع کر کے چھٹیوں پہ چلا گیا جب واپس لوٹا تو کیا دیکھتا ہے کہ جراثیم کی ایک پلیٹ پہ پھپھوند لگ گئیتھی۔ جب اس نے غور کیا تو اسے اندازہ ہوا کہ

پھپھوند نے ان جراثیم کو کھا لیا ہے جو اس نے اگائے تھے۔ یہ ایک بہت بڑی دریافت تھی۔

فلیمنگ نے پھپھوند میں سے اس مرکب کو الگ کیا اور اسے پینسلین کا نام دیا۔ لیکن وہ اسے اس مقدار میں نکالنے میں ناکام رہا جس سے اسے کسی بیماری کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ اس مرکب پہ ایک اور کیمیا دان نے کام کیا اور پینسلین کو زیادہ مقدار میں خالص کرنے کے قابل ہوا۔ اس طرح سے اس کی دریافت کے دس سال بعد وہ دوا سامنے آئی جس نے لاکھوں لوگوں کو ان بیماریوں سے بچایا، جو جراثیم سے ہوتی ہیں۔ یہ پہلی اینٹی بائیوٹک یا ضد حیاتیات دوا تھی۔ شروع میں پنسلین کو اتنی اہمیت نہیں دی گئی لیکن دوسری جنگ عظیم میں اسے صنعتی پیمانے پر تیار کیا گیا اور اس نے اتحادیوں کی فتح میں اہم کردار ادا کیا۔

فلیمنگ کے اپنے الفاظ میں یہ ایک حادثہ تھا، لیکن اسے آپ اس کی کسر نفسی کہہ لیں یا اور کچھ، کیوں کہ عقلاء بخوبی جانتے ہیں کہ کبھی کوئی حادثہ نہیں ہوتا اور کوئی کام اتفاقیہ نہیں ہوتا۔ اس کارخانہ قدرت میں ہر کام کا کوئی نہ کوئی سبب موجود ہوتا ہے۔ چاہے وہ براہِ راست خالق کائنات کا اَمر ہو جیسے کہ یہ پوری کائنات وجود میں آئی اور چاہے وہ اُس کا بنایا ہوا علت و معلول

کا نظام ہو۔ مختصر یہ کہ صحیح رخ اور صحیح نیت کے ساتھ محنت کی جائے تو قدرت اسے کبھی ضایع نہیں کرتی۔ فلیمنگ کے اچانک پنسلین دریافت کرنے کے علاوہ بھی سائنس کی دنیا یں ایسی بے شمار مثالیں ہیں، جن میں کوئی اہم سائنسی دریافت بظاہر کسی حادثہ یا اتفاق کی مرہون منت نظر آتی ہیں۔ لگے ہاتھوں ایک مثال اور پڑھیے:

کانسٹینٹن فالبرگ ایک کیمیا دان، کول تار کو نئے طریقے سے استعمال کرنے کے طریقوں پہ کام کر رہا تھا۔ ایک تھکا دینے والے دن وہ آفس سے ہاتھ دھوئے بغیر گھر آیا اور کھانا کھاتے ہوئے اسے احساس ہوا کہ اس یں عجیب مٹھاس ہے۔ اس نے اپنی بیوی سے پوچھا تو اس نے صاف انکار کر دیا کہ کوئی مٹھاس شامل نہیں کی گئی۔ فالبرگ نے اپنے کالے ہاتھ دیکھے، کچھ سوچا اور اگلے دن پھر جا کر اپنی لیب میں لگ گیا۔ یہ مٹھاس سیکرین کی تھی۔ شکر کی طرح کی ایک مصنوعی مٹھاس جو شکر نہیں ہوتی اور کول تار میں موجود ہوتی ہے۔ آج کی سینکڑوں شوگر فری مصنوعات اسی سیکرین کی مرہون منت ہیں۔

یہ صرف دو مثالیں ہیں، اس کے علاوہ بھی اگر آدمی اب تک کی تمام ایجادات و اختراعات کے بارے میں مطالعہ کرے تو حیران رہ جاتا ہے۔ تقریباً تمام ہی سچے سائنس دان اس بات کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں کہ جو ان کی ایجاد کا اہم ترین نکتہ تھا، وہ انہیں ایک طرح سے الہام ہوا۔ دماغ میں بغیر کسی سیاق و سباق

کے اچانک ایک کوندا سا لپکا اور مسئلہ حل ہو گیا۔ کچھ تو خواب میں متشخص ہوئیں۔ کیلولے جو بڑا کیمیا دان تھا، اس کا واقعہ اس ضمن میں مشہور ہے۔ نیوٹن کا سیب کے گرنے سے کشش ثقل کو جاننا بھی بظاہر ایک اتفاقی واقعہ تھا۔

ان تمام مثالوں سے کیا یہ مطلب لیا جائے کہ کہ بس آدمی ہاتھ پیر چھوڑ کر پڑا رہے، اور اللہ پاک اس کی جھولی میں کوئی ایسی چیز ڈال دیں جو اس سے پہلے کسی کو نہ دی گئی! ہرگز نہیں۔ بے شک ایک مسلمان ہونے کے ناطے ہمارا یقین ہے کہ محض کسی کی ذاتی محنت اور سوچ و فکر سے کچھ نہیں ہو سکتا، جب تک کہ اللہ تعالیٰ کا حکم نہ ہو۔ اور اسی طرح ہمارا یہ بھی ماننا ہے کہ محض اتفاق بھی کسی چڑیا کا نام نہیں ....

یعنی دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔ خالق کائنات کی سنت یہ ہے کہ وہ طلب کے بقدر نوازتے ہیں۔ چاہے وہ اپنی ذات کا عرفان ہو یا اپنی مخلوقات کا علم۔ یعنی کوئی فن ہو یا علم دونوں کا نزول صرف ان لوگوں پر ہوتا ہے جو مدارس، خانقاہوں میں یا لیبارٹریوں میں، علم کی آرزو میں رقص بسمل کی طرح تڑپتے رہتے ہیں۔ ایک وقت مقررہ پر ان کی آرزو پوری ہو جاتی ہے۔ جب طلبِ صادق پرکھ لی جاتی ہے اور محنت اس "معیار پر پہنچ جاتی ہے تو ان کے کسی ساتھی کو "سرا

مل جاتا ہے۔ اور پھر یہ مشرکہ ملکیت ان کی معرفت دنیا میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ یعنی طلب صادق، سوچ فکر اور محنت ہماری ہوتی ہے، حکم اس کا۔ کوشش ہم کرتے ہیں، نتیجہ وہ پیدا فرماتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ہم صرف محنت کے زور پر کامیاب ہو جائیں۔ سر مارتے رہنے سے کچھ نہیں ہوتا، لیکن مارتے رہنا پڑتا ہے کہ سر مارتے رہنے والے کے پاس ہی پیغام پہنچتا ہے۔

خود فلیمنگ کے الفاظ میں، انسان ہل چلا سکتا ہے، زمین تیار کر سکتا ہے پانی دے سکتا ہے، بوائی کر سکتا ہے لیکن بیج پھاڑ کر اس میں سے بوٹا پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ یہ علم علیم مطلق کے پاس ہے۔ اگر اس نے چاہا اور اس نے پسند فرمایا تو یہ بوٹا پیدا کرنے کا علم بھی انسان کو عطا کرے گا۔ مگر اپنی مرضی سے، اپنی پسند سے، اپنے منتخب وقت کے مطابق۔"

محنت اور اس کے مثبت نتائج کی ڈھیروں مثالیں پچھلی چند صدیوں میں ہمیں مشرق میں تو گاہے گاہے ہی ملیں گی، وہ بھی انفرادی لیکن مغرب کا دامن اس سے مالا مال ہے۔ یہ ہمارے چاروں طرف پھیلی ہوئی ایجادات جن سے ہم سب مستفید ہو رہے ہیں، کس کی محنت کا شاخسانہ ہے؟ ہم نے کبھی سوچنے کی کوشش ہی نہیں کی تو اس سے آگے عملی قدم کیسے بڑھاتے۔ سائنس کی بے شمار شاخوں میں سے صرف ایک شعبہ طب کو دیکھ لیں۔ 1928ء میں جب فلیمنگ نے پنسلین دریافت کر کے بلا مبالغہ اربوں

بیمار انسانوں کے درد کا مداوا کیا، اس وقت سے آج 2012ء تک طب کے میدان میں جو بے اندازہ ترقی ہوئی ہے،اس میں ہمارا حصہ تو کیا ہوتا، ہم تو اس کی نقل بھی سلیقے سے نہیں کر سکے۔ طب کی دو بڑی شاخیں ایلوپیتھک اور ہومیو پیتھک میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔ لے دے کر طب یونانی ہے، وہ بھی اپنی بنیاد میں (جیسا کہ نام سے ظاہر ہے) یونانیوں سے اخذ ہے۔ ہاں کچھ افراد ایسے ضرور ہیں جنہوں نے اس کی شاندار خدمت کی، مثلاً حکیم اجمل، حکیم عبداللہ اور حکیم محمد سعید وغیرہ لیکن ان کے بعد دہائیاں گزر گئیں، طب یونانی ہیں اور کوئی بطل جلیل پیدا نہ ہوا۔ ہاں شہروں کی دیواروں اور اخبارات کے اشتہارات کو دیکھ کر یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ جسم انسانی کے تمام نظاموں کو چھوڑ کر ایک "خاص" نظام کی قوت اور علاج میں ہم نے شاید پوری دنیا میں سب سے زیادہ مہارت حاصل کر لی ہے!!

اس لیے اگر ہم ماضی کی طرح اقوام عالم میں سربلندی چاہتے ہیں تو سستی اور طفیلا پن چھوڑنا ہوگا اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرتے ہوئے ہر شعبہ میں جم کر محنت کرنا ہو گی۔ اس طرح کچھ بعید نہیں کہ اگلی چند دہائیوں میں ہم غلامی کا طوق اپنے گلے سے اتار پھینکیں اور کوئی ہمیں حقیر انداز میں "پاکی" کہنے کی جرات نہ کر سکے۔

نشے کا "باعزت" دھندا

تقریباً بیس سال پہلے 1992ء کی بات ہے۔ان دنوں میں اسکول سے آنے کے بعد ایک میڈیکل اسٹور پر کچھ وقت دینے لگا تھا۔ چھ مہینے کے اس مختصر عرصے میں کافی مشاہدات ہوئے۔ نہ صرف ڈاکٹروں کی جناتی لکھائی سمجھ میں آنے لگی، بلکہ اس کام سے متعلق اور بھی" بہت کچھ" سمجھ آگیا۔ باقی تو پھر کبھی .... فی الحال تو موضوع سے متعلق کچھ عرض کرنا ہے۔

مذکورہ میڈیکل اسٹور اندرونِ سندھ میں واقع اس شہر کا دوسرے نمبر کا بڑا اسٹور تھا۔چند ہی دنوں میں ہم نے یہ نوٹ کر لیا کہ شام ڈھلتے ہی وہاں عجیب اول جلول حلیے کے لوگ آتے اور آٹھ دس روپے مالک اسٹور کو تھماتے۔ وہ ورکرز کو "ڈائزی پام" نامی چھوٹی چھوٹی پیلی گولیاں انہیں دینے کو کہتااور ساتھ ساتھ ان پر ہنستے ہوئے جملے بھی کستا۔ورکر ڈائزی پام کے بڑے سے ڈبے سے آٹھ دس گولیاں (صحیح طرح یاد نہیں، مگر اتنا یاد ہے کہ فی گولی ایک روپے سے کم قیمت کی تھی) اس شخص کو پکڑا دیتا۔ایک ساتھی کے ذریعے پتہ چلا کہ یہ گولیاں گہری نیند کے لیے استعمال ہوتی ہیں اور یہ مخصوص ٹولی کے لوگ اسے سستے نشے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اس دن معلوم ہوا کہ دنیا کے غم بھلانے اور

بغیر پروں کے آسمانوں کی سیر کے لیے ضروری نہیں کہ آدمی بدنام اڈوں کے چکر لگائے بلکہ چمکتے دمکتے لائسنس یافتہ میڈیکل اسٹورز بھی یہ مقصد بخوبی پورا کر سکتے ہیں اور وہ بھی نسبتاً بہت سستے میں۔ چند ہفتوں میں اور بھی انکشافات ہوئے کہ 'ڈائزی پام' کے علاوہ اور بھی بیسیوں دوائیں اس مقصد کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ تمام قسم کی سیڈیٹیو سکون دینے والی]، اینٹی ڈیپریسنٹ [بے چینی دور کرنے والی] ، نیند لانے والی، اینٹی] الرجک، بھوک لگانے والی اور انستھیزیا سے متعلقہ ادویات کو بطور نشہ آوراشیاء کے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ دوائیں ہیں، جو مخصوص علامات والے مریضوں کو ان کے ڈاکٹر ایک مخصوص مقدار یں ہی تجویز کرتے ہیں، اور وہ بھی ڈھیروں ہدایات کے ساتھ۔ لیکن نشئی اُن دنوں بغیر کسی نسخہ کے بہت آسانی سے یہ دوائیں کسی بھی میڈیکل سے لے لیتے، اور پھر ساری رات اور دن کا بڑا حصہ بغیر دَم مارے نت نئی دنیاؤں کی سیر محض چند روپوں میں کر لیتے۔

کچھ دنوں میں ایک اور عجیب بات یہ معلوم ہوئی کہ صرف نشئی کہلانے والے نچلے طبقے کے لوگ ہی اپنا نشہ دواؤں کے ذریعے پورا نہیں کرتے بلکہ ہر کلاس کے لوگ ان کا غلط استعمال کرتے ہیں۔ بس ہر کلاس کا انتخاب جدا جدا ہوتا ہے۔ 'ڈائزی پام' جیسی سستی گولیاں بالکل نچلے طبقے کی پسندیدہ تھیں۔ کبھی سختی ہوتی یا یہ دوا ختم ہوتی تو 'ایول' جیسی اینٹی ہسٹامین [الرجی، خارش کی عام

دوا] کی بھاری مقدار سے بھی یہ لوگ کام چلا لیتے اور اس سے اپنا نشہ پورا کرتے۔
درمیانے طبقے کے لوگ زیادہ تر 'ایٹی ون' اور 'ویلیئم' پسند کرتے تھے۔جب کہ اونچے طبقے کے لوگ اس سے بھی زیادہ مہنگی دوا لیتے۔اہم بات یہ ہے کہ یہ ساری دوائیں عموماً بغیر نسخے کے بیچی جاتی تھیں۔یا زیادہ سے زیادہ اپنے ہاتھ سے کسی کاغذ پر نام گھسیٹا اور دکاندار کو پکڑا دیا۔ دکاندار کو بھی صرف اپنے" دھندے "سے مطلب تھا۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ بغیر ڈاکٹری نسخہ کے کوئی دوا بیچنا غیر قانونی ہے، اور خصوصاً وہ مخصوص دوائیں جو نشے کے لیے بھی استعمال ہو سکتی ہیں، ان کو تو بغیر کسی مستند ڈاکٹر کے نسخہ کے بیچنا نشہ بیچنے کے برابر جرم ہے، وہ اِن دواؤں کو بغیر نسخہ کے دگنی تگنی قیمت پر بیچتا۔
اس وقت تک ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ان "کیف آور" دواؤں میں کھانسی کے شربت بھی شامل ہیں۔ اس کا اندازہ ہمیں اس وقت ہوا جب میٹرک کے بعد ہم ایک ڈرگ مینوفیکچرز کمپنی میں پارٹ ٹائم ملازم ہوئے۔ وہاں ہم لیبارٹری میں تھے۔اکثر وہاں یہ شکایت سننے میں آتی تھی کہ گودام سے کھانسی کا ایک شربت بہت چوری ہوتا ہے....
اور اکثر وہاں آدھی یا پوری پی ہوئی خالی باتلیں ملتی تھیں۔ سپروائزر نے ہمارے استفسار پر بتایا کہ یہ کارکن پیتے ہیں، کیوں کہ اس شربت کی زیادہ مقدار سے خمار اور بے خودی طاری جاتی ہے!

لیب کے دنوں میں ہی ہمیں یہ معلوم ہوا کہ کھانسی کے ان مخصوص سیرپ میں ڈیکسا میتھاسون [جو کہ سٹیرائید کلاس کی ڈرگ ہے] اور کلوروفینرامین [جو کہ اینٹی ہسٹامین ہے] وغیرہ شامل ہوتی ہے۔اس کے علاوہ دوسرے کھانسی کے سیرپ میں ایفی ڈرین بھی ہوتی ہے جو کہ برانکو ڈائیلیٹر ہوتی ہے۔ یہ تمام کھانسی کے شربت اپنے ذیلی اثرات یعنی اعصابی سکون، دماغ بھاری ہو کر خمار طاری ہونا اور گہری نیند] کی وجہ سے غلط] استعمال ہوتے ہیں۔اس کے بعد ہمیں بتدریج یہ بھی معلوم ہوا کہ "تجربہ کار" لوگ ایک کیمسٹ کی طرح بخوبی جانتے ہیں کہ کن دواؤں کی کتنی مقدار کو،آپس میں کس طرح ملایا جائے کہ نشہ دوآتشہ ہو جائے.... آہستہ آہستہ معلوم یہ ہوا کہ نئے زمانے کے ساتھ چلتے ہوئے اب نشئیوں نے بھی نشے کے نئے طریقے دریافت کر لیے ہیں....مثلاً صمد بونڈ نشہ، اسپرٹ نشہ اور ٹنکچر نشہ !

شاید روایتی چیزیں بہت مہنگی ہو گئی تھیں یا ان کے ساتھ جڑی بدنامی تھی، جن کی وجہ سے خاص طور پر متوسط طبقے کے نشئیوں نے دوسرے راستے دریافت کیے۔ بھنگ کے ساتھ بھنگی، چرس کے ساتھ چرسی، افیون کے ساتھ افیونچی اور ہیروئین کے ساتھ ہیروئنچی کی اصطلاح گویا گالی بن گئی تھی۔ ان نشوں کے حصول کے لیے دنیا والوں کی نظر سے چھپنا پڑتا تھا۔ پولیس اور اینٹی نارکوٹکس والوں

کاالگ ڈر تھا۔ غرض بدنامی، مہنگائی اور بہت سارے عوامل تھے جن کی وجہ سے دوااور دوسری عام چیزوں کو بطور نشہ کے استعمال کا رواج عام ہوتا چلا گیا۔ایک نوجوان بغیر کسی ضرورت کے صرف نشہ کے لیے اینٹی ڈپریسنٹ دوا کو اپنے دوست احباب بلکہ قریبی عزیزوں کے سامنے بھی آسانی سے لے سکتا ہے اور لطف یہ ہے کہ اسے طعن و تشنیع کی بجائے ہمدردی کے کلمات سننے کو ملتے ہیں۔ بلکہ اب تو ایک قدم آگے بڑھ کر اس طرح کی دوائیں لینا بطور فیشن اور اسٹیٹس کی نشانی بن گیا ہے۔ لوگ سمجھنے لگے کہ اس طرح کی دوائیں لینا امیر اور ماڈرن ہونے کی نشانی ہے۔ فلاں یہ مہنگی دوا لیتا ہے، اس لیے کہ اسے ٹینشن زیادہ ہے اور ٹینشن اس لیے زیادہ ہے کہ اس کا بزنس بڑا ہے!!

بہر حال دھیرے دھیرے ہم ان باتوں کو بھول گئے تھے، لیکن آج اٹھارہ سال گزرنے کے بعد پچھلے ماہ لاہور کے واقعہ نے اور صرف ایک مہینہ کے بعد گوجرانوالہ کے سانحہ نے ہمیں سب کچھ یاد دلا دیا۔ گوجرانوالہ میں کھانسی کا شربت پینے سے چونتیس افراد جاں بحق ہوئے۔جب کہ گذشتہ ماہ ہونے والے واقعہ میں لاہور کے علاقے شاہدرہ میں کھانسی کا ٹائنو نامی شربت پینے سے اکیس افراد جاں بحق ہوئے تھے۔لاہور والے واقعہ کے فوراً بعد سیرپ بنانے والی فیکٹری کے مالکان کو گرفتار کر لیا گیا تھا مگر بعد ازاں لیبارٹری رپورٹ سے کسی گڑبڑ کا پتہ نہیں چلا۔ اس کے بعد وزیرِاعلیٰ پنجاب شہباز شریف کے مشیرِ صحت خواجہ سلمان

رفیق کے حکم پر مرنے والے افراد کے خون، پیشاب اور ان کے معدوں سے لیے گئے اجزاء ٹیسٹ کے لیے فرانزک لیبارٹری بھجوائے گئے تو معلوم ہوا کہ انہوں نے ٹائنو سیرپ کے ساتھ بھنگ، چرس، الکوحل، افیون اور نیند آور گولیوں کا استعمال بھی کیا تھا۔ یعنی کھانسی کے شربت کو شاید صرف نشہ میں میڈیم کے طور پر اور نشہ کو مزید بڑھانے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ کیوں کہ اگر سیرپ میں دوا کے ضروری اجزاء مناسب مقدار میں تھے تو پھر موت کی کیا وجہ تھی؟ ڈاکٹر حضرات بخوبی جانتے ہیں کہ صرف کھانسی کے شربت کی زیادہ مقدار سے عموماً موت واقع نہیں ہوتی، صرف ہلکا سا نشہ اور پھر بالآخر گہری نیند طاری ہو جاتی ہے، اس لیے ان اموات کی لیبارٹری رپورٹ کی روشنی میں یہی توجیہ کی جا سکتی ہے کہ ان لوگوں نے دوسری منشیات کے ساتھ کھانسی کے شربت کو نشہ کا عمل تیز کرنے کے لیے پیا ہو گا۔ مگر حالت بگڑنے پر اصل بات بتانا ممکن نہیں ہوا، اس لیے کھانسی کے شربت کا نام لے دیا گیا۔ اس کے بعد آگے کا کام میڈیا نے کیا۔ میڈیا ٹرائل نے تحقیقات سے پہلے فیصلہ سنا دیا اور بہر طور شربت بنانے والوں کو موردِ الزام ٹھہرا دیا گیا۔ بے شک پاکستان میں ادویات سازی کا عمل ہرگز قابل رشک نہیں ہے، لیکن الیبارٹری رپورٹس کے بعد یہی سمجھ میں آ رہا ہے (اگر لیبارٹری رپورٹ غلط ہے اور سیرپ میں کوئی گڑبڑ ہے تو پھر بات دوسری ہے) کہ خصوصاً لاہور سانحہ کے اصل ذمہ دار مرنے والے خود اور میڈیکل اسٹور مالکان ہیں۔ اگر میڈیکل اسٹور والے قانون کی پابندی کریں کہ کسی کو

بغیر نسخہ کے خصوصاً مخصوص دوائیں نہ دیں تو حرام نشہ کے طلب گار چاہیں بھی تو مخصوص دوائیں حاصل نہیں کر سکتے۔ مگر قانون کی پابندی تو تب ہو جب قانون کے رکھوالے چاہیں۔ اگر قانون کی ناک کے نیچے خود ان کی سرپرستی میں ہر طرح کا کام ہو رہا ہو تو پھر شکوہ کس سے کیا جائے!

عام" آدمی اور اس کے مطالبات"

مجھے ناظم آباد جانا تھا۔ کافی دیر سے کشمیر روڈ پر کھڑا کسی سواری کا انتظار کر رہا تھا۔بڑی دیر بعد ایک خالی رکشہ آتا نظر آیا تو اسے اشارہ کیا۔ ڈرائیور ایک بزرگ تھے۔ان سے معاملہ طے کیااور رکشہ ناظم آباد کی راہ چل پڑا۔حسبِ عادت ڈرائیور بابا سے تعارفی بات شروع کی۔ وہ بھی باتونی تھے یا شاید اندر سے بھرے ہوئے۔ ان کا نام شوکت علی تھا۔ساٹھ کے پیٹے میں تھے اور بلدیہ کے رہنے والے تھے۔ بات سی این جی کی کمیابی سے شروع ہوتے ہوئے رفتہ رفتہ حالاتِ حاضرہ پر آ گئی۔ وہی مہنگائی اور شہر کے بدترین حالات کا ہم رونا رویا کیے۔ڈرائیور بابا اپنی کہتے رہے، ہم اپنی۔ اسی اثنا میں انہوں نے ایک بات ایسی کہی کہ ہماری صحافیانہ رگ پھڑک اٹھی۔ کہنے لگے: "اس سے اچھا تو فوجی دور تھا۔" ہم چونک گئے۔ بے چارے کچھ پڑھے لکھے تھے لیکن اتنی مشہور بات نہ جانتے تھے جسے چند دن پہلے صدر زرداری بھی دہرا چکے ہیں یعنی "بدترین جمہوریت آمریت سے بہتر ہوتی ہے۔" ہم نے انہیں یہ مقولہ سنایا اور پھر ان کی معلومات میں اضافہ کرتے ہوئے بڑی سلیس اردو میں انہیں بتایا کہ جمہوریت تو دراصل عوام کی حکومت کو کہتے ہیں یعنیآپ کی اپنی حکومت، پھرآپ آمریت کو پسند کیوں کر رہے ہیں؟ وہ جواب میں بڑے مضحکہ خیز انداز میں ہنس دیے مگر چپ رہے۔ اپنی اس بات

کے خالی پن کا ہمیں خود بھی احساس تھا سو ہم بھی خاموش ہو گئے۔

جمہوریت یعنی عوامی حکومت پاکستان جیسے ممالک میں کتنی عوامی ہوتی ہے، ہم خوب جانتے ہیں۔ جتنی سیاسی جماعتیں ہیں،ان میں سے ایک دو چھوڑ کرباقی نہ صرف اپنی تشکیل میں آمرانہ خصوصیات رکھتی ہیں بلکہان میں سے کسی کیبھی ترجیحات میں "عام آدمی" کہیں نہیں ہے۔ وہ عام آدمی جو ان کی پارٹی یا کسی بھی پارٹی سے تعلق نہیں رکھتا، وہ تو خیر کسی گنتی میں ہی نہیں ہے لیکن خود 'پارٹی کارکنان' کی حیثیت بھی سربراہ پارٹی کے نزدیک ایک کل وقتی غلام کی سی ہے، جسے صرف عام انتخابات سے پہلے ہی اپنے درشن کرانے کی سعادت بخشی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عوام کی اکثریتکو اب کسی نعرے اور کسی نظام سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے۔ جس کا واضح ثبوت عوام کی اکثریت کاانتخابات سے لاتعلق رہنا ہے۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ووٹرز ٹرن آؤٹ بمشکل تمام 30 سے 35 فیصد رہتا ہے۔ یعنی 65 سے 70 فیصد ووٹرز جنہیں "اصل" عوام کہا جا سکتا ہے، وہ ووٹ ہی نہیں ڈالتے۔ اور پھر کسے پتا ہے کہ جو تیس سے پینتیس فیصد ووٹ پول کیے جاتے ہیں، ان میں سے کتنے حقیقی ووٹ ہوتے ہیںاور کتنے بوگس؟ چلیے حقیقی اور بوگس ووٹ کی بات چھوڑیے، یہ تیس فیصد ووٹ جو پول کیے گئے، ان میں سے جیتنے والی پارٹی کو کتنے فیصد ملتے ہیں، جن کی مدد سے وہ حکومت بناتی ہے؟ان اعداد و شمار کے عجب گورکھ دھندے کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کیسے کہہ سکتے

ہیں کہ جو حکومت انتخابات کے بعد بنتی ہے، وہ عوامی حکومت ہوتی ہے یا دوسرے الفاظ میں عوام کی اکثریت کی نمایندگی کرتی ہے!

حقیقت تو یہ ہے کہ بار بار کے منفی تجربات کی وجہ سے اب عام آدمی کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ کون کرسی پر متمکن ہے اور کون جلوس فرما رہا ہے؟ انہیں اس سے بھی کچھ لینا دینا نہیں کہ انقلاب کا نعرہ لگا کر کون لانگ مارچ کر رہا ہے۔ بابا شوکت علی بہت کم پڑھا لکھا ہے، اس لیے پارلیمانی، صدارتی، آمریت اور جمہوریت کی اصطلاحات سے واقف نہیں ہے۔ وہ جدید سیاسی نظریات کے بارے میں بھی کچھ نہیں جانتا۔ وہ تو صرف یہ جانتا ہے کہ اسے شام میں اپنے بچوں کے لیے روزی کما کرلے جانا ہے اور اسے اپنی بچی کی مناسب جگہ شادی کرنی ہے، ٹین کی چھت پختہ کرنی ہے اور بچوں کو کچھ پڑھانا ہے۔

اور صرف کراچی کا رکشہ ڈرائیور شوکت علی ہی نہیں بلکہ بہاولپور کا مزدور بشیر اجٹھو، مردان کا موچی سمندر خان ہو یا خضدار کا دکاندار محمد علی بروہی، کسی کو بھی حکومت کے آنے جانے یا کسی پارٹی سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ تو روز اپنے "عام" ہونے کے جرم کی سزا پاتے ہیں۔ انہیں بیچ چوراہے پر گن پوائنٹ پر لوٹا جاتا ہے اور ذرا سی مزاحمت کرنے پر بے دریغ گولی مار دی جاتی ہے۔ ان کی تذلیل کی جاتی ہے، انہیں مہنگائی کے عذاب تلے کچلا جاتا ہے،

انہیں رشوت ستانی کے ذریعہ ستایا جاتا ہے اور ان کو پانی، بجلی اور گیس کی لوڈ شیڈنگ کے ذریعے اتنا رگڑ دیا جاتا ہے کہ انہیں کسی قائدِ انقلاب کی خوش بیانی سے متاثر ہونے کا وقت ہی نہیں ملتا۔

اس عام آدمی کی توقعات اور مطالبات بہت تھوڑے اور بے حد سادے ہوتے ہیں، اس کا کچھ اندازہ اس دلچسپ واقعہ سے ہوتا ہے جو پاکستان کے سابق وزیراعظم فیروز خان نون نے اپنی آپ بیتی "چشم دید" میں اپنی انتخابی مہم کے ذیل میں لکھا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

"میرے پہلے انتخاب کے دوران ایک شخص نواحی گاؤں سے میرے والد کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ دو سال ہوئے میری گدھی کھو گئی ہے اور میرا پورا شک ایک کمہار پر ہے جو نور پور نون میں رہتا ہے۔ اس نے مطالبہ کیا کہ یا تو کمہار سے وہ گدھی واپس لے دیں یا پھر اس کی تلافی میرے والد کریں، بصورت دیگر وہ مجھے ووٹ نہیں دے گا۔اس شخص نے میرے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور نہ ہی اسے میری پارٹی سے کوئی غرض تھی۔"

غرض اس عام آدمی کے مطالبے کچھ زیادہ نہیں ہیں۔ بس عزت محفوظ رہے، انصاف ملنے کا یقین ہو اور اشیائے خورونوش کی قیمت اس کی پگڑی سے زیادہ بلند نہ ہو، یعنی روٹی، کپڑا اور مکان کے ساتھ عزت اور انصاف کی ضمانت .... بس یہ

اشیائے خمسہ اسے چاہییں اور بس۔اب جو بھی ان مطالبوں کو پورا کر دے وہ اس کے لیے دیدہ و دل فرشِ راہ کرنے کے لیے تیار ہے۔چاہے مطالبہ پورا کرنے والا جمہوریت کی راہ سے آئے یا "کسی" اور راہ سے.... وہ سب کو جھک کر کورنش بجا لانے کو تیار ہے۔

امن کی آشا اور بھارت کا جنگی جنون

کہا جاتا ہے کہ منافق کی دوستی اچھی ہوتی ہے نہ دشمنی۔ چوں کہ منافق کی زبان پر رام رام ہوتا ہے اور بغل میں چھری، اس لیے جب گاڑھی چھننے لگے تو منافق آپ کے کندھوں پر سواری گانٹھ لیتا ہے اور ہر طرح کے فائدے حاصل کرتا ہے مگر جیسے ہی موقع ملے تو ایسے ایسے کچوکے لگاتا ہے کہ چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا ہے۔ وہ مارتا ہے تو نہ رونے دیتا ہے نہ فریاد کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

ہمارے پڑوسی ملک بھارت کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی ہمارے ساتھ تعلقات کی نوعیت عجیب ہے، پل پل گرگٹ کی طرح رنگ بدلتی ہوئی۔ کبھی محبت کی پینگیں اور امن کی آشا کے گیت تو کچھ ہی دنوں میں الزامات اور دھمکیوں کا سلسلہ اور پھر اس سے آگے بڑھ کر عسکری حملے.... دراصل یہ دورخی پالیسی بھارت کی منافقت کو واضح کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں پاکستان نے ہمیشہ خلوص کے ساتھ بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر بنانے پر توجہ دی اور اس کے لیے اکثر اپنے حقوق کو چھوڑنا بھی گوارا کیا، لیکن اس یک طرفہ عشق کے مظاہرے کا صلہ کیا ملتا ہے؟ بلااشتعال فائرنگ، ہمارے فوجیوں کے سینوں پر سوراخ اور بدترین انجام کی دھمکیاں.... ابھی پچھلے مہینے کی ہی بات ہے کہ بھارت کو 'موسٹ فیورٹ نیشن' کا درجہ دینے کا

فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ان کے ساتھ تجارتی تعلقات معمول پر لانے اور درآمدات پر پابندی ختم کرنے کے لیے معاہدے کیے جا رہے تھے۔اور دو ہفتے پہلے ہی تو ان کی مصنوعات کی نمائش کراچی میں ہوئی تھی۔ لیکن ہمارے یہ سب اقدامات بے کار ثابت ہوئے اور بھارتی فوج اور میڈیا کے دلوں میں چھپی نفرت بہت جلد سامنے آ گئی۔لائن آف کنٹرول پر حالیہ کشیدگی کا آغاز چھ جنوری کو ہوا تھا جب پاکستانی فوج کے مطابق بھارتی افواج نے لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزی کرتے ہوئے باغ کے قریب حاجی پیر سیکٹر کے علاقے میں سواں پترا چوکی پر حملہ کیا، جس کے نتیجے میں لانس نائیک اسلم شہید جبکہ متعدد اہلکار زخمی ہوگئے۔ پاک فوج کی جوابی کارروائی پر بھارتی فوجی اسلحہ پھینک کر فرار ہوگئے جسے قبضے میں لے لیا گیا، پاکستان نے دراندازی کے اس سنگین واقعہ پر شدید احتجاج کیا۔ بھارت نے اس پر کسی قسم کی معذرت اور تحقیقات کا وعدہ کرنے کی بجائے اگلے روز یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ پاکستان کے فوجیوں نے مقبوضہ کشمیر میں داخل ہو کر اس کے ایک فوجی کا سر قلم اور دوسرے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا ہے۔بات صرف الزام تراشی تک محدود نہیں رہی بلکہ بھارتی قیادت حسب معمول دھمکیوں پر اتر آئی ۔ لیکن عجیب ترین بات یہ ہے کہ بھارت کی طرف سے اس واقعے کے حوالے سے انتہائی متضاد بیانات آئے۔ پہلے یہ پروپیگنڈا کہ پہل پاکستان نے کی اور ان کے فوجیوں کو مار کر لاشوں کی بے حرمتی کی، پھر دوسرے ہی دن بھارتی وزارت داخلہ نے کنٹرول لائن پر کشیدگی کا ذمہ دار بھارتی فوج

کو قرار دیا۔ نادرن کمانڈر کے ترجمان راجیش کے کالیاکے مطابق چرچنڈا سب سیکٹر کے
.بریگیڈیئر گلاب سنگھ راوت کی جارحیت کی وجہ سے کنٹرول لائن پر تناؤ کی صورتحال پیدا
ہوئی اور انھوں نے بھارتی میڈیا کی رپورٹس کو بے بنیاد قرار دے کر مسترد کر
دیا۔انتہائی حیرت کی بات ہے کہ اتنے اہم اعتراف کے باوجود کچھ بھارتی حکمران
کانگریس کی گیدڑ بھبھکیاں بند نہ ہوئیں۔ ہمیں 1971ء کی جنگ یاد دلائی گئی اور
سنگین نتائج کی دھمکی دی گئی۔

بھارت کی طرف سے جارحانہ بیانات کے تابڑ توڑ حملوں کے جواب میں پاکستانی حکومت
اور فوج نے نہ صرف دوٹوک الفاظ میں بھارتی الزامات کو مسترد کیا، بلکہ حسب روایت
اس واقعہ کی تفتیش اقوام متحدہ کے آبزرور مشن سے کرانے کی پیشکش بھی کی، لیکن
بھارتی سورماؤں نے اس پیشکش کو بالکل مسترد کر دیا۔اور پھر اگلے روز ہفتہ کو کشیدگی
میں اس وقت اضافہ ہوگیا جب ایئر چیف انیل کمار نے کہا کہ اگر صورتحال ایسی ہی رہی
!تو دوسرے آپشن پر بھی غور کرنا پڑے گا

یہ دوسرا آپشن کیا ہے؟ یہ کھلی جنگ کی دھمکی ہے اور یہ ہمارے لیے کچھ غیر متوقع بھی
نہیں۔جو لوگ بھارتی ذہنیت سے واقف ہیں، وہ خوب جانتے ہیں کہ آزادی کے بعد سے
اب تک بھارت نے سترہ کروڑ افراد کی اس عظیم مملکت کو ہنوز تسلیم نہیں کیا ہے۔
.برصغیر کی تقسیم کا داغ ابھی تک اس کے سینے سے دھواں

دیتا ہے، حالاں کہ برصغیر کی تقسیم بھارت اور پاکستان کے مفادات کے عین مطابق تھی اور اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اکثریتیں اپنے اپنے علاقوں میں، اپنے اپنے نظریے کے مطابق کسی فساد اور عناد کے اندیشوں سے بالاتر ہو کر اطمینان کی زندگی گزاریں مگر بھارت نے سکون کا کوئی لمحہ ہمیں گزارنے نہیں دیا، اس نے ہم پر عرصہ حیات تنگ کر دیا، اس نے کبھی ہمارے دریاؤں پر ڈیم بنا کر ہمارے سبزہ زاروں کو ریگزار بنانا چاہا تو کبھی ہمارے لوگوں میں تعصب کا بیج بو کر فسادات کی آگ بھڑکائی۔ اس نے ہمارے ملک کے حصے بخرے کرنے کی مسلسل سازشیں کیں اور پھر بالآخر ایک دل فگار دسمبر کی سرد رات کو اپنے مکروہ عزائم میں بڑی حد تک کامیاب ہو گیا اور ہمارا ملک دو لخت ہو گیا۔ ہمیں یقین ہے کہ تحقیقات کے بعد دنیا کا کوئی دیانت دار مبصر اس وقت جاری کشیدگی کا ذمہ دار پاکستان کو نہیں ٹھہرائے گا۔ حیرت اس اَمر پر ہے کہ پینسٹھ سال کی اس کشمکش کے بعد بھی بھارت نے یہ سبق حاصل نہیں کیا کہ پاکستان کو زیر کرنا اور دوبارہ ایک بھارت وَرش تشکیل دینا اب ناممکن ہے۔ اس نزاع کے سبب نہ تو بھارت اپنے پسماندہ علاقوں اور لوگوں کے لیے کچھ کر سکا اور نہ پاکستان کو کچھ کرنے کا موقع دیا۔ دونوں ملکوں کے کثیر عوام ننگے بھوکے رہے اور دونوں ملکوں کا کھربوں روپیہ بھارت کے جنگی جنون کی وجہ سے اسلحہ کی خریداری پر جھونکا جاتا رہا۔ اس پیسے کی بدولت یورپ اور

امریکا کچھ اور ترقی کی سیڑھیاں چڑھ گئے اور ہم کچھ اور پستی میں چلے گئے۔

پاکستان اور بھارت کے بھی کچھ سنجیدہ حلقے اس بات پر متفق ہیں کہ امن دونوں ملکوں کی ضرورت ہے، لیکن کچھ بھارتی انتہا پسند سیاسی جماعتیں اور وہ ممالک ایسا ہرگز نہیں چاہتے جن کے مقاصد پاک بھارت کشیدگی سے جڑے ہوئے ہیں۔ بہرحال اگر اس بار یہ کشیدگی بنا کسی سنجیدہ حل کے ٹل گئی تو آیندہ چند مہینوں یا سالوں بعد پھر اسی قسم کی صورتحال پیدا ہو جائے گی اور یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہ ہو۔ اس خطے کے لوگ اب اس صورتحال سے تنگ آ چکے ہیں۔ اب وہ کسی فیصلے کے خواہاں ہیں۔ اب تو کچھ مایوس لوگ یہ تک کہنے لگے ہیں کہ ایک خونیں معرکہ ان دونوں ملکوں پر قرض ہے، اسے چکا دینا چاہیے۔ اس لیے بھارت کے طالع آزماؤں کو دھمکیاں دینے سے پہلے سوچنا چاہیے کہ انھوں نے آبِ حیات تو پی نہیں رکھا جو جنگ کی آگ ان کے بدن کو نہ چھوئے گی۔ جنگ چھڑی تو تباہی سب جگہ ہو گی۔ ہاں ہمیں یہ طمانیت تو حاصل ہے کہ ہم حق پر ہیں اور ہمارے ارادے بدنیتی سے آلودہ نہیں، لیکن بھارت کے پاس تو اس جنونیت کا کوئی اخلاقی جواز ہی نہیں۔

ہمیں چاہیے کہ ایک خوددار قوم کی طرح حالیہ مسئلہ کو فیس کریں۔ حق پر ہونے کے باوجود معذرت خواہانہ رویہ اختیار کرنا حریف پر اپنی کمزوری ثابت کرنا

ہے۔اس کے علاوہ ہمیں چاہیے کہ اپنے ملک میں ناآسودگیوں کے جہنم کو دور کرنے کے لیے بھی کوئی ہنگامی اقدام کریں، خود سے جنگ کریں اور خود کو اس قدر فعال اور محفوظ بنالیں کہ کوئی حریص نظر آپ کی سمت اٹھنے کی جرات نہ کرسکے۔

عورتوں پر تشدد اور حقوق نسواں کے ٹھیکیدار

وہ دل دہلا دینے والی نسوانی چیخ تھی ، جس سے ہڑبڑا کر میری آنکھ کھلی تھی۔آواز میں بہت درد تھا۔ ابھی یں آواز کی سمت کا تعین کر رہا تھا کہ ایک مردانہ دھاڑتی ہوئی آواز آئی، جس سے معاملہ کچھ سمجھ میں آیا۔آواز سامنے والے فلیٹ سے آرہی تھی، جہاں اکثر گھریلو جھگڑے ہوتے رہتے تھے لیکن اس دن معاملہ تو تکار سے بڑھ کر شاید مار پیٹ تک اتر آیا تھا، جس کا اندازہ مسلسل دردانگیز نسوانیچیخوں سے بخوبی ہو رہا تھا۔ چند لمحات کے بعد ہی آوازیں اتنی بلند ہو گئیں کہ نیچے مجمع جمع ہو گیا۔ خاتون کی آواز میں اتنا درد تھا اور وہ ’بچاؤ بچاؤ‘ کی ایسی صدا لگا رہی تھی کہ میرا چھوٹا بچہ رونے لگا اور میرے دل کو بھی کچھ ہونے لگا۔ میں گھر سے نکلا تو کچھ اور لوگ سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔اب تو یوں لگ رہا تھا کہ وہ جاہل شخص اپنی بیوی کو شاید مار ہی دے گا۔ ہمارے بیل بجانے پر کوئی رسپانس نہیں آیا، سوائے اس کے کہ آوازیں بتدریج کم ہوتی چلی گئیں۔ تھوڑی دیر بعد مجمع چھٹ گیا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ وہ شخص میرے سامنے ہو اور میں اسی بری طرح اس کو ماروں ، جس طرح وہ اپنی اہلیہ کو زودکوب کر رہا تھا۔ یہ کسی دیہات کا منظر نہیں بلکہ شہر کراچی کے وسط میں ناگن چورنگی کے ایک فلیٹ کا منظر ہے، جس میں بظاہر ایکماسٹرڈ ڈگری ہولڈر شخص رہتا ہے۔

خواتین اور بچوں پر تشدد کچھ نئی بات نہیں.... اور تشدد کرنے والے کا جاہل ہونا بھی کوئی ضروری نہیں۔ اصل فرق تربیت کا ہوتا ہے۔ جن گھروں میں بچپن سے یہ بات بچوں کو گھول کر پلا دی جاتی ہے کہ بزرگ اور خاص طور پر عورت چاہے وہ کسی بھی روپ میں ہو، قابلِ احترام ہے، وہاں بچے بڑے ہو کر بلا تخصیص محرم نامحرم عورتوں کی عزت کرتے ہیں، لیکن جہاں تربیت میں نقص ہو، بڑے چھوٹے کی تمیز نہ سکھائی جاتی ہو، خواتین کا احترام نہ بتلایا جاتا ہو، وہاں چاہے دنیا بھر کی ڈگریاں ہوں، ایسا ہی دیکھنے سننے کو ملتا ہے، جس طرح کہ ہم اس گھر میں دیکھتے رہے۔

شاید خواتین اور بچوں پر تشدد کے واقعات مرد حضرات کے مقابلے میں اس لیے زیادہ ہوتے ہیں کہ خواتین اور بچے جسمانی اور سماجی دونوں اعتبار سے کمزور ہوتے ہیں، اور کمزور کو ہر ایک باآسانی دبا لیتا ہے۔ لیکن اس طرح کے واقعات سے ہمارے ہاں فوراً یہ نتیجہ نکال لیا جاتا ہے کہ مرد عورتوں پر تشدد کرتے ہیں۔ لیکن گہرائی میں جا کر کوئی تجزیہ کرے تو اکثر یہی بات سامنے آتی ہے کہ کم از کم ہمارے ہاں عورت پر تشدد کی ذمہ دار ۸۰ فی صد ایک عورت ہی ہوتی ہے۔ جس گھر کا میں نے ذکر کیا، اس گھر کے بارے میں پورے محلے کو معلوم تھا کہ یہاں وہی صدیوں پرانا ساس بہو کا جھگڑا تھا۔
ساس انتہائی سفاک قسم کی

تھیں،اور چوں کہ ان کی اپنی کوئی بیٹی نہیں تھی، اس لیے انہیں کسی کی بیٹی کا احساس بھی نہ تھا۔انھوں نے اپنے بیٹے کی جیسی تربیت کی تھی وہ توظاہر تھی، دلچسپ بات یہ ہے کہ ماں کے کہنے میں آ کر وہ بیوی کو ہی نہیں مارتا تھا بلکہ خود ماں کو بھی خوب برا بھلا کہتا تھا۔ یہ اور اس طرح کے دسیوں دوسرے واقعات سے یہ کہاوت سچ ثابت ہوتی ہے کہ مشرق میں عورت کی سب سے بڑی دشمن خود عورت ہی ہوتی ہے اور مرد کی حیثیت عام طور پر ایک معمول سے زیادہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر کیسز میں وہ خود مظلوم ثابت ہوتا ہے۔

بہرحال وجہ جو بھی ہو، تشدد اور وہ بھی کمزوروں پر، دنیا میں جہاں بھی ہو بہت زیادہ قابل مذمت بات ہے۔ایک سروے کے مطابق دنیا بھر میں ہر تین میں سے ایک عورت اپنی زندگی میں تشدد کی کسی نہ کسی صورت میں مبتلا ہوتی ہے۔ اس سروے میں دنیاکے کسی ملک کا نام نہیں لیاگیا، بلکہ علی العموم بات کی گئی ہے۔ کیوں کہ خواتین پر تشدد ایک عالمی المیہ ہے، اور بے شک اس بزدلانہ اور قبیح فعل کے خاتمے کے لیے ہر طرح کی سنجیدہ کوشش ہونی چاہیے ۔ہمیں اعتراف ہے کہ پاکستان میں بھی عورتوں اور بچوں پر تشدد ہوتا ہے اوراس میں بھی کوئی دو رائے نہیں ہے کہ یہ بہیمانہ تشدد ختم ہونا چاہیے۔ہمارااس کالم کے ذریعے نکتۂ اعتراض تو یہ ہے کہ ہمارے دانشور ہر برائی کو عموماً اسلامی ملکوں اور خصوصاً پاکستان کے ساتھ اس طرح جوڑ دیتے ہیں کہ انہیں سارے

جہاں میں سب سے زیادہ اخلاقی برائیاں مسلمانوں اور خصوصاً پاکستانی مسلمان میں نظر آتی ہیں۔ شاید کوئی اسے خود احتسابی کہے لیکن احتساب غیروں کے کندھوں پر رکھ کر نہیں ہوتا۔ دیکھئے اگر کوئی مسئلہ بین الاقوامی ہے تو اسے عالمی تناظر میں دیکھنا اور حل تلاشنا ہی درست طریقہ ہے اور اس سے کسے انکار ہے کہ خواتین اور بچوں پر تشدد ایک حقیقی مگر عالمی المیہ ہے۔ اب اس عالمی مسئلے کو ایک مخصوص علاقائی مسئلہ کے طور پر پیش کرنا اور پھر اس کے حل کے لیے ساری توپوں کا رخ اس خطے یا قوم کی طرف کر دینا ہرگز انصاف نہیں۔ آئے دن امریکا اور اس کے سفیر اپنے پُرتشدد معاشرے کو بھول کر خاص طور پر پاکستان اور برادر ملک سعودی عرب میں عورتوں اور بچوں پر تشدد کے حوالے سے گاہے بگاہے مذمتی بیانات جاری کرتے رہتے ہیں۔ کوئی امریکا کو اور مغرب کو یہ کیوں نہیں کہتا کہ بھائی آپ پہلے اپنے گھر کی تو خبر لے لو۔ جتنا ظلم عورتوں اور بچوں پر پچھلے سینکڑوں سالوں سے اب تک مغرب میں ہوا ہے، اس کا عشر عشیر بھی مشرق میں اور خصوصاً مسلم ممالکمیں نہیں ہوا۔ آج تاریخ سے ثابت ہے کہ یورپ میں ۱۴۸۴ ء سے ۱۷۵۰ء کے درمیان کم از کم ایک لاکھ عورتوں اور دیگر ذرائع کے دعوے سے دو لاکھ عورتوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ ان عورتوں کو مارنے سے پہلے چڑیل ثابت کیا جاتا تھا۔ ان عورتوں کی کثیر تعداد بوڑھی اور غریب عورتیں ہوتی تھیں۔ چڑیلوں کی کچھ نشانیاں مقرر کر لی گئی تھیں جیسے چہرے پہ تل یا مسہ یا کسی اور قسم کا نشان حتی کہ کیڑے کے کاٹے

کانشان بھی اس میں شمار تھا۔ اس کے ساتھ اگر ان کے پاس بلی موجود ہو تو پھر کیا کہنا۔ اس سلسلے میں ایک شخص جس کا ذکر خاصا کیا جاتا ہے، اس کا نام میتھیو ہوپ کنس تھا، پیشے کے حساب سے ایک ناکام وکیل.... مگر وہ چڑیلوں کو مارنے میں بہت کامیاب رہا اور ایک ایک دن میں انیس مظلوم عورتوں کی حیات کا چراغ گل کرتا رہا۔ اسے وہاں کے مذہبی حلقوں کی حمایت حاصل تھی اور اس کے بدلے میں اسے مختلف ریاستی حاکموں کی طرف سے کثیر رقم ملتی تھی۔ تاریخ میں اس کا نام "چڑیل کھوجی جنرل" کے طور پہ مشہور ہے۔

آج ڈھائی سو سال بعد یورپ کا حال شاید اس سے بھی بدتر ہے۔ ہمارے ہاں خواتین کے چہروں پر تیزاب پھینکنے کا ظلم ہے اور ان چہروں کو ہائی لائٹ کرکے آسکر ایوارڈ جیتا جا سکتا ہے تو مغرب بھی اس ظلم سے خالی نہیں۔۔برطانیہ جیسے "روشن خیال" معاشرے ہیں ایک ماڈل کیٹی پایپر کے چہرے پر اس لیے تیزاب پھینک دیا جاتا ہے کہ وہ ناجائز تعلق رکھنے پر تیار نہیں۔ جس کی سزا کے طور پر پہلے اس کے ساتھ زبردستی زنا کیا جاتا ہے، پھر بدترین تشدد کرکے اس کے چہرے پر تیزاب پھینک دیا جاتا ہے۔ یہ حملہ دن کی روشنی میں لندن میں ہوا تھا، جس سے کیٹی کی ایک آنکھ ضایع ہو گئی اور اسے علاج کے لیے تیس سے زائد بار آپریشن کے عمل سے گزرنا پڑا۔ وہ ان تیس لاکھ عورتوں میں سے ایک ہے جو ہر سال.برطانیہ میں زنا بالجبر، گھریلو تشدد، انسانی خرید وفروخت یا کسی بھی اور

طرح کے سنگین تشدد کا شکار ہوتی ہیں۔ فرانس میں بھی خواتین کے ساتھ زیادتیوں کے ہر سال پچیس ہزار واقعات ہوتے ہیں۔ امریکا بھی اس بہیمیت میں کسی سے پیچھے نہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ وہاں کے مادر پدر آزاد معاشرے میں عورتوں پر تشدد میں سب سے زیادہ جنسی زیادتی کا عنصر ہے۔ معصوم بچوں پر تشدد بلکہ ان کے قتل و غارت میں بھی امریکا پوری دنیا میں بدنام ہے۔ وہاں شیطان کے پجاری ہر سال بیسیوں لاوارث بچوں کو اغوا کرکے شیطان کے بت کے سامنے بے دردی سے اس لیے ذبح کر دیتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ شیطان سب سے زیادہ معصوم بچوں کی قربانی سے خوش ہوتا ہے۔ پچھلے چار سال میں وہاں اسکولوں میں معصوم بچوں پر بے تحاشا فائرنگ کرکے انہیں ہلاک کرنے کے بھی کئی واقعات ہو چکے ہیں۔ عافیہ صدیقی کا کیس بھی کوئی ڈھکا چھپا معاملہ نہیں۔ ایک بے ضرر تعلیم یافتہ خاتون کو بے بنیاد الزام لگا کر اس کے بچوں سے الگ کرکے انتہائی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور پھر ۸۶ سال کی سزا سنائی گئی۔ اس پر کسی حقوقِ نسواں کی علمبردار تنظیم نے آواز نہیں اٹھائی۔ غرض اعداد و شمار کو دیکھا جائے تو دنیا کے دیگر ممالک میں ایسے واقعات پاکستان اور سعودی عرب کی نسبت بہت زیادہ ہوتے ہیں۔ پڑوسی ملک بھارت میں دیکھیے۔ وہاں ایک طالبہ پر جنسی تشدد کا حالیہ واقعہ جبری جنسی تشدد اور آبرو ریزی کا پہلا واقعہ نہیں ہے، بلکہ 2004ء سے 2010ء تک کے اعداد و شمار کے مطابق بھارت میں ہر سال اوسطاً آبرو ریزی کے اٹھارہ سے بائیس ہزار واقعات سرکاری طور پر درج

کیے جاتے ہیں۔

جب دنیا بھر میں عموماً اور خصوصاً ترقی یافتہ ممالک میں عورتوں پر تشدد کے بے شمار واقعات ہوتے ہیں تو پھر صرف پاکستان کے کسی واقعہ کو بنیاد بنا کر یہاں کے حقوق نسواں کے ٹھیکیدار پوری دنیا میں پاکستان کو ایسے بدنام کیوں کرتے ہیں کہ جیسے یہاں سب جنگلی اور وحشی رہتے ہیں۔شاید اسی سے ان کی روزی روٹی وابستہ ہے۔

اسلام کے تیزی سے پھیلنے کی وجہ

جناب جاوید چوہدری صاحب روزنامہ ایکسپریس کے مشہور کالم نگار ہیں۔ ان کے "معرکتہ الآرا" کالم باقاعدگی سے روزنامہ ایکسپریس میں شایع ہوتے ہیں۔ ان کے مداحوں کی ایک بڑی تعداد ہے جو ان کے کالم پڑھ کر آگے شیئر کرتے ہیں اور اس پر کمنٹس بھی دیتے ہیں۔ان کے کالم پڑھ کر لگتا ہے کہ وہ سیاسیات ، معاشیات اور اقتصادی امور کے بارے میں کافی جانکاری رکھتے ہیں لیکن ایک بات جو کافی عرصہ سے یہ لاشے محسوس کی ہے کہ جب بھی وہ خالص دینیات کے حوالے سے لکھتے ہیں تو شاید زیادہ مطالعہ کرکے نہیں لکھتے۔ کیوں کہ ان کے ایسے کالم ہمیشہ بہت گنجلک اور کمزور ہوتے ہیں۔ جب کہ موضوع کی نزاکت اور حساسیت اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس پر لکھنے سے پہلے کسی بھی اور موضوع سے زیادہ مطالعہ اور تحقیق کر لی جائے۔ ۲۰ جنوری،بروز اتوار کو ان کا اسی طرح کا ایک کالم شایع ہوا، جس میں معنوی تضاد بھی تھا اور شاید کم علمی کی بنا پر کئی غلط فہمیاں بھی ۔ کالم کا مرکزی نکتہ وہ سوال تھا جو انہوں نے ایک عالم دین سے پوچھا تھا اور وہ انہیں مطمئن نہ کر سکے۔ پھر خود ہی انہوں نے اس کا جواب دیا، اور اسے کالم کی شکل میں شایع بھی کر دیا۔ سوال یہ تھا کہ دینِ اسلام میں وہ کیا خاص بات ہے کہ جس کی وجہ سے وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی مختصر حیات میں ہی حجاز میں

پھیل چکا تھا اور آگے عجم تک بھی چند سالوں میں پھیل گیا۔ مولانا نے اس کا ایک جواب یہ دیا کہ یہ دین فطرت کے قریب تھا۔چوہدری صاحب نے اس کے جواب میں یہ کہا کہ تمام سابقہ ادیان بھی انسان کی فطرت سے قریب تھے، اور اس کے لیے یہ دلیل دی کہ " اللہ تعالیٰ کی ذات ارتقاء سے بالاتر ہے، اگر اللہ تعالیٰ نے بھی (نعوذ باللہ) غلطیوں سے سیکھنا ہے، اپنی اصلاح کرنی ہے اور طویل ارتقائی عمل سے گزر کر اسلام تک پہنچنا ہے تو پھر انسان اور اللہ تعالیٰ میں کیا فرق رہا؟ یہ سوچ توہین خدا ہے، ہمارا اللہ اور اس کا پیغام قطعی ہے، چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام لے کر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک اللہ کا پیغام ایک ہی تھا، اس میں بال برابر فرق نہیں آیا۔"

مولانا نے ان کی بات سے اتفاق کر لیا اور ان سے کہا کہ چلیں آپ ہی بتا دیجیے۔تو چوہدری صاحب نے جواب دیا کہ دراصل اسلام دنیا کا آسان ترین دین تھا۔ دنیا میں اس سے آسان دین ہو نہیں سکتا۔ پھر اپنی بات کے حق میں انہوں نے کئی دلیلیں دیں، جو اپنی جگہ درست بھی ہیں لیکن مجھے یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ فطرت سے قریب اور آسان ترین میں کیا فرق ہے؟ جو شے یا فعل جتنا فطرت سے قریب ہوتا ہے، وہ اتنا ہی سہل ہوتا ہے اور جو شے یا فعل جتنا فطرت سے دور ہوتا ہے وہ اتنا ہی مشکل اور بعض اوقات ناممکن العمل ہوتا ہے۔ یہودیت اور عیسائیت کی جتنی مشکلات انہوں نے گنوائیں، وہ دراصل فطرت سے دور

ہونے کی بنا پر ہی مشکل ہیں اور یہ واضح رہے کہ ان مشکلات کا بڑا حصہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ دین نہیں نازل کیا گیا بلکہ خود اُن کے اسلاف نے اپنے دین کو مسخ کرکے مشکل کر دیا۔ باقی کچھ بظاہر مشکل احکام جو یہودیت اور عیسائیت میں ثابت بھی ہیں تو اس کی توجیہ یہ ہے کہ وہ احکام دراصل اس زمانے ، علاقے اور اس قوم کے ساتھ مخصوص تھے جس پر وہ احکام اترے۔ اور چونکہ یہ بات مسلمات میں سے ہے کہ ہر قوم کے اپنے نسلی خصائل ہوتے ہیں، اپنی خوبیاں اور خامیاں ہوتی ہیں، علاقے اور حالات بھی قوم کے مزاج اور اجتماعی فطرت پر اثر ڈالتے ہیں، اس لیے ہر قوم کے مخصوص نسلی خصائل، مزاج وفطرت اور زمانے و حالات کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت سے ان پر ایسے احکام نازل فرمائے جو ان کی اصلاح احوال کے لیے مناسب تھے۔ اس لیے یہ کہنا کہ دینِ اسلام فطرت سے قریب ہے، یا آسان ترین، بہرحال ایک ہی بات ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک بات یہ ضرور دھیان میں رکھنی چاہیے کہ ہم اپنی عقل سے اس آسانی کو متعین نہیں کر سکتے۔ جتنی آسانیاں ہمیں شریعت شرعی عذر کی بنا پر دیتیہمیں، ان کی بھی حدود طے ہیں کہ بہرحال ہم احکام کے پابند ہیں۔ چوہدری صاحب نے دوسرے مذاہب کی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے چند ایسی چیزوں کا بھی ذکر ایسے پیرائے میں کیا ہے کہ جیسے ان کی اسلام نے چھوٹ دے دی ہے۔ مثلاً دوسرے مذاہب کی مشکلات گنواتے ہوئے وہ ایک انتہائی حساس بات بہت آسانی سے کہہ گئے ہیں، یہ کہ دوسرے مذاہب میں مذہب تبدیل کرنے کی اجازت نہیں، گویا کہ اسلام

میں ہے۔ اسی طرح دوسرے مذاہب میں مخصوص حلیہ کا بھی ذکر انہوں نے اس طرح کیا ہے، جیسے کہ اسلام میں اس کی کوئی حیثیت نہیں۔ یہ دونوں باتیں غلط ہیں، بلکہ صورت حال اس کے برعکس ہے۔ کسی دوسرے مذہب میں اپنا مذہب تبدیل کرنا اس طرح قابل جرم نہیں جس طرح اسلام میں ہے۔ کیا مرتد کے بارے میں شریعت محمدی کا فیصلہ چوہدری صاحب نہیں جانتے ، اسی طرح کیا تشبہ بالکفار سے بچنا اور مسنون حلیے کی اسلام میں کیا حیثیت ہے، شاید اس سے بھی وہ ناواقف ہیں۔ داڑھی نہ رکھنے سے کوئی دین کے دائرے سے تو نہیں نکل جاتا لیکن یہ جمہور کے نزدیک گناہ کبیرہ ہے۔ بہر حال اپنے نقطہ نظر کو بیان کرتے وقت حدود کا خیال رکھنا چاہیے کہ کہیں نیکی برباد گناہ لازم نہ ہو جائے۔ اور ان حدود کا علم انہی سے معلوم ہو گا جو اس علم کے ماہر ہیں۔

اب رہی یہ بات کہ سابقہ انبیاء کرام کی نسبت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی دعوت و تبلیغ میں اتنی کامیابی کیسے ہوئی کہ آپ علیہ السلام نے اپنی حیاتِ مبارکہ میں ہی حجاز میں اسلام پھیلتے دیکھا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ آپ سے پہلے تمام انبیاء ایک مخصوص علاقے میں، ایک خاص قوم میں ایک متعین وقت تک کے لیے مبعوث ہوتے تھے ۔ وہ اپنا کام کرتے ، اگر صاحبِ شریعت ہوتے تو اپنی شریعت کے مخصوص احکام کی تبلیغ کرتے اور دنیا سے چلے جاتے۔ ان کے بعد اللہ کی مشیت ہوتی تو کچھ عرصہ کے بعد کوئی اور نبی مبعوث

ہوتا، وہ یا تو پچھلے نبی کی شریعت پر عمل پیرا ہونے کی تبلیغ کرتا، یا اللہ اسے نئے احکام دے کر بھیجتے جو اس وقت کے حسبِ حال ہوتے۔ ان انبیاء کرام کا دائرہ عمل محدود ہوتا تھا۔ دوسری قوموں کے ایمان و عمل کے وہ ذمہ دار نہ تھے۔ اس لیے ان کی محنت بھی اپنی قوم تک محدود رہتی تھی۔ اور چونکہ نبوت کا دروازہ بند نہیں ہوا تھا، اس لیے کسی نبی کے پیروکاروں پر دعوت و تبلیغ کی ایسی ذمہ داری بھی نہ ہوتی تھی جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم نبوت کے صدقہ آپ کے جانثاروں پر عائد ہوئی۔ سابقہ انبیاء کی بانسبت آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالمی نبی تھے۔ آپ کا زمانہ مخصوص نہ تھا، بلکہ قیامت تک کے لیے تھا، آپ کا علاقہ مخصوص نہ تھا، بلکہ پوری دنیا پر آپ کی نبوت کا سورج طلوع ہوا تھا، اور اسی وجہ سے کسی خاص قوم پر بھی آپ مبعوث نہ ہوئے بلکہ آپ رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجے گئے۔ یہودیت جیسا کہ چوہدری صاحب نے بھی لکھا ہے نسلی مذہب تھا۔ آپ یہودی ماں کے بطن سے پیدا نہیں ہوئے تو آپ یہودی نہیں بن سکتے۔ بالکل اسی طرح عیسائیت بھی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول تھا کہ میں بنی اسرائیل کی گمشدہ بھیڑوں کو جمع کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں، انھوں نے عالمی تبلیغ کا دعویٰ ہی نہیں کیا، لیکن آپ کے رفع آسمانی کے کئی سو سالوں بعد عیسائیوں نے آپ کی تعلیمات کو مسخ بھی کیا اور ان مسخ شدہ مشکل احکام کو عالمی تبلیغی مذہب بنا دیا اور یوں پوری دنیا میں عیسائیت کو فروغ دیا۔ جب کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے عالمی

نبی ہونے کی بنا پر ایسی شریعت عطا کی جس پر تمام قوموں کے لیے اپنے مخصوص نسلی امتیازات کو برقرار رکھتے ہوئے چلنا آسان تھا۔ ہر ذہن کے لیے، ہر صلاحیت والے کے لیے، اس کو سمجھنا آسان، اس پر چلنا آسان تر تھا۔ آپ خیر البشر، سید الانبیائ، وجہ کائنات اور خاتم النبیین تھے، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم اخلاق اور دوسری صفات حمیدہ کے اس کمال سے سرفراز فرمائے گئے کہ کوئی دوسرا تصور بھی نہ کر سکے۔ ان صفات حمیدہ کی روشنی سے خوش نصیب ہدایت پاتے رہے اور چونکہآپ کی نبوت قیامت تک کے لیے تھی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے ساتھ آپ کے فیضان یافتہ صحابہ کرام کو بھی آپ کی محنت میں شامل کیا گیا۔ ان جانثاروں نے بنی اسرائیل کی طرح اپنے پیارے نبی سے بے وفائی نہ کی بلکہ ضرورت پڑنے پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنے جسموں کو ڈھال بنا لیا اور راہِ خدا میں مثلہ کیے گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام قبول کرنے کے دوسرے ہی روز آٹھ آدمیوں کو دعوت دے کر مسلمان کیا۔ وہ آٹھ آدمی بھی محنت میں شامل ہو گئے اور یوں آپ اور آپ کے صحابہ کی بے مثال محنت کی وجہ سے اسلام اس تیزی سے پھیلا جس کی مثال سابقہ ادیان میں نہیں تھی۔

وہ خاص بات جو چوہدری صاحب جاننا چاہتے ہیں، وہ دراصل ختم نبوت کی برکت ہے۔ اسی ختم نبوت کی برکتوں و رحمتوں سے اس امت کو اللہ نے اصحابِ رسول جیسی

وہ چنیدہ ہستیاں عطا فرمائیں جن کی قربانیوں کی بدولت اسلام اپنے داعی اول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں ہی تیزی سے حجاز سے باہر نکل کر دوسری مملکتوں کے دروازوں پر دستک دے رہا تھا، اور آج چودہ صدیوں بعد پوری دنیا میں نہ صرف موجود ہے بلکہ سب سے تیزی سے پھیلنے والا دین ہے۔

میرے محسن ڈائجسٹ اور مدیر

بچپن ہی سے ہمیں دو شوق رہے ہیں۔ ایک قصے کہانیاں سننے کا اور دوسرا گھومنے پھرنے کا۔ اوّل الذکر کو بہرحال اوّلیت حاصل رہی۔ قصے کہانیاں ہم کسی سے سن تو سکتے نہیں تھے کہ ہماری دادی محترمہ ہماری پیدائش سے پہلے ہی اللہ میاں کے پاس جا چکی تھیں، ا ور پیشہ ور قصہ گو ہمارے زمانے میں تھے نہیں، اس لیے ہم نے بجائے سننے کے پڑھنے پر ہی اکتفا کیا اور دادی اماں کی جگہ ہم نے محلے کی لائبریری کو دے دی۔ پہلے پہل ہم نے بھی دوسرے بچوں کی طرح مظہر کلیم صاحب کی بچوں کی کہانیاں آنگلو بانگلو، چلوسک ملوسک، چھن چھنگلو اور عمرو عیار کے کمالات پڑھے۔ ہمیں یاد ہے، اُن دنوں تصور کی دنیا بادشاہوں کے محلات، بہادر شہزادوں، چنگھاڑتے دیوؤں اور جادوگروں کے سحر سے آباد رہتی تھی۔ بہرحال اپنے معمولی جیب خرچ سے آٹھ دس سال کی عمر تک ہم نے بچوں کا ادب چاٹ لیا۔

اس کے بعد سنِ بلوغ میں قدم رکھا تو چند سالوں تک اشتیاق احمد صاحب کی انسپکٹر جمشید سیریز اور پھر ابن صفی اور مظہر کلیم کی عمران سیریز سے دل بہلاتے رہے۔ یہ کہانیوں پڑھنا اس وقت ہم بچوں کے لیے بہت آسان تھا۔ جیب خرچ سے معمولی بچت کی اور آٹھ آنے، روپے کرائے پر پڑھ لیں۔ چونکہ ہر چیز کی طرح

مطالعے کا ذوق بھی بتدریج ہی پروان چڑھتا ہے، اس لیے دھیرے دھیرے ڈائجسٹوں نے بچہ کہانیوں کی جگہ لے لی۔ سسپنس، اردو ڈائجسٹ، سرگزشت اور پھر سب رنگ ڈائجسٹ۔ خصوصاً سب رنگ کے ڈائجسٹ تو اپنی پیدائش سے پہلے کے بھی جمع کر لیے۔کیسے کیسے معرکتہ الآرا سلسلوں نے عرصہ تک اپنی گرفت میں لیے رکھا۔سب رنگ کے انکا، امر بیل، اقابلا، جانگلوس اور پھر بازیگر۔ سسپنس کے دیوتا اور موت کے سوداگر، نے ہمیں گلی کوچوں میں نکلنے ہی نہیں دیا۔پھر انہی ڈائجسٹوں نے خصوصاً سب رنگ نے ہمیں اردو ادب اور بین الاقوامی ادب سے متعارف کروایا۔ اور یوں دنیا کے عظیم لکھاریوں کی نگارشات سے ہم محظوظ ہوئے۔ یہیں ہم نے اپنے سب سے پسندیدہ لکھاری ابوالفضل صدیقی مرحوم کی کہانیاں ’ چڑھتا سورج ‘’خونی ‘ اور ’گلابِ خاص پڑھی اور پھر ان کے روہیل کھنڈ کے سحر میں مبتلا ہو کر ان کی باقی کہانیاں پڑھنے کے ‘ شوق نے ہمیں اردو بازار کی خاک چھاننے پر مجبور کیا۔ماضی کو نقش کرنے والے قاضی عبدالستار، لیلیٰ کے خطوط کے خالق قاضی عبدالغفار، منفرد قلم کار سید رفیق حسین جیسے صاحبِ طرز ادیبوں سے ہم یہیں واقف ہوئے۔ خدیجہ مسرور اور ہاجرہ مسرور دونوں بہنوں کی کٹیلی کہانیاں ہم نے یہیں پڑھیں۔ کرشن چندر کے طنز نے اسی واسطے کے ذریعے ہمارے دلوں کو چھیدا۔ احمد ندیم قاسمی صاحب کے پر اثر افسانے ہم نے یہیں پڑھے۔ہم جو اردو کے علاوہ دوسری زبان نہ جانتے تھے، دنیا کا بہترین منتخب ادب، بہترین ترجمہ کے ساتھ صرف دو روپے روز پر یہیں پڑھا۔ جاسوسی ادب ہیں سر

آرتھر کانن کے شہرۂ آفاق کردار وں شرلاک ہومز اور بریگیڈیئر جیرارڈ کے کارناموں سے ہم اسی واسطے سے واقف ہوئے۔ سی بی گلفورڈ، الفریڈ ہچکاک اور ہنری سلاسر نے اپنی گتھیوں سے ہمارے ذہن کی پالش کی تو ذریعہ یہی ڈائجسٹ بنے۔

کہانی جسے عربی میں "قصہ"، فارسی میں "افسانہ" اور انگریزی میں "فکشن" کہتے ہیں، دنیا بھر میں ادب کی سب سے محبوب اور مقبول صنف ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں نوے فیصد آبادی کی زندگی روٹی، کپڑا اور مکان کے گرد ہی گھومتی ہو، جہاں آمدنی کا اوسط اسی روپے روز ہو، جہاں پڑھنا پڑھانا صرف کمانے کے مقصد کے لیے ہوتا ہو اور جہاں کہانی کہنا اور پڑھنا ذہنی عیاشی کے مترادف سمجھا جاتا ہے، وہاں کہانی کہنے، پڑھنے کی روایت کچھ ان رسائل ہی کے دَم سے قائم ہے۔ افسانوں کے ضخیم مجموعے خریدنے کی نہ ہر ایک میں استطاعت ہے اور نہ اچھی کتابیں ہر جگہ باآسانی میسر ہیں، ایسے میں رسائل ، میگزینز اور ڈائجسٹوں کے کردار کا اعتراف نہ کرنا زیادتی ہے۔

ڈائجسٹ جن کا شمار سنجیدہ رسائل میں کبھی نہیں کیا گیا اور جنہیں ادبی رسائل سے الگ اور گھٹیا سمجھا گیا۔ وہ ادبی رسائل جن کی ماہانہ اشاعت کبھی پانچ سو، ہزار سے زیادہ نہیں ہوتی، اور ان میں سے بھی آدھے اعزازی تقسیم کیے جاتے ہیں، جب کہ ڈائجسٹ ہزاروں بلکہ لاکھوں کی تعداد میں چھپتے ہیں اور ہر

جگہ میسر بھی ہیں۔

عرصہ دراز تک ہم لوگوں سے یہی سنتے رہے کہ میگزین اور ڈائجسٹ پڑھنا کسی طرح سنجیدہ مطالعے کے زمرے میں نہیں آتا۔ ایک زمانے میں ڈائجسٹ پڑھنا سنجیدہ لوگوں کے نزدیک آوارگی اور لوفرپن کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ ہمارے ایک دوست کے پاس ایک دو مشہور ادیبوں کے چند افسانوی مجموعے تھے، جنہیں دکھا کر وہ بڑے فخر سے ہمیں کہتے کہ انہیں پڑھو، لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ اردو ادب سے ہم ان سے زیادہ واقف تھے اور یہ واقفیت پانچ دس روپے کرائے کے ڈائجسٹ کے ذریعے ہوئی۔ ادبی رسائل کے بارے میں ہمیشہ یہی سنا کہ یہ خواص کے لیے ہوتے ہیں، عوام کے لیے نہیں، لیکن سب رنگ، اردو ڈائجسٹ اور سرگزشت جیسے رسائل نے عام آدمی تک خالص ادب بہترین شکل میں پہنچایا اور یوں عام آدمی کی ذہن سازی کرکے انہیں شعوری طور پر اتنا میچور کر دیا کہ وہ اونچے معیار کی چیزیں بھی باآسانی ہضم کر سکیں۔

ڈائجسٹوں پر ایک الزام یہ لگایا جاتا رہا ہے کہ ان میں غیر سنجیدہ اور غیر معیاری چیزیں بھی چھپتی ہیں ۔ بے شک ایسا ہوتا ہے لیکن سب جگہ نہیں۔ اور پھر غیر معیاری کام خود پائیدار نہیں ہوتا۔ معیاری کام آہستہ آہستہ " بھرتی " کے کاموں سے ممیّز ہو جاتا ہے، اس لیے تمام ڈائجسٹوں کو اور ان کے لکھاریوں کو

ایک ہی لکڑی سے ہانکنا قرینِ انصاف نہیں ہے۔ دنیا کے بڑے نامور لکھاری بھی پہلے پہل ڈائجسٹ میں چھپے، مقبول ہوئے اور پھر ان کے کام کو عالمی اعزاز سے نوازا گیا۔ پاکستان میں اور کچھ نہیں تو کم از کم ڈائجسٹ کے اس کردار کا اعتراف تو ضرور ہی کرنا چاہیے جو سنجیدہ مطالعے کے ذوق کی پیاس پیدا کرنے میں انہوں نے کیا۔

ہم سال بھر میں مختلف دن مختلف ناموں سے مناتے ہیں۔ تو کیا خیال ہے اگر ایک دن ایسا بھی منایا جائے جس کا نام "اعتراف ڈے" ہو، تا کہ کم از کم ہم سال میں ایک دن تو اپنے علاوہ دوسروں کی خوبیوں کا ادراک کر کے ان کا اعتراف کر سکیں۔ وہ لوگ جنہوں نے ہم پر کسی بھی نوعیت کا احسان کیا ہو، ان کا شکریہ ادا کریں۔ میں آج اس تحریر کے ذریعے سب سے پہلے اپنے انہی محسنین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے عرصہ تک ہمیں شاد کام رکھا، ہماری خلوتوں کو رنگا رنگ مناظر سے سجایا۔ جی ہاں! سب سے پہلے میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں، جنہوں نے دوسرے والدین کی طرح کبھی ہمیں کہانیاں پڑھنے سے نہیں روکا، اس کے بعد کرایہ لائبریری چلانے والے شکریے کے مستحق ہیں، اس کے بعد سب رنگ کے مدیر محترم شکیل عادل زادہ صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے پچھلے بیس سالوں سے ہمیں دنیا کے بہترین ادب سے روشناس کرایا۔ میں محترم معراج رسول صاحب اور محترم الطاف حسن قریشی صاحب کا بھی شکریہ ادا

کرنا چاہتا ہوں، کہ ان کے سسپنس، سرگزشت اور اردو ڈائجسٹ کے ذریعے ملک کا
بہترین ٹیلنٹ نکھر کر سامنے آیا اور یوں ہمیں بہترین تحریریں پڑھنے کو ملیں۔ سب کا
بہت شکریہ!!

کیا مہذب قوم کی یہی علامت ہے؟

کچھ عرصے پہلے ہمیں بذریعہ کوچ، سپر ہائی وے کے راستے اندرونِ سندھ سفر کرنے کا اتفاق ہوا۔ واپسی میں ٹنڈو آدم سے نکلنے کے تین گھنٹے کے بعد ایک پیٹرول پمپ بمعہ ہوٹل پر گاڑی رکی۔ ہمیں نہیں پتا کہ گاڑی کو ایندھن کی ضرورت تھی کہ نہیں، لیکن ڈرائیور اور کنڈیکٹر کو ضرور ایندھن کی ضرورت تھی۔ شاید پیٹ بھرنے سے زیادہ جیب کے بھرنے کی۔ کیوں کہ مشہور ہے کہ تقریباً ہر کوچ سروس کا اپنے روٹ پر موجود کسی مخصوص ہوٹل سے ایک طرح کا زبانی کلامی معاہدہ ہوتا ہے کہ اس کوچ کے ڈرائیور وہاں ضرورت ہو یا نہ ہو، دس پندرہ منٹ کے لیے گاڑی ضرور روکتے ہیں، اور بدلے میں نہ صرف پیٹ پوجا کی مفت سہولیات سے لطف اندوز ہوتے ہیں بلکہ کمیشن کے نام پر تھوڑا بہت خرچہ پانی بھی وصول کر لیتے ہیں۔ بہر حال مسافروں کو اس سے کیا غرض.... زیادہ تر تو خوش ہی ہوتے ہیں۔ مسئلہ تو تب ہوتا ہے جب کسی فوری حاجت کے وقت بھی سواری کسی اور تھان پر نہ روکی جائے۔ اس وقت بھی "فطرت کی پکار" والا مسئلہ کئی مسافروں کو درپیش تھا.... جس میں راقم بھی شامل تھا۔ "صرف دس منٹ"، "بھائی پانچ منٹ" کے راگ سے ہمیں بہلاتے ڈرائیور صاحب گاڑی کو لیٹ لگاتے رہے اور یوں آدھا گھنٹہ کھینچ گئے۔ اپنے مخصوص ہوٹل کی آمد پر انھوں نے گاڑی روکی تو متاثرہ مسافروں نے چھلانگ لگائی اور فوراً

اُس 'گوشہ عافیت' کی طرف لپکے۔ قریب جا کر دیکھا تو صرف دو گوشے تھے، ایک صنف کرخت کے لیے، دوسرا صنفِ نازک کے لیے.... لیکن دونوں میں کرختگی چھائی ہوئی تھی۔ ایک دو گاڑیاں پہلے ہی ہوٹل پر کھڑی تھیں، جس کی وجہ سے رش بہت زیادہ تھا۔ کافی دیر بعد اپنی باری آنے پر بیت الخلا میں داخل ہوئے تو انتہائی ہولناک صورت حال کا سامنا کرنا پڑا۔ سخت تعفن کی وجہ سے سانس روکنی پڑ گئی، اور وہ دو منٹ جو مجبوری میں گزرے، انتہائی کرب کی حالت میں گزرے۔ ابکائی کو روکتے ہوئے جلد از جلد وہاں سے یہ سوچتے ہوئے بھاگے اور آئندہ کے لیے یہ عزم بھی کیا کہ پھر کبھی سفر سے پہلے یا دورانِ سفر زیادہ پانی یا چائے نہیں پئیں گے۔ گاڑی میں بیٹھتے بیٹھتے ہم نے ساری صورت حال کو ہوٹل والوں سے جوڑتے ہوئے انہیں دل ہی دل میں کئی صلواتیں سنادیں جنہیں اپنے کاروبار کی تو فکر ہے لیکن پبلک کے آرام کی نہیں.... کچھ بیت الخلا ہی زیادہ بنا دیتے اور انہیں صاف رکھنے کی کچھ کوشش کر لیتے۔ لیکن کچھ دیر بعد ہی ہماری سوچ میں انقلابی تبدیلی آ گئی اور ہم کے بعد دیگرے ہوٹل مالکان کے ساتھ، گورنمنٹ اور خود اپنا آپ بھی بطور ایک عام فرد کے اس گندگی کا ذمہ دار محسوس ہونے لگا۔ جی ہاں اگرچہ اکثر مقامات پر موجود عوامی بیت الخلاء کا حال لکھنے کے قابل نہیں کہ اکثر تو پانی ہی نہیں ہوتا لیکن جہاں پانی ہوتا ہے، وہاں بھی بیت الخلا استعمال کرنے والے شاید پانی کے استعمال کو پانی اور وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ مذکورہ بیت الخلاء میں بھی پانی نہایت

پریشر کے ساتھ آ رہا تھا لیکن شروع میں اسے بہانے کی کسی نے ضرورت نہیں سمجھی، جو بعد والوں کے لیے سخت ذہنی اذیت کا باعث بن گئی۔

اتفاق دیکھیے کہ پچھلے چار پانچ مہینوں میں ہمیں کبھی اکیلے تو کبھی بچوں کے ساتھ مختلف جگہ کے عوامی بیت الخلاء جانے کی اذیت برداشت کرنی پڑی اور ہر بار نہ صرف نانی یاد آ جاتی بلکہ نانی اماں کی بات بھی یاد آ جاتی، جو وہ بہو تلاش مہم سے پہلے کہا کرتی تھیں کہ کسی لڑکی کے سلیقے اور صفائی ستھرائی کا معیار جانچنے کے لیے اس کا گھر، اور گھر کا ڈرائنگ روم نہ دیکھو، بلکہ اس کا کچن اور بیت الخلاء دیکھو۔ یہ دو جگہیں جتنی صاف ہوں گی، سمجھ لو، لڑکی اتنی ہی سلیقہ شعار اور مہذب ہو گی۔ یہ بات ایک قوم کے لیے بھی کہی جا سکتی ہے۔ کسی قوم کی تہذیب جانچنے کے لیے بھی شاید سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ ان کے عوامی بیت الخلاء کا ایک سروے کر لیا جائے۔ اگر پاکستان میں اس طرح کا سروے کر لیا جائے تو ثابت ہو جائے کہ پاکیزگی کو نصف ایمان کہنے والی یہ قوم شاید اجتماعی طور پر نصف ایمان سے محروم ہے۔ یاد رکھیے کہ پاکیزگی کا خیال رکھنا صرف اپنی ذات کے لیے ہی مشروع نہیں ہے بلکہ معاشرتی زندگی گزارتے ہوئے دوسروں کو ذہنی و روحانی تکلیف سے بچانا بھی شریعت کو مطلوب ہے۔ یہ مجلسی اور معاشرتی آداب کے تحت آتا ہے۔ اس لیے گھر سے بھی زیادہ پبلک بیت الخلاء کو صاف رکھنا استعمال کنندہ کی قومی اور دینی ذمہ

داری ہے۔یہ ذمہ داری پوری کرنا بہت آسان ہے، ضرورت پوری کرکے اہتمام سے فلش کیا جائے اور باہر بیٹھے پیسے لینے والے صفائی کے ذمہ داروں کو تنبیہ کر دی جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی شخص کو ایسی ذہنی اذیت اٹھانی پڑے کہ وہ پھر کئی دنوں تک کسی جمالیاتی احساس سے ہی محروم ہو جائے۔

اس معاملے میں گورنمنٹ کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ ہر سال ورلڈ ٹوائلٹ ڈے کے موقع پر بیانات جاری کرنے کی بجائے کچھ عملی قدم بھی اٹھائے۔تمام پبلک مقامات پر سہولتوں سے مزین بیت الخلاء بنانا اور پھر ان کی مستقل صفائی اور دیکھ بھال کے لیے مناسب انتظام کرنا گورنمنٹ کی ذمہ داری ہے۔گورنمنٹ کو چاہیے کہ اس ضمن میں دنیا کے مہذب اور ترقی یافتہ ممالک کی مثال دیکھے کہ وہاں انسان کی اس بنیادی ضرورت کا کتنا موثر انتظام ہے۔آسٹریلیا یں ہائی وےپر ہر پچاس کلومیٹر پر ریسٹ روم موجود ہوتے ہیں اور ہر گیس اسٹیشن والے کے لئے لازمی ہے کہ وہاں بالکل صاف ستھرے واش روم ہوں،امریکا اور یورپ میں بھی پبلک مقامات پر پبلک ٹوائلٹ اور ان کی دیکھ ریکھ بہت ہی اعلیٰ ہوتی ہے، حتیٰ کہ مشرق بعید اور مشرق وسطیٰ کے ممالک میں بھی صورت حال برصغیر سے بہت بہتر ہے۔

حکومت کی ذمہ داری تو خیر اپنی جگہ مگر ہمارے خیال میں عوامی جگھوں پر

صفائی ستھرائی کے معاملے میں پبلک پر کئی گنا زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ کیوں کہ گورنمنٹ آپ کو ایک چیز بنا کر تو دے سکتی ہے لیکن وہ لوگوں کو اُس چیز کے استعمال کے بعد صاف رکھنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ اور ایسا بھی نہیں کہ عوام جانتے نہیں، یہ تعلیم و آگہی کی کمی کی بات نہیں یہ تو سراسر تربیت کی بات ہے۔

اس حوالے سے ایک دوسرا پہلو بھی قابل غور ہے، وہ یہ کہ صفائی اور پاکیزگی کا خیال صرف مادی طور پر ہی ضروری نہیں کہ گلیوں، سڑکوں، پارکوں اور عوامی واش رومز کو صرف ظاہری طور پر صاف ستھرا رکھا جائے بلکہ معاشرے کو اپنے ذہن و دل کی آلائشوں سے محفوظ رکھنا بھی نہایت ضروری ہے۔ یہ تمہید اس لیے باندھی کیوں کہ ہمارے پبلک ٹوائلٹ اس دوسرے حوالے سے بھی نہایت بدنام ہیں۔ انتہائی فحش اشعار، اپنے مخالف سیاستدانوں کو ننگی گالیاں، مکروہ باتیں اور گندے مذاق ہماری پبلک کی اجتماعی ذہنی گراوٹ کی علامت ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ ذہنی کج روی کے شکار افراد اپنی جسمانی گندگی ہی پھیلا کر نہیں جاتے بلکہ باطنی غلاظتیں بھی گویا در و دیوار پر انڈیل جاتے ہیں۔ یہ دیکھ کر ہمیں اکثر اردو ادب کے ایک انتہائی متنازعہ شاعر جعفر علی چرکین یاد آ جاتے ہیں جو غالباً آتش کے ہم عصر تھے اور اپنی تمام تر شاعرانہ خوبیوں کے باوجود اپنے موضوع سخن کی وجہ سے نہایت بدنام رہے ہیں۔ ان کی انفرادیت یہ تھی کہ وہ دنیا کے ہر

موضوع کو بول و براز سے آلودہ کرکے بیان کیا کرتے تھے۔ان کا تھوڑا بہت مکروہ کلام ہم نے دل مضبوط کرکے پڑھا ہے اور چونکہ ہم نے نئی نسل کا ٹوائلٹ کلام بھی پڑھا ہے، اس لیے پورے دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ آج چرکین ہوتے تو نئی نسل کے سامنے پانی بھرتے۔

بہرحال جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا کہ اصل مسئلہ تعلیم نہیں بلکہ تربیت کا فقدان ہے اور آدمی کی تربیت ہوتی ہے گھر سے، اس لیے اس کی شروعات ہمیں سب سے پہلے اپنے گھروں سے کرنی چاہیے۔ اپنے بچوں کو صفائی کی اہمیت اور ان پر عائد ہونے والی معاشرتی پابندیاں بتانی چاہئیں اور بوقت ضرورت مناسب تنبیہ بھی کرنی چاہیے تاکہ کم ازکم اگلی نسل تو بحیثیت قوم ہمیں مہذب ہونے کا سرٹیفکیٹ دلا سکے۔

دنیا بھر میں بچوں کا جسمانی و ذہنی استحصال

بچے اللہ تعالیٰ کی وہ نعمت ہیں، جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔ خوبصورت نازک پھولوں سے انہیں تشبیہ تو دی جاتی ہے لیکن حقیقتاً پوری دنیا کے پھول مل کر بھی خوبصورتی میں ایک بچے کی معصوم مسکراہٹ کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ چاند سے بچوں کو تشبیہ تو دی جاتی ہے، لیکن ایسے ہزاروں چاندوں کی چمک دمک بھی ایک بچے کی شرارتی آنکھوں میں ابھرنے والی چمک سے بڑھ نہیں سکتی۔ ہمارے دین میں انبیاء کے علاوہ صرف بچے ہی ہیں جن کے لیے معصوم کا لفظ استعمال ہوتا ہے، اس لیے ان کو تو بس بجا طور پر فرشتوں ہی سے تشبیہ دی جا سکتی ہے۔ بچے جس گھر میں ہوں، وہ ہی صحیح معنوں میں گھر کہلاتا ہے، اور جس گھر میں بچے نہیں، وہ گھر دنیا بھر کی آسائشیں رکھنے کے باوجود اک ویران مکاں ہے۔ بچوں کی ایک الگ ہی دنیا آباد ہوتی ہے، جس میں وہ مگن ہوتے ہیں۔ ان کے بظاہر ننھے دل اتنے صاف اور مضبوط ہوتے ہیں کہ یہ لڑتے ہیں، جھگڑتے ہیں، لیکن یہ لڑائی جھگڑا حسد و نفرت بن کر ان کے دل میں داخل نہیں ہوتا اور کچھ دیر میں وہ سب بھول بھال کر پھر شیر و شکر ہو جاتے ہیں، غرض بچے ہر چھل کپٹ سے، ہر بھید بھاؤ سے بے نیاز ہوتے ہیں۔ یہ ساری صفات اُن میں بے خبری سے پیدا ہوتی ہیں اور بے خبری سے بے فکری جنم لیتی ہے۔ اسی لیے بچپن کی بے فکری ضرب المثل ہے جس کی آرزو پھر آدمی موت تک

کرتا ہے۔ جیسے جیسے بچہ باخبر ہوتا چلا جاتا ہے، ویسے ویسے اس کا بچپن دور ہوتا چلا جاتا ہے،اور پھر یکلخت کوئی جوہری تبدیلی ہوتی ہے کہ بچہ ، بچہ نہیں رہتا، وہ بڑا ہو جاتا ہے۔ یہ ایک فطری عمل ہے۔ ہر بچے کو اپنے وقت پر بڑا ہونا ہی ہوتا ہے۔ لیکن جب غیر فطری طور پر بچوں کے معصوم ذہنوں کو اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔ انہیں اپنے مسموم ارادوں کے لیے استعمال کیا جائے تو یہ فطرت کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہے۔

صدیوں سے ایسا ہو رہا ہے۔تاریخ یں بچوں کو اپنی عسکری و نظریاتی جنگ میں استعمال کرنے کا سب سے پہلا واقعہ آج سے ٹھیک آٹھ سو سال پہلے 1212 ءیں ملتا ہے۔ یہ زمانہ صلیبی جنگوں کا تھا۔ عیسائیوں کی مذہبی و عسکری قیادت نے پے در پے شکستوں کے بعد اپنے شکستہ دل عوام کے جذبات کو ابھارنے کے لیے ایک عجیب چال چلی۔ انہوں نے اس مذہبی جنگ میں اپنے بچوں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کام کے لیے اٹلی کے شمالی کوہستانوں کو چنا گیا۔ ایک دن عوام نے دیکھا کہ بچوں کے جلوس گروہ در گروہ وادیوں میں پھیلتے جا رہے ہیں، وہ اپنے معصوم ہاتھوں میں لکڑی کی صلیبیں اٹھائے اور اونچی آواز میں حمد کے گیت گاتے شہروں اور دیہاتوں سے گزر رہے تھے۔ان کی قیادت اسٹیفن نامی ایک بارہ سالہ بچہ کر رہا ہوتا ہے جس کا دعویٰ تھا کہ یسوع مسیح نے اسے خود ایک خط سونپا ہے جس میں یہ ہدایت ہے کہ وہ صلیبی جنگوں کا راستہ دوبارہ ہموار

کرے۔وہ ساحلِ سمندر کی طرف رواں دواں تھے۔انہیں یقین دلایا گیا تھا کہ جب وہ سمندر کے کنارے پہنچیں گے تو سمندر معجزۃً ان کے لیے راستہ چھوڑ کر سمٹ جائے گا اور وہ سرزمین مقدس پہنچ کر سب مسلمانوں کو عیسائی کرلیں گے۔وہ اس مقدس شہر کو حاصل کرنے جارہے تھے جس کی فتح کے بعد ان کے مطابق دنیا میں امن و امان کا دورہ ہوجائے گا۔جب بھی کوئی ان سے پوچھتا کہ تم کہاں جارہے ہو؟ وہ کہتے "خدا کے پاس"۔دراصل وہ وینڈوم کے کی وادی کے غریب چرواہوں کی اولاد تھے۔بچوں کا یہ جلوس عیسایئت کے لیے ایک معجزہ بن گیا۔لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے جاتے۔اس وقتکے پوپ انوسنٹ جو چرچ کی تاریخ کا طاقتور ترین پوپ رہا ہے، نے کہا کہ یہ ہمارے لیے باعثِ شرم ہے کہ بچے تو سرزمین مقدس کی آزادی کے لیے نکلیں اور ہم گھروں میں بیٹھے رہیں۔اس بات پر عوام کا جم غفیر جمع ہوگیا اور چرچ کا مقصد حاصل ہوگیا۔مگر دوسری طرف اِن بچوں کا انجام بڑا دردناک ہوا۔جب یہ ساحلِ سمندر پر پہنچے تو ان کی توقعات کے برعکس سمندر شق نہ ہوا، بہت سوں کی ہمت وہیں دم توڑ گئی اور وہ واپس اپنے گھروں کو لوٹ گئے، جو بقیہ رہ گئے ان کے اندر عیسائی بردہ فروشوں کے گروہ مل گئے۔

ان لوگوں نے انہیں جہازوں کی پیش کش کی۔معصوم بچے یہ مکروفریب سمجھ نہ سکے اور جہازوں میں سوار ہوگئے۔بردہ فروش انہیں بجائے یروشلم لے کر جانے کے تیونس اور اسکندریہ میں غلام بنا کر بیچ آئے۔وکی پیڈیا کے مطابق ان میں سے

ایک جہاز راستے میں ہی غرق ہوگیا تھا۔کچھ بچے راستے کی ہزاروں صعوبتیں اٹھا کر سالوں بعد کسی طرح اپنے گھر پہنچنے میں بھی کامیاب ہوئے لیکن ان کے ہاتھوں سے صلیبیں گرچکی تھیں اور وہ دکھوں سے لاچار تھے۔کتاب دی چلڈرنز کریسنٹ کے مطابق وہ لوگ جنھوں نے معجزے کی توقع میں ان کی مدد کی تھی، انہیں واپس آتا دیکھ کر آوازے کسنے لگے، جو بچیاں انسانی درندوں سے اپنا سب کچھ لٹواچکیں تھیں، اُن کو انہی کی قوم کے لوگ نفرت و حقارت سے کہتے : "ارے یہ شیطان کی کنیزیں خدائی کام کے لیے نہیں بدکاری کے لیے گئی تھیں۔"اسی سال بچوں کا ایک دوسرا لشکر جرمنی سے بھی برآمد ہوا جس کا انجام بھی اسی طرح دردناک ہوا۔ بہرحال پاپائے روم کو صلیبی جنگوں کے مردہ بدن میں جان ڈالنے کے لیے ایک نئی تحریک مل گئی۔[حوالہ : "The Children's Crusade of 1213"(1977).Journal of Medieval History]

آج آٹھ سو سال کے بعد بھی بچوں کی معصومیت کو "بڑے" اپنے خبیث مقاصد کے لیے کیش کرارہے ہیں۔اپنے پیٹ کے جہنم کو بھرنے کے لیے بچوں سے جان توڑ مزدوری کروانا، بچوں کو اغوا کرکے اور معذور بنا کر ان سے بھیک منگوانا، بچوں کو بے تحاشا مارنا اور اس سے بڑھ کر ان کا جنسی استحصال اب معمول بن کر رہ گیا ہے۔ صرف جنسی استحصال کو دیکھ لیجیے، یہ اب صرف ایک انفرادی واقعہ یا اپنی شیطانی خواہش کو پورا کرنا ہی نہیں رہا، بلکہ آج کے ستم گر زمانے میں بچوں

کا جنسی استحصال عالمی کاروبار بنا دیا گیا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق سیکس انڈسٹری جو کا ہے۔ (Pedophilia) دنیا کی تیسری بڑی انڈسٹری ہے ،کا چوتھائی حصہ چائلڈ سیکس ہزاروں بچوں کو کروڑوں کمانے کے لیے اتنی بے حیائی اور بے دردی سے استعمال کیا جاتا ہے کہ اگر قیامت کا دن متعین نہ ہوتا تو آسمان ٹوٹ پڑتا۔

اسی طرح عسکری میدان کو دیکھ لیجیے۔ ساری دنیا میں جہاں جہاں سامراج نے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے جنگوں کی بساط بچھائی۔ وہاں بڑوں کے ساتھ بچے بھی برابر سے متاثر ہوئے۔ اسرائیل، عراق، افغانستان ، شام اور اب پاکستان میں

بلا مبالغہ لاکھوں بچے دہشت گردی کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔ انہیں مارا بھی گیا، اور ایک قدم بڑھ کر ان کو بطور کیریئر جنگ میں استعمال بھی کیا گیا۔ گویا صلیبی جنگوں کی طرح آج بھی اپنی جنگ بچوں کے کاندھوں پر چڑھ کر لڑی جا رہی ہے۔ جنگوں میں بچوں کو جھونکنے کی بڑھتی ہوئی وارداتوں پر خود اقوام متحدہ نے ایک رپورٹ جاری کی ہے۔ جس میں جنگ زدہ علاقوں میں بچوں کے متاثر ہونے اور ان پر پڑنے والے نفسیاتی اثرات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ لڑاکوں کی حیثیت سے بچوں کی بھرتی کا طریقہ پوری دنیا میں عام ہو چکا ہے، یہاں تک کہ ان کو خود کش بمباروں کی حیثیت سے خصوصی تربیت دے کر جنگ میں استعمال کیا جاتا ہے۔ اقوام متحدہ کی رپورٹ میں ایسی 56 پارٹیوں اور گروپوں کی نشاندہی کی

گئی ہے جن میں سرکاری اور باغی گروپ بھی شامل ہیں۔اس رپورٹ کے مطابق دنیا کے مختلف مقامات پر اب تک کم از کم دو لاکھ بچوں کا استعمال کیا گیا ہے۔ ان مسلح گروپوں میں شامل افراد بچوں کا جنسی استحصال بھی کیا جاتا ہے، اور ان کو وحشیانہ تشدد کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ اسکولوں اور کھیل کے میدانوں پر حملے کرنا بھی ایک عام رواج بن چکا ہے جہاں اس بات کی کوئی پروانہیں کی جاتی کہ اس سے کتنے معصوم بچے ہلاک اور زخمی ہوتے ہیں۔ بچوں کی نفسیات پر خود کش حملوں کے ہونے والے اثرات کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اسکول جانے والے 80 فیصد بچوں میں خود کش حملوں کے متعلق آگاہی کا سب سے بڑا ذریعہ میڈیا ہے۔ غزہ میں اسرائیل کی بمباری، تمل علاقوں میں سری لنکن فوج کی بمباری، پاکستان میں عسکریت پسندوں اور سیکورٹی فورسز کی لڑائی اور افغانستان میں امریکہ کی فضائی بمباری نے درجنوں بچوں کی لاشیں بکھیر دی ہیں۔ پچھلے دنوں یہ خبر آئی کہ شام میں بچوں کو جاسوسی کرنے کے لیے، لڑائی کے لیے حتیٰ کہ بعض خبروں کے مطابق انسانی ڈھال کے طور پر بھی استعمال کیا جا رہا ہے۔ صحیح تعداد کا اندازہ تو کبھی نہیں ہوسکے گا کہ کتنے معصوم پھول بن کھلے مرجھا گئے لیکن صرف ایک رپورٹ کے مطابق وہاں اب تک مسلح فریقین کے لیے کام کرنے والے کم از کم سترہ بچے ہلاک ہو چکے ہیں جب کہ کئی بری طرح زخمی یا عمر بھر کے لیے معذور ہو چکے ہیں۔پاکستان بھی جب سے دہشت گردی کے خلاف پرائی آگ میں کودا ہے، یہاں بھی معصوم بچوں کو اپنے مذموم

مقاصد یں استعمال کیا جا رہا ہے۔ کئی خود کش حملے ایسے ہیں جن میں خود کش حملہ آور دس پندرہ سال تک کے بچے تھے۔ صرف خود کش حملے ہی نہیں، بم دھماکوں میں یہاں تک کہ دو بدو لڑائی میں بھی چودہ پندرہ سال کے بچے ملوث پائے گئے ہیں۔ مثلاً ابھی حال ہی میں بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں پولیس نے دعویٰ کیا ہے کہ اس نے گیارہ ایسے بچے حراست میں لیے ہیں جو جنوری میں میزان چوک پر ہونے والے بم دھماکے میں ملوث تھے، جس کے نتیجے میں بارہ افراد ہلاک اور چونتیس سے زائد زخمی ہوئے تھے۔ کوئٹہ کے کیپٹل سٹی پولیس چیف آفیسر میر زبیر محمود کے مطابق پولیس نے کوئٹہ میں فائرنگ کے تبادلے کے بعد گیارہ بچوں کو حراست میں لیا، جن کی عمریں دس سال سے لے کر پندرہ سال تک ہیں۔ ان بچوں کو یونائیٹڈ بلوچ آرمی یعنی بی ایل اے اپنے مذموم عزائم کے لیے استعمال کر رہی تھی اور ان سے تخریب کاری کرواتی تھی۔ ان بچوں نے یہ اعتراف کیا کہ ہر کارروائی کے لیے انہیں دو ہزار سے پانچ ہزار روپے تک دیے جاتے تھے۔ ان چند ہزار روپوں کے عوض ان بچوں سے عبادت گاہوں میں، کچرے کے ڈھیروں میں اور سیکورٹی فورسز کی گزرگاہوں میں دھماکہ خیز مواد کے پیکٹ اور بم رکھوائے جاتے تھے۔ ان سارے بچوں کا تعلق انتہائی غریب خاندانوں سے بتایا جاتا ہے۔

معصوم بچوں کو اپنی جنگ کا ہتھیار بنانے والوں کا اسلام، انصاف یا انسانیت سے کیا تعلق ہو سکتا ہے، ظاہر ہے! ہم تو ان سطور کے ذریعے والدین سے یہ درخواست کریں گے کہ اپنے بچوں پر خصوصی نظر رکھیں کہ اُن کا میل جول، اٹھنا بیٹھنا کن لوگوں کے ساتھ ہے۔ بالخصوص غریب طبقے سے تعلق رکھنے والے بچوں کو پر تشدد ماحول سے بچانا اور ان کی نہ صرف ظاہری حفاظت کرنا بلکہ ان کے معصوم ذہنوں پر بھی نظر رکھنا بہت ضروری ہے کہ کہیں کوئی مفاد پرست اپنے مقصد کے لیے ان کے ذہن کو مسموم تو نہیں کر رہا۔

اے کاش دوسروں کے بچوں کو اپنے مذموم مقاصد میں استعمال کرنے والے کبھی اپنے بچوں پر بھی نظر ڈال لیا کریں۔ بچے تو سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ نوخیر کلیوں کی طرح معصوم! کہیں ایسا نہ ہو کہ دوسروں کا خرمن پھونک کر تماشا دیکھنے والے خود اپنے ہی ہتھیار کا شکار ہو جائیں، کیوں کہ مکافاتِ عملکے سدا بہار قانون کو حرکت میں آتے دیر نہیں لگتی۔

انٹرنیٹ کے ذریعے اسلامی دنیا میں الحاد کی یلغار

انٹرنیٹ وہ غیر معمولی ایجاد ہے جس سے ایک نئے عہد یعنی انفارمیشن ایج کا آغاز ہوا۔ پرنٹ اور الیکٹرونک میڈیا کی طرح یہ بھی ایک میڈیا ہے جسے اصطلاحاً سائبر میڈیا کہا جاتا ہے۔ اور یہ کہا جائے تو غلط نہ ہو گا کہ دنیا بھر کے تعلیم یافتہ افراد کے خیالات اور اقدار کو متاثر کرنے میں یہ میڈیا، دوسرے میڈیا کی بانسبت بہت زیادہ اثر انگیز ہے۔ انٹرنیٹ کے ہمارے معاشرے پر جو اثرات ہو رہے ہیں، وہ ہمہ جہتی قسم کے ہیں۔ یہ اثرات مثبت بھی ہیں اور منفی بھی۔ اس سائبر جال کے ذریعے انسانی زندگی پر جو تبدیلیاں رونما ہو سکتی ہیں وہ تین قسم کی ہیں۔ اول زندگی کو تیز اور آسان بنانے والی تبدیلیاں مثلاً ای بینکنگ، ای مارکیٹنگ اور ای میل وغیرہ۔ دوم وہ تبدیلی جو ہر موضوع پر معلومات کے خزانے کے آسان حصول کی وجہ سے آ رہی ہے۔ بڑی بڑی لاکھوں کتابیں رکھنے والی لائبریریاں اب صرف چند کلک پر ایک طالب علم کی دسترس میں ہوتی ہیں۔ انٹرنیٹ کے ذریعے آنے والی تیسری بڑی تبدیلی کا تعلق خاص مسلم ورلڈ سے ہے، یہ وہ منفی رجحانات ہیں جن کے تاریک سائے تیزی سے ہمارے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہے ہیں۔ ان منفی

رجحانات ہیں۔ ہم مسلم دنیا کے لیے سب سے زیادہ مضر دو رجحانات کا جائزہ لیں گے۔ ایک انٹرنیٹ کے ذریعے مسلم دنیا میں تیزی سے پھیلتی ہوئی فحاشی و عریانی اور دوسرا خطرناک ترین رجحان انٹرنیٹ کے ذریعے مسلم دنیا میں الحاد کی یلغار ہے۔ ان دونوں رجحانات کا جائزہ ہم نے حالیہ دو خبروں کی بنیاد پر لینا ضروری سمجھا۔

پہلی خبر کا تعلق بنگلہ دیش کے دارالحکومت ڈھاکا سے ہے، جہاں چند دن پہلے ہزاروں مسلمانوں نے انٹرنیٹ پر اسلام کی تضحیک کرنے والے بلاگرز کے خلاف سخت کارروائی کرنے کے لیے مظاہرے کیے۔ دوسری خبر خاص پاکستان سے تعلق رکھتی ہے جو پاکستانیوں کے لیے نہایت شرمناک ہے۔ خبر یہ ہے کہ ایک حالیہ مغربی رپورٹ کے مطابق سرچ انجن گوگل پر غیر اخلاقی مواد کے سرچ کرنے کے اعتبار سے پاکستانی دنیا بھر میں سرفہرست ہیں۔

پہلے بنگلہ دیش والی خبر کو دیکھتے ہیں، یہ خبر ویسے تو بنگلہ دیش سے متعلق ہے، لیکن ہر وہ مسلمان جو باقاعدگی سے انٹرنیٹ کی مشہور سماجی رابطے کی سائٹس پر گزرتا ہے اور وہاں پیش کیا جانے والا مواد سرسری بھی دیکھ لیتا ہے، وہ خوب اندازہ کر سکتا ہے کہ ملحدین کا انٹرنیٹ کے ذریعے دینِ اسلام کے بنیادی اصولوں پر اوچھے وار کرنا اور شکوک کے بادل پھیلا کر الحاد کی برسات

کرنا صرف بنگلہ دیش کا مسئلہ نہیں بلکہ پوری مسلم دنیا کی نظریاتی بنیادوں پر سلگنے والا وہ آتش فشاں ہے جو کسی وقت بھی دھماکے سے پھٹ سکتا ہے۔

الحاد کا لفظ عربی زبان میں لغوی اعتبار سے، انحراف یعنی درست راہ سے ہٹ جانے کے کہا جاتا ہے۔ عموماً اس لفظ کا الحاق atheism معنوں میں آتا ہے۔الحاد کو انگریزی میں وجودِ خدا، نبوت و رسالت اور آخرت میں سے کسی ایک کے یا تینوں کے انکار پر کیا جاتا ہے اور یہ انکار بے مہار عقل کے استعمال کی بنا پر ہوتا ہے، عقل جو خود مادے کی پیداوار ہے اور مادی قوتوں کے ذریعے غیر مادی ہستی کو سمجھنے کی کوشش کا نتیجہ ہمیشہ ناکامی کی صورت میں نکلا ہے۔ ایسی الجھنوں کے پیدا ہونے کا بنیادی سبب دراصل اپنی حدود سے تجاوز کرنا ہوتا ہے۔ نفسی قوتوں کا غلبہ انسان کو تکبر اور بڑائی میں مبتلا کر دیتا ہے، یوں ناپاک قطرے سے بنا انسان اپنی غلاظتوں کو بھول کر کبھی انفرادی حیثیت میں انا ربکم الاعلیٰ کا نعرہ لگاتا نظر آتا ہے تو کبھی اجتماعی طور پر انسان کو خدا کے درجے پر فائز کرتے ہوئے لا الہ الا الانسان کا کلمہ پڑھتا دکھائی دیتا ہے۔

شروع ہی سے مذہب کے ساتھ الحاد بھی تمام معاشروں میں رہا ہے لیکن یہ تاریخ میں کبھی بھی قوت نہ پکڑ سکا۔ دنیا بھر میں یا تو انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ

والسلام کے متبعین‘ ایک اللہ کو رب ماننے والے غالب رہے یا پھر شرک کا غلبہ رہا۔ چند مشہور فلسفیوں اور ان کے معتقدین کو چھوڑ کر تاریخ میں انسانوں کی اکثریت ایک یا کئی خداؤں کے وجود کی بہر حال قائل رہی ہے۔ پہلے زمانے میں مذہب کے مقابلے میں الحاد و دہریت کا پھیلاؤ اس لیے بھی کم رہا کہ انبیاء کرام اللہ تعالی کے پیغام کی تبلیغ کیا کرتے تھے، جب کہ ملحد الحاد کے کبھی داعی نہیں رہے۔ لیکن انیسویں صدی میں جب چارلس ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو قبولِ عام حاصل ہوا تو گویا الحاد نے ایک مذہب کی صورت اختیار کر لی، جس کا پیغمبر ڈارون تھا اور اس کا نظریہ اس مذہب کا دیباچہ۔ بس کیا تھا، اس صدی میں لاکھوں لوگ جن میں اکثریت تعلیم یافتہ افراد کی تھی، مذہب سے بیگانہ ہو کر ملحد ہو گئے۔ پھر ان افراد نے نظریہ ارتقاء کی با قاعدہ تبلیغ کرنا شروع کر دی اور اس کے اثرات عالمگیر سطح پر پڑے۔ ڈارون کے نظریہ ارتقاء میں الحاد کے نظریاتی اور فلسفیانہ پہلو اہم تھے جس نے خصوصاً الہامی ادیان کے بنیادی عقائد یعنی وجود باری تعالی، رسالت اور عقیدہ آخرت پر حملہ کیا۔ لیکن اس بات میں کوئی شک نہیں کہ فکری اور نظریاتی میدان میں الحاد اسلام کے مقابلے میں کلیتاً ناکام رہا البتہ عیسائیت کے مقابلے میں اسے جزوی فتح حاصل ہوئی.... لیکن سیاسی، معاشی اور معاشرتی میدانوں میں الحاد کو مغربی اور مسلم دنیا میں بڑی کامیابی نصیب ہوئی۔ سیاسی میدان میں الحاد کی سب سے بڑی کامیابی سیکولرازم کا فروغ ہے۔ پوری مغربی دنیا اور مسلم دنیا

کے بڑے حصے نے سیکولر ازم کو اختیار کرلیا ہے۔ سیکولر ازم کا مطلب ہی یہ ہے کہ مذہب کو مسجد تک محدود کردیا جائے اور کاروبار زندگی کو خالصتاً انسانی عقل کی بنیاد پر چلایا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کا کوئی حصہ نہ ہو۔ مغربی دنیا نے تو سیکولر ازم کو پوری طرح قبول کرلیا اور اب اس کی حیثیت ان کے ہاں ایک مسلمہ نظریہ کی ہے۔ انہوں نے اپنے مذہب کو گرجے کے اندر محدود کرکے کاروبار حیات کو مکمل طور پر سیکولر کرلیا ہے۔ ان کی اتباع میں مسلمانوں کی اشرافیہ بھی الحاد کے اثرات کو قبول کرنے لگی، اور آخر کار بہت سے اسلامی ممالک نے سیکولر ازم کو بطور نظامِ حکومت کے قبول کرلیا۔ بعض ممالک جیسے ترکی اور تیونس نے تو اسے کھلم کھلا اپنانے کا اعلان کیا لیکن مسلم ممالک کی اکثریت نے سیکولر ازم اور اسلام کا ایک ملغوبہ تیار کرنے کی کوشش کی جس میں بالعموم غالب عنصر سیکولر ازم کا ہی رہا۔

اسی طرح معاشی میدان میں کارل مارکس کی اشتراکیت یا کمیونزم وہ نظریہ تھا، جس نے الحاد کے ڈھانچے میں نئی جان ڈال دی۔ مارکس اور اس کا ساتھی فریڈرک اینجلز، جو بہت بڑا ملحد فلسفی تھا، کے مشترکہ نظریے نے کمیونسٹ انقلاب برپا کیا، جس نے یکلخت ملحدوں کی تعداد لاکھوں کے ہندسے سے نکال کر کروڑوں تک پہنچا دی۔ لیکن اس زبردست کامیابی کے بعد بھی الحاد کا زور ابھی تک مخصوص خطوں میں تھا۔ کچھ یورپی ممالک جہاں نظریہ ارتقاء بہت مقبول ہوا، اور روس و

چین جہاں کمیونزم کی وجہ سے دہریت پھیلی، باقی متمدن دنیا میں اور خصوصاً مسلم دنیا میں اس کے اثرات نہ ہونے کے برابر رہے۔ لیکن پھر کمپیوٹر ایجاد ہوااوراس کے بعد نوے کی دہائی میں انٹرنیٹ کی ایجاد سے تو ملحدوں کو عالمی سطح پر الحاد کی ترویج کے لیے ایک وسیع اور تیز ترین پلیٹ فارم مہیا ہو گیا۔اس سائبر میڈیا کی بدولت ملحدین کو صرف بیس سالوں میں وہ کامیابی ملی جو وہ پچھلی ایک صدی میں حاصل نہ کر سکے تھے، یعنی ادیان کے خلاف ایک عالمگیر اور ہمہ گیر جدوجہد.... اور اس کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے، آج الحاد کے دنیا بھر میں پھیلاؤ کا یہ حال ہے کہ 11دسمبر2012 کی ایک تازہ ترین رپورٹ کے مطابق دنیا بھر میں الحاد کے اثرات ہر شعبے فلسفے، سیاست، معیشت، معاشرت اور اخلاق میں تیزی سے نمایاں ہو رہے ہیں۔اس رپورٹ کے مطابق دنیا میں مسیحیوں اور مسلمانوں کے بعد تیسرا بڑا گروہ ملحدین افراد پر مشتمل ہے جبکہ ہندو چوتھے نمبر پر ہیں۔اس رپورٹ میں تعداد کے اعتبار سے 2 ارب 20 کروڑ کے ساتھ مسیحیت سب سے بڑا مذہب ہے۔ مسلمانوں کی آبادی ایک ارب 60 کروڑ ہے جن میں سے بیشتر سنی مسلم ہیں جبکہ 10 سے 13 فیصد شیعہ ہیں۔ ملحدین کی تعداد ایک ارب 10 کروڑ ہے، جن میں سے 70 کروڑ صرف چین میں رہتے ہیں' جو چین کی آبادی کا52.2 فیصد ہیں جبکہ دوسرے نمبر پر جاپان ہے جہاں مذہب بیزار افراد کی تعداد7 کروڑ20 لاکھ ہے۔ امریکہ میں ان افراد کی تعداد5 کروڑ10 لاکھ بنتی ہے۔ اس تحقیق کا عنوان 'گلوبل ریلیجیس لینڈاسکیپ

ہے، جس کے نتائج واشنگٹن میں قائم ایک فورم آن ریلیجن اینڈ پبلک لائف نے جاری کیے۔
ایک عرب اخبار کے مطابق ملحدین نے الحاد کی تبلیغ کے لیے دنیا کے مختلف زونز میں عموماً اور مسلم دنیا کے لیے خصوصی انٹرنیٹ گروپس تشکیل دیے ہیں۔ انٹرنیٹ پر اس قسم کی الحادی فکر رکھنے والے 39 گروپس ہیں، جن میں سے اکثر کا تعلق "فیس بک" سے ہے۔ہماری تحقیق کے مطابق باقاعدہ طور پر پاکستانی نیٹ کی دنیا میں ملحدوں نے 2008ء کے اوائل میں اپنے قدم جمائے اور آہستہ آہستہ اپنا دائرہ عمل بڑھاتے چلے گئے۔پہلے پہل انھوں نے بلاگ بنائے، جو انٹرنیٹ پر آزادی اظہار کا سب سے موثر طریقہ ہے۔ لفظ "بلاگ (Blog)" ویب لاگ (Web Log) سے بنا ہے اور یہ ایک طرح کی آن لائن ڈائری ہے۔اس نے باقاعدہ عوامی مقبولیت تب حاصل کی جب اگست 1999ء میں پائرا لیبس نامی ایک امریکی ادارے نے پہلی مفت بلاگنگ سروس شروع کی اور اس کا نام بلاگر رکھا۔ پھر رفتہ رفتہ دنیا بھر میں بلاگنگ کے تصور نے آزادی اظہار کے لیے لوگوں کو انٹرنیٹ پر گویا ایک ہائیڈ پارک دے دیا۔
آپ اس نقطہ نظر سے صرف پاکستان کی بلاگنگ دنیا ہیں جھانک لیں، جہاں بلاگنگ انتہائی تیزی سے ترقی کر رہی ہے اور ایک حالیہ سروے کے مطابق پاکستان میں اس وقت ہزاروں افراد بلاگنگ کر رہے ہیں۔ یہاں کی بلاگنگ دنیا میں شعائر اسلام

کا مضحکہ اڑانا یا کم از کم ان کے بارے میں شکوک پھیلانا کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔

انگلش بلاگنگ تو خیر سیکولرازم کی تبلیغ کے لیے وقف ہے ہی، اردو بلاگنگ کی دنیا میں بھی کئی بلاگر ایسے ہیں جن کی تحریریں توہینِ اسلام کے زمرے میں آتی ہیں۔ بے شک انگریزی اور اردو بلاگنگ میں یہ فرق ضرور ہے کہ اردو بلاگنگ کی دنیا میں ایسے کئی بلاگر موجود ہیں جو گستاخانہ مواد شایع کرنے والوں کی سخت گرفت کرتے ہیں، لیکن بہرحال یہ زہریلا مواد بدستور نیٹ پر نہ صرف موجود ہے بلکہ اپنے متنازعہ مواد کی وجہ سے بہت زیادہ ریٹنگ بھی پا جاتا ہے اور اللہ اپنی پناہ میں رکھے، اس مواد کو سراہنے والے اور بلاگر کی پیٹھ تھپکنے والے بھی کئی مل جاتے ہیں۔ ایک عجیب بات یہ ہے کہ پاکستان کی نیٹ دنیا میں اکثر اسلام کے مسلمہ اصول وارکان کے خلاف شکوک و شبہات پھیلانے والے وہ ہیں، جن کے نام بدستور مسلمانوں والے ہیں، اور وہ کھلے عام کفریہ باتیں کرکے اور ہر طرح کی گستاخی کرکے بھی اپنے کفر کا کھل کر اقرار نہیں کرتے۔ ان کی یہی رٹ ہوتی ہے کہ ہم مسلمان ہیں، بلکہ اصل مسلمان ہیں۔ یا للعجب! اللہ کی شان میں گستاخی، اس کے کلام پر اعتراضات کی بھرمار، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث کا مضحکہ اڑا کر اور جنت دوزخ اور دوسرے مغیبات کے بارے میں شکوک و شبہات پھیلا کر بھی یہ لوگ مسلمان ہیں تو پتہ نہیں کفر اور کیا ہوتا ہے! یہی لوگ سیدھے سادھے نوجوانوں کے ایمان پر ڈاکا ڈالنے میں سب سے زیادہ کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں ایک بیرون

ملک مقیم پاکستانی ملحد بلاگر محمد علی مکی تو شیطان کی طرح مشہور ہے۔ اس نے ہمارے خیال میں پاکستان کی نیٹ دنیا کو سب سے زیادہ اپنے گستاخانہ اور ملحدانہ خیالات سے نجس کیا۔ یہ زندیق جو بزعم خود عربی جانتا ہے، اپنی عربی اور انگریزی دانی کے غرور میں بے دریغ اللہ تعالی کے کلام پر اعتراض، اللہ تعالی کی شان میں گستاخی اور پیارے نبی کی شان میں گستاخی کرتا چلا جاتا ہے (نعوذ باللہ)۔ شدید احتجاج کے بعد جب اردو محفل سے اس کی زہریلی تحریریں ہٹائی گئیں تو اس نے "حقیقی اپروچ" کے نام سے اپنی ویب سائٹ بنالی اور وہاں "ناستک" کے نام سے اپنے نظریات کا پرچار کرنے لگا۔ مکی کے علاوہ اور بھی نام ہیں لیکن میں خاص طور پر ایک اور بدنصیب شخص طارق احمد صدیقی کا ذکر کرنا چاہوں گا جو پہلے ایک مذہبی تحریک کے سرگرم رکن اور ایک دینی رسالے کا مدیر بھی رہے، لیکن نہ جانے کس عمل کی نحوست کی وجہ سے یقین کی وادی سے نکل کر شکوک کے گڑھوں میں جا گرے۔ اور اب نیٹ پر تشکیک کے علمبردار ہیں، ان کی دعوت ہے کہ ہر چیز پر شک کرو کہ یہی انسانیت کی معراج ہے۔ اسی شک نے انہیں جنت، دوزخ، قرآنی آیات اور صحیح احادیث ہر چیز کو اپنی عقل کے مطابق جانچنے کی راہ دکھائی، اور اب یہ "درایت" کے نام سے ایک پرچہ اور ویب سائٹ کے ذریعے الحاد کی ترویج میں مصروف ہیں۔ یہ کم علم نوجوانوں کے ذہنوں پر ملاحدہ کے صدیوں پرانے سوالات (جن کے شافی جوابات صدیوں پہلے ہی دیے جا چکے) کی بھرمار کرتے ہیں اور ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ سب اسلام کے نام پر ہوتا

ہے۔

کچھ عرصے کے بعد پاکستانی ملحدین نے بلاگنگ سے ایک قدم آگے بڑھا کر اور انفرادی طور پر کام کرنے کی بجائے متحد ہو کر پاکستان کے یومِ آزادی 14 اگست 2011ء کو PAA ایک ویب سائٹ (PAA مخفف ہے 'Pakistani Atheists and Agnostics group' کا) کے نام سے لانچ کی۔ انتہائی صدمے اور افسوس کی بات ہے کہ ایمان سوز عزائم لیے یہ ویب سائٹ بے حد مقبول ہوئی، جس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے لانچ ہونے کے اگلے 48 گھنٹوں میں 95 ممالک سے 17000 افراد نے اس کو دیکھا، پسند کیا، اور اس میں اکثریت مسلمان ناموں کی رہی۔ وہ جو مسلمان گھرانوں میں پیدا ہوئے لیکن اب ملحد ہیں اور اپنے کو 'closet' atheist یعنی چھپا ہوا ملحد کہتے ہیں۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہمیں مسلم معاشرے میں الحاد کا اعلان کرنے میں اپنی جان کا خطرہ ہوتا ہے، ورنہ ہماری تعداد بہت زیادہ ہے۔ اور زیادہ عبرت کی بات ہے کہ نیٹ ٹریفک کے اعداد و شمار کے اعتبار سے اس ویب سائٹ پر پچانوے ممالک میں سے سب سے زیادہ وزیٹرز پاکستان، سعودی عرب اور امریکا کے تھے۔ صرف دو دن میں پاکستانی ملحدین کو اس ویب سائٹ کے ذریعے پانچ سو ممبر مل گئے۔ ساری دنیا کے ملحدین نے پاکستانی ملحدین کی اس موقع پر ہمت بندھائی اور کہا کہ تم اکیلے نہیں ہو، ہم تمہارے ساتھ ہیں!

اسی سال 2011ء کے اواخر میں پاکستانی ملحدین کے سب سے سرگرم رکن 'حضرت ناخدا' جس کا تعلق لاہور سے ہے، نے مشہور سوشل سائٹ 'فیس بک' پر ایک گروپ " کے نام سے بنایا۔ پاکستانی" فیس بکیوں "" (Pakistani Atheists) پاکستانی ملحدین کے لیے یہ بات شاید بہت نرالی تھی ،اس لیے تجسس کے لیے ہی سہی انہوں نے اس فورم پر "ہلا" بول دیا اور یوں بغیر کسی محنت کے ان لوگوں کا مقصد پورا ہو گیااور ابتدائی مہینوں میں ہی اس گروپ کے آٹھ سو ممبر ہو گئے۔ بتایا جاتا ہے کہ ان ممبران میں ننانوے فیصد نوجوان تھے، جن کی عمریں 16 سے 32 سال کے درمیان تھیں اور ان کی بڑی تعداد کا تعلق کراچی، لاہور اور اسلام آباد سے تھا۔

ہم حیران وپریشان ہیں کہ کس کا ناپاک ذکر کریں، کس کا نہ کریں؟ مکی کے علاوہ "ملا ملحد"، "کافر حقانی" ، "حضرت ناخدا" اور نہ جانے کتنے ایسے کم بخت ملحد ہیں، جو مختلف آئی ڈی سے اردو زبان میں اللہ جل شانہ اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کائنات کی بدترین گستاخی کر رہے ہیں۔ یہ لوگ نیٹ کے محفوظ قلعے میں بیٹھ کر، اپنی شناخت چھپا کرالحاد وزندقہ پھیلا رہے ہیں، سادہ لوح اور کم علم نوجوانوں کے ایمان پر شبِ خون مار رہے ہیں۔اور یہ سب کہاں ہو رہاہے، اس پاکستان میں جسے ہم اسلام کا قلعہ کہتے

نہیں تھکتے۔ یہاں 2009ء سے یہ کام بڑی خاموشی کے ساتھ ہو رہا ہے، اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرف سے اسلام کے خلاف توہین آمیز فلم اور دوسرا وہ مواد جس پر پوری دنیا میں اور خصوصاً پاکستان میں بھونچال کھڑا ہو گیا تھا، ہم نے اور بیشتر مسلمانوں نے نہیں دیکھا اور اللہ اسے دیکھنے سے سب کی حفاظت فرمائے لیکن وہ سارا مواد جو ہم نے پچھلے ایک سال میں پاکستانی سائٹس پر دیکھا اور جو خاص اس آرٹیکل کے لیے دیکھنا پڑا، اس کو دیکھ کر ہم بالیقین کہ سکتے ہیں کہ خدا اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی توہین پاکستان کی نیٹ دنیا میں ہو رہی ہے اور خاص اردو زبان میں ہو رہی ہے، وہ شاید مغرب میں بھی نہیں ہوئی۔ بنگلہ دیش کے بنگالی بھائیوں کو سلام ہے کہ انھوں نے چند بلاگرز کے بلاگز پر فوراً ردِ عمل ظاہر کیا اور بھرپور احتجاج کیا۔ جب کہ ہم بدستور اپنے روزمرہ میں گم ہیں۔ [ہمارا موضوع یہاں نیٹ ہے، کیوں کہ نیٹ کے ذریعے اپنے نظریات کی تبلیغ بہت محفوظ ہے، لیکن پاکستان میں اب ملحدین کی ہمت اتنی بڑھ گئی ہے کہ انھوں نے فلم، ٹی وی اور پرنٹ میڈیا میں بھی ڈھکے چھپے انداز میں اسلامی احکام اور ارکان کے خلاف شکوک پھیلانے شروع کر دیے ہیں، جس کی واضح مثال پچھلے تین سالوں میں تواتر کے ساتھ ریلیز ہونے والی تین پاکستانی فلمیں "بول"، "خدا کے لیے" اور "رام چند پاکستانی" ہیں، جن میں جی کھول کر اسلامی شعائر اور احکامات کا مذاق اڑایا گیا ہے۔]

یہ تو پاکستان کا حال ہے، نہایت عبرت انگیز بات یہ ہے کہ عرب جہاں سے اسلام کا نور ساری دنیا میں پھیلا، وہ بھی انٹرنیٹ کے ذریعے ملحدین کے خاص ٹارگٹ پر ہے اور وہ اپنے اہداف تیزی سے حاصل بھی کر رہے ہیں۔اور اس کام کے لیے انہیں عربوں میں سے ہی اپنے مطلب کے لوگ مل گئے ہیں جنھوں نے اپنی بدبختی کی وجہ سے اس الحاد کی دعوت پر لبیک کہا اور پھر الحاد پھیلانے میں مصروف ہو گئے۔فیس بک پر آپ کو ان کا فورم بھی ملے گا جسے "عرب ملحدین فورم" کا نام دیا گیا ہے۔ اس الحادی فورم میں اب تک سینکڑوں افراد شمولیت اختیار کر چکے ہیں ۔ ملحدوں کی اس سائٹ پر الحادی فکر کے حامل ہر عرب کو اس بات کا موقع فراہم کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ملحدانہ افکار کا بے باکانہ اظہار کرے۔ عرب ملحدین گروپ سے تعلق رکھنے والے ایک شخص (zezoe Ami) کا کہنا ہے کہ "میں ان دماغوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کروں گا جو غور و فکر سے قاصر ہیں یہ ایسے پتھر جیسے دماغ ہیں جو سائنس کی گولیوں سے مقابلہ پر آمادہ ہیں ،ان دماغوں کو ہر وقت آسمان سے کسی بات کے آنے کا انتظار رہتا ہے (نعوذ باللہ)۔

ایک بات انتہائی قابل توجہ ہے کہ ویسے تو ملحدین کے مناظرے اور بحثیں ہر مذہب کے لوگوں سے ہوتے ہیں، لیکن سچا دین ' دینِ اسلام ان کا خاص ہدف ہے، اسلام کا تمسخر تمام ملحد گروپوں کا مشترکہ مقصد ہے، جس کا واضح مطلب یہی ہے کہ وہ اپنا اصل حریف اسلام کو ہی سمجھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے بیشتر مناقشے اسلام کے تعلق سے ہوتے ہیں۔ اب تک انٹرنیٹ پر اس قسم کے قریب ساڑھے

چار سو مناظرے ہو چکے ہیں، جن میں جنت، دوزخ کا تخیل، قرآن بحیثیت الہٰی کلام اور رسالت جیسے موضوعات زیر بحث لائے گئے۔ ان بحثوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام پر ایسی نازیبا تنقیدیں کی گئیں کہ انہیں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ مصر کے ملحدین نے تو اتنی جرات کر ڈالی کہ قرآن کی طرز پر چند آیات بھی بنائیں، جنہیں "قرآن رابسو" کا نام دیا گیا معاذ اللہ۔

تمام ملحدین کا باقاعدہ لٹریچر بھی انٹرنیٹ پر موجود ہے، جس میں نظریہ ارتقاء کے علاوہ جان کوز کی ایک کتاب بھی ہے جس کا نام "ملحدین کی مقدس کتاب" ہے۔ اس کے علاوہ وہ مرتدین جو اسلام چھوڑ کر ملحد ہوئے، ان کے کچھ خاص آئیڈیل بھی ہیں۔ آئیڈیل ان معنوں میں کہ یہ ان لوگوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ پاک و ہند کے ملحد (سابقہ مسلمان) اسلامی تاریخ میں سے خصوصی طور پر دورِ جاہلیت کے شاعر امیہ بن ابی الصلت (اس کے بارے میں ملحدین کا دعویٰ ہے کہ قرآن نعوذ باللہ اس کلام کی نقل ہے) اور چھٹی صدی ہجری کے مشہور فلسفی اور متکلم ابنِ رشد، ماضی قریب کے سر سید احمد خان، نیاز فتح پوری اور موجودہ زمانے کے پاکستانی مفکر جاوید غامدی، مشہور سیکولر تاریخ دان پروفیسر مبارک علی اور مصری ملحد ادیب طٰہٰ حسین کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ خصوصاً عرب ملحدین اسلام کے رد کے لیے امیہ بن ابی الصلت کے کلام اور طٰہٰ حسین کی کتاب فی الشعر الجاہلی" کو بڑی اہمیت دیتے ہیں، جس میں اس نے اسلام اور"

عربوں کی تاریخ کو مسخ کرکے پیش کیا ہے۔

لٹریچر کے علاوہ انٹرنیٹ پر ملحدین کا ایک ویڈیو چینل بھی ہے۔ اس الحادی چینل کا نام Channel Chakooni ہے جس کا آغاز 2006ء میں ہوا۔ اس چینل سے استفادہ کرنے والوں کی تعداد 80000 تک پہنچ چکی ہے۔ اس چینل پر اظہار خیال کرنے والے بیشتر افراد کا کہنا ہے کہ مذاہب کی کوئی حقیقت نہیں، یہ خیالی داستانیں ہیں۔

الحادی گروپوں میں سے ایک گروپ کا نام یوں ہے "مجھے ملحد ہونے پر فخر ہے" اس گروپ کے 27000 ارکان ہیں۔ ان کا یہ بھی دعویٰ ہے کہ دنیا بھر کے علمی اداروں اور یونیورسٹیوں پر ان کا تسلط ہے۔

الحاد دراصل ہر گناہ کی چابی ہے۔ اگر کوئی شخص یہ یقین کرلے کہ اس دنیا کا کوئی خدا نہیں ہے، موت کے بعد کوئی زندگی نہیں ہے جہاں اسے اپنے کیے کا حساب دینا ہوگا تو پھر حکومت کے قوانین کے سوا کوئی چیز دنیا میں اسے کسی برائی کو اختیار کرنے سے نہیں روک سکتی۔ اور جب الحاد غالب آئے گا تو پھر حکومت کے قوانین بھی صرف انسانوں کو ایک دوسرے کی آزادی میں مخل ہونے سے روکنے کے لیے ہوں گے۔ یوں پھر زندگی کا مقصد اس دنیا میں زیادہ سے زیادہ لذت کوشی ہی رہ جائے گی۔ پھر مادر پدر معاشرتی آزادی ایک انسان کو برہنہ پھرنے کا حق دے گی اور انسان کو جانوروں کی سطح پر آنے میں کوئی چیز مانع نہ رہے

گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج ملحدین انٹرنیٹ پر یہ دعویٰ کرتے پھرتے ہیں کہ مسلمان آج جن مشکلات سے دوچار ہیں، وہ دراصل جنسی خواہش کو دبائے رکھنے اور مرد و عورت کے درمیان تفریق و امتیاز کے نتیجے کی وجہ سے ہے۔

اسلام چھوڑ کر الحاد اختیار کرنے والے ملحدین کے حوالے سے یہ بات بھی قابل غور ہے کہ ماضی قریب میں ان بدبخت مرتدین میں مردوں کا تناسب عورتوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا، لیکن ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق ماضی کے مقابلے میں آج عالم اسلام میں رفتہ رفتہ مردوں کے ساتھ عورتیں بھی الحاد کے اثرات قبول کر رہی ہیں۔ اس ضمن میں مسلم دنیا کے ملحدین نے یہ طریقہ واردات اختیار کیا کہ انھوں نے نیٹ پر ایسی تعلیم یافتہ مسلمان عورتوں کو جو آزاد خیال اور دین سے بیگانہ ہوتی تھیں، خصوصی طور پر اپنی دعوتِ الحاد کا نشانہ بنایا اور اسلام میں خواتین کی عصمت کی حفاظت اور ان کے اعزاز و اکرام کے لیے جتنے خصوصی احکامات ہیں (مثلاً پردہ، عورت کے لیے چار دیواری کی اہمیت وغیرہ)، انہی احکامات کو شدید تنقید کا نشانہ بنا کر اور انہیں اپنی مرضی کا معنی پہنا کر ان کی ذہن سازی کی اور بالآخر انہیں ملحد بنا کر چھوڑا۔ یوں اسلامی دنیا میں مردوں کے ساتھ جدید تعلیم یافتہ عورتیں بھی، اسلام کے جداگانہ صنفی احکامات (جو فطرت کے قریب انتہائی خوبصورت احکامات ہیں) کو بنیاد بنا کر خدا کے وجود سے انکار کرنے لگیں، پھر اس کا لازمی نتیجہ

خاندانی نظام کا خاتمہ اور فری سیکس کا فروغ نکلا۔ کیوں کہ جنسی زندگی سے متعلق آداب انسان کو اللہ تعالی نے انبیاء کرام علیہم الصلوۃ والسلام ہی کے واسطے سے بتلائے ہیں۔

اور جب ایک مرد یا عورت خدا اور انبیاء کا انکار کردے تو پھر اس کی راہ میں ایسی کون سی رکاوٹ ہے جو اسے دنیا کی کسی بھی عورت یا مرد سے آزادانہ صنفی تعلقات سے روک سکے اور جب حیات بعد الموت اور محاسبہ کا یقین اٹھ جائے تو پھر انسان اسی دنیاوی زندگی کو لذت کا جہان بنانے کے لیے نئے نئے راستے کیوں نہ نکالے؟ پھر تو ہم جنس پرستی کا طوفان بھی اٹھے گا اور اس سے آگے بڑھ کر محرم خواتین کا تقدس بھی پامال کیا جائے گا (انتہائی لرزہ خیز اور شرم ناک خبر یہ ہے کہ ایک یورپی بائیس سالہ Atheist ملحد) نوجوان نے اپنی گرینڈ مدر (دادی) سے قانونی شادی کی اور اب ان دونوں کی اولاد بھی ہے)۔

بات کو سمیٹتے ہوئے ہم آخر میں یہ کہیں گے کہ یوں تو ٹی وی وغیرہ کے مقابلے میں انٹر نیٹ کی شرعی حیثیت شروع سے جواز کی رہی ہے، لیکن مندرجہ بالا عبرت انگیز حالات کی بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ انٹرنیٹ کے منفی پہلو، اس کے مثبت پہلو سے کئی گنا بڑھ کر سامنے آرہے ہیں۔ خصوصاً ان نوجوانوں کے لیے یہ بے حد خطرناک ہیں، جن کے ذہن سادہ سلیٹ ہوتے ہیں اور جن پر کوئی بھی اپنے نظریات کی تحریر لکھ سکتا ہے، وہ تحریر جو اکثر اَن مٹ ثابت ہوتی ہے۔ اس لیے

نوجوانوں کونیٹ استعمال کرنے کی کھلی آزادی دینے کی بجائے ان کی نگرانی بہت ضروری ہے۔

اس کے علاوہ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ایک مسلمان الحاد کی گھاٹیوں میں تب ہی اترتا ہے، جب اسے شکوک و شبہات اور وسوسے گھیر لیتے ہیں، اور وہ کسی سے اس کا جواب نہیں پاتے یا پھر اپنی عقل پر بھروسہ انہیں کسی سے کچھ پوچھنے نہیں دیتا، یوں اندر ہی اندر شیطانی وسوسے بالآخر خدا کے انکار کا باعث بن جاتے ہیں۔ اس حوالے سے یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ وسوسے ہر ایک کو آتے ہیں، اس لیے کبھی کوئی نوجوان اپنے وسوسے کا اظہار کرے تو اسے سختی سے جھٹلانے کی بجائے بڑی حکمت عملی سے اس کا ذہن تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ اگر کوئی بے کار ہے تو اسے مصروف کر دینا چاہیے کہ خالی گھر میں شیطان ڈیرہ ڈال ہی لیتے ہیں۔ اگر کوئی بہت بری طرح وسوسوں کا شکار ہو، تو کسی بڑے عالم دین کے پاس لے کر جانا چاہیے، کیوں کہ کبھی براہِ راست جواب کی بجائے ایسے شک کے مریضوں کا علاج صرف الزامی جوابات سے ہی ممکن ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ ہمارے خیال میں ہر شبہ، ہر شک کا حل محبت ہے۔ اور اللہ اور اس کے رسول سے محبت پیدا کرنے کے لیے، اللہ والوں کی صحبت بہت ضروری ہے۔ انسانوں کی نفسیات یہی ہے کہ جب ان میں محبت پیدا ہوتی ہے تو پھر ان کے سارے شکوک و شبہات دور ہو جاتے ہیں، اور محبت کا مرکز عقل نہیں، وجدان ہے۔ نری عقل کے ذریعے محبت کا

تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، عقل محبت کے فلسفے اور راز کو نہیں سمجھ سکتی۔اس کے لیے وجدانی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کی ضرورت ہے۔ پھر وجدان خود گواہی دیتا ہے کہ ربّ کائنات بندے کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔اسی وجدان کو بیدار کرنے کے لیے اللہ والوں کی صحبت ازحد ضروری ہے، اور اللہ والے ملتے ہیں دینی مراکز میں، مدارس، خانقاہوں میں اور اللہ کے راستے میں۔

ان سطور کے ذریعے ہم اربابِ اختیار سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ ایک کمیٹی بنائی جائے، جو ایسی تمام الحاد کی مبلغ ویب سائٹس اور بلاگز کی فہرست بنا کر حکومت کو پیش کرے، تا کہ ان تمام ویب سائٹس پر اسلامی جمہوریہ پاکستان میں مکمل پابندی لگائی جائے، خصوصاً یوٹیوب کی طرح فیس بک پر تو مستقل پابندی لگائی جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو مسلمانانِ پاکستان کو بنگلہ دیش کی طرح بھرپور احتجاج کر کے حکومت پر دباو ڈالنا چاہیے کہ یہ ایمان وکفر کا مسئلہ ہے۔اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمام فتنوں سے ساری امت مسلمہ کی حفاظت اور ہم سب کا خاتمہ ایمان پر فرمائے، آمین۔

!اِن میں سے کوئی نہیں

نواز شریف صاحب نے فرمایا ہے کہ مہذب معاشروں میں ووٹ نہ دینا جرم ہے۔
آج ہم ببانگِ دہل اس جرم کا اعتراف کرتے ہیں کہ ہم نے عمرِ عزیز کے چونتیس سال گزرنے پر بھی آج تک ووٹ نہیں ڈالا۔ اور ہم ہی نہیں، ہمارے جاننے والوں میں اکثریت ان شہریوں کی ہے، جو اس سعادت سے اب تک محروم رہے ہیں۔ ہاں ! ہمارے کچھ دوست ایسے ہیں جو ووٹ کاسٹ کرتے ہیں تو وہ خود اس کا صاف اقرار کرتے ہیں کہ ہمارا ووٹ امیدوار کے امین، باکردار اور محب وطن ہونے کی بنیاد پر نہیں بلکہ لسانی و قومی بنیاد پر ڈالا گیا ہے (ان دوستوں سے معذرت) ۔ بہرحال تمہید برطرف اس بار ہم نے پکا عزم کر لیا تھا کہ ہم پولنگ اسٹیشن ضرور جائیں گے۔ اور ہمارے اس عزم کے پیچھے الیکشن کمیشن کا ملکی تاریخ کا وہ انوکھا فیصلہ تھا جس میں انہوں نے بیلٹ پیپر میں ایک خانہ خالی رکھنے کا ارادہ کیا، جس سے ووٹر کو تمام امیدوار مسترد کرنے کا اختیار حاصل ہو جاتا، یعنی بار بار کے جانے پہچانے اور آزمائے چہروں کو مسترد کرنے کا حق ۔ تفصیل یہ تھی کہ اگر خالی خانے میں 51 فیصد ووٹروں نے مہر لگا کر تمام امیدواروں پر عدم اعتماد کا اظہار کر دیا تو اس حلقے کا الیکشن کالعدم قرار دیا جائے گا اور دوبارہ انتخابات کرایا جائے گا۔ کیا زبردست فیصلہ تھا، جسے بیک زبان ہو کر تمام پارٹی سیاستدانوں نے کارِ

لاحاصل قرار دیا، اس فیصلے پر طرح طرح سے پھبتیاں کسیں اور پھریوں جمہوریت کے علمبرداروں نے جمہوریت کے نقصان کا واویلا مچا کر ایسا دباؤ ڈالا کہ یہ فیصلہ موخر کرنا پڑا۔

انتخابات میں بیلٹ پیپر پر ایک خانہ خالی چھوڑنا یعنی ایک خانے میں "اِن میں سے کوئی نہیں" (none of the above) کا نشان پاکستان کی انتخابی تاریخ میں تو بے شک ایک انوکھی بات ہو گی، لیکن دنیا کے کئی ممالک میں انتخابات میں بیلٹ پیپر میں ایک خانہ "ان میں سے کوئی نہیں" کا رکھا جاتا ہے، اور یہ ممالک وہ ہیں جہاں پاکستان کی طرح "جمہوریت" کسی کوٹھے کی طوائف نہیں، جس کے پیروں میں گھنگروؤں کی زنجیر ڈال دی جاتی ہے، بلکہ ان ممالک میں جمہوریت وہ پری ہے جو اپنے تمام حسن کے ساتھ آسمانِ سیاست میں اڑان بھرتی ہے۔ ہم یہاں صرف دو مثالیں پیش کرتے ہیں، ایک ترقی یافتہ ممالک میں سے امریکا کی کہ وہاں انتخابی بے لٹ پیپرز کے آخر یں بھی یہ خانہ موجود ہوتا ہے۔ آپ سرچ انجن گوگل پر امریکا الیکشن 2012ء سرچ کریجیے، آپ کے سامنے 2012ء کے صدارتی الیکشن کا بیلٹ پیپر آ جائے گا، آپ ملاحظہ کر لیں گے کہ بیلٹ پیپر پر مٹ رومنی اور اوباما کے خانوں کے بعد (none of the above) کا خانہ موجود ہے۔ یعنی امریکی عوام کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اگر ان دونوں کو صدارت کے اہل نہیں سمجھتے تو دونوں کو مسترد کر دیں۔ اس خانے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مختلف سروے کرنے

والی ٹیموں اور تھنک ٹینک کو عوام میں امیدواروں کی حقیقی "مقبولیت" کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔

دوسری مثال ترقی پذیر ممالک میں سے ہمارے برادر ملک بنگلہ دیش کی ہے.... گو بنگلہ دیش میں جمہوریت کا حال کچھ ایسا تسلی بخش نہیں، لیکن بنگلہ دیش کے انتخابی بیلٹ پیپرز کے آخر میں بھی یہ خانہ موجود ہے۔اور اس سے بڑھ کر بنگلہ دیش کے ہر پولنگ سٹیشن کے باہر اور اندر بنگلہ دیش الیکشن کمیشن کی جانب سے پوسٹر لگائے جاتے ہیں کہ ووٹر جس امیدوار کو ووٹ ڈالنے جارہا ہے، کیا وہ دیانتدار ہے؟ لہٰذا ہمیشہ اپنے ضمیر کے مطابق ووٹ ڈالیے۔بنگلہ دیشی الیکشن کمیشن کے ان اقدامات کی وجہ سے تمام سیاسی پارٹیوں پر یہ دباؤ ہوتا ہے کہ وہ مقابلے میں ایسے امیدوار کو کھڑا کریں جس کی شہرت اچھی ہوتی ہے۔

جب دنیا کے دوسرے ممالک یں یہ مثال موجود ہے تو پھر ہمارے ہاں اس کو تمام سیاستدانوں نے اس شدت سے رد کیوں کیا؟ آخر انہیں کس بات کا خوف ہے؟ کیا اس بات کا کہ کہیں پاکستانی عوام کی انتخابی عمل سے لاتعلقی اور تمام سیاسی مداریوں پر عدم اعتمادی کھل کر سامنے نہ آ جائے۔اے کاش کہ یہ فیصلہ موخر نہ ہوتا تو ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ اس بار انتخابی نتائج سیاسی پارٹیوں کے لیے کافی حیرت انگیز ہوتے۔ موروثی سیاست کرنے والے چہروں کو لگ پتا جاتا کہ

عوام ان کی شکلوں سے کتنے بیزار آ چکے ہیں،اور ان کے دل فریب نعروں کا کیسا مضحکہ اڑاتے ہیں۔ یہ محض زور بیان نہیں بلکہ کسی بھی حلقے میں جا کر ایک سروے کر لیں، خود جان جائیں گے کہ عوام کی اکثریت کو اب کسی کے بے روح نعروں سے کوئی دلچسپی نہیں رہی ہے، جس کا ایک واضح ثبوت عوام کی اکثریت کا انتخابات سے لاتعلق رہنا ہے۔ ایک رپورٹ کے مطابق پاکستان میں ووٹرز ٹرن آؤٹ بمشکل تمام 30 سے 35 فیصد رہتا ہے، یعنی 65 سے 70 فیصد ووٹرز ووٹ ہی نہیں ڈالتے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے کہا کہ ہمارا شمار بھی انہی میں ہوتا ہے، کیوں کہ جب ہم پورے خلوص سے یہ سمجھتے ہیں کہ جن امیدواروں کے نام ہمارے سامنے انتخاب کے لیے پیش کیے گئے ہیں، وہ اس کے اہل نہیں تو ہم کیسے ان میں سے کسی کو سلیکٹ کر سکتے ہیں؟اور جب پہلی بار ہمارے ملک میں ہمارے جیسی خاموش اکثریت کو یہ موقع دیا جا رہا تھا کہ ہم موجودہ سیاسی چہروں سے کھل کر بیزاری کا اظہار کر سکیں تو یہ موقع ہم سے چھین لیا گیا۔ اب سننے میں آ رہا ہے کہ لازمی ووٹ ڈالنے کا قانون لایا جا رہا ہے، یعنی ہر شہری اس بات کا قانوناً پابند ہو گا کہ وہ ووٹ ڈالے ، اگر ایسا نہیں کرے گا تو وہ قانون کی نگاہ میں مجرم ہے جیسا کہ نواز شریف صاحب نے مہذب معاشروں کی مثال دیتے ہوئے بھی کہا، لیکن نواز شریف یہ بتائیں کہ انہوں نے مہذب معاشروں کے عوام کی مثال دی تو ہم ان سے کہتے ہیں کہ مہذب معاشرے کے سیاستدانوں کی کوئی مثال بھی تو پیش کریں۔ اور پھر جب انتخابی بیلٹ پیپر پر خانہ خالی چھوڑنے کی

مثال موجود ہے تو پھر وہ کیوں اس میں رکاوٹ بن گئے ہیں۔
اگر لازمی ووٹ کاسٹ کا قانون بنتا ہے تو کوئی ہمیں یہ بتائے گا کہ قانون کی عدالت میں مجرم بننے سے بچنے کے لیے کیا آدمی اپنے ضمیر کی عدالت میں مجرم بن سکتا ہے؟ کیا ہم قانون کی پابندی کی وجہ سے پولنگ اسٹیشن پر کھڑے ہو کر محض اپنے ضمیر کو تسلی دینے کے لیے اپنے دل میں یہ حساب کریں کہ ان میں سے کون کم برا ہے اور کون زیادہ؟ تا کہ کم برے کو ووٹ دے سکیں.... یا للعجب!

پاکستانی سیاست کا ایک روشن چہرہ

ملک میں سیاسی اکھاڑہ سج گیا ہے.... اب دوبدو مقابلہ ہونے ہیں قریب آدھ مہینہ ہی رہ گیا ہے۔ سیاسی پہلوان بڑے بڑے دعوے کر رہے ہیں اور ایک دوسرے کو بڑھ چڑھ کر دعوتِ مبارزت دیتے نظر آ رہے ہیں۔ خوب اکھاڑ پچھاڑ ہو رہی ہے.... ملک کے طول و عرض میں سیاستدان گردش میں ہیں۔ جلسے جلوس ہو رہے ہیں۔ کانفرنسیں ہو رہی ہیں اور دھواں دھار بیانات سے قوم کو ایک بار پھر سہانے خواب دکھائے جا رہے ہیں۔ پانچ سال بعد اپنے اپنے حلقہ انتخاب کو رونق بخشی جا رہی ہے۔ اس بار تو دستار و قبہ کے ساتھ رنگین آنچل بھی سیاسی نقشے میں رنگ بھرنے کے لیے بے تاب ہیں.... جی ہاں سابقہ اور حالیہ اداکاراؤں کے ساتھ اس بار "شی میل" بھی خم ٹھونک کر میدان میں اترے ہیں۔ میڈیا بھی سنسنی پھیلانے میں کسی سے پیچھے نہیں، ٹی وی پر روزانہ چوپالیں جمتی ہیں اور چونکا دینے والے تجزیے پیش کیے جا رہے ہیں۔ غرض ایک گہما گہمی ہے اور بالکل ایک میلے کا سا سماں ہے۔

یوں تو ایک سنسنی خیز دنگل کے سارے لوازمات موجود ہیں، یعنی خون گرم کرنے کے سو بہانے.... لیکن اپنی دال دلیہ کی فکر میں سرگرم مجھ جیسے ایک عام نوجوان کے نزدیک یہ اک کھیل تماشے سے زیادہ اہم نہیں۔ سنِ شعور سے اب تک کے

پانچ انتخابات نگاہ میں ہیں....کچھ فرق نہیں پڑتا، صرف چہرے بدل جاتے ہیں۔ مایوسی گناہ ہے لیکن اب کسی طور یقین نہیں آتا کہ جب کسی کے دل میں وطن کا حقیقی درد نہ ہو تو وہ صرف کھوکھلے نعروں کے ذریعے کوئی تبدیلی لا سکتا ہے۔ جب دل و دماغ میں یہ یقین اتر گیا ہو کہ ہم تو صرف کٹھ پتلیاں ہیں، ہماری ڈوریں تو "کہیں "اور سے ہلائی جاتی ہیں ، اور پھر ان اشاروں پر ناچ دکھانے سے انکار کی نہ ہمت ہے ، نہ ڈوریں توڑنے کی سکت تو مایوسی کیوں نہ اپنے پر پھیلائے.... صرف ایٹم کو قابو کرنے ہی سے عزت و وقار نہیں مل جایا کرتی، ورنہ سب ہی کچھ تو ہے، کھربوں کے خزانے سمیٹے وسیع زمینیں، لہلہاتی فصلیں، کروڑوں نوجوان، ایٹم بم اور میزائلوں کی وسیع رینج.... سب کچھ، لیکن نہیں ہے تو وہ اک جوہر نہیں ہے، جو نہ ہو تو سب کچھ بے کار ہے.... وہ جسے دیانت کہتے ہیں اور جو حلال خوری سے جنم لیتا ہے۔ یہ بات نہیں کہ پاکستان کو ایسے حلال خورے ملے نہ ہوں۔ لیکن لگتا ہے کہ ہمارے جنم لینے سے پہلے ہی سب اس دنیا سے کوچ کر گئے تھے۔ ستر کی دہائی کے بعد جیسے یہ ملک سیاسی قدروں کے حوالے سے بنجر ہو گیا، شاید یہ سقوطِ ڈھاکہ کی نحوست ہو۔ خیر کچھ دن پہلے لائبریری میں ایک کتاب سرسری دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کتاب میں درج ایک واقعہ کے ذریعے ہم اپنی سیاسی تاریخ کی ایک قدآور شخصیت سے متعارف ہوئے۔ ہمیں اعتراف ہے کہ اس سے پہلے ہم نے ان کا نام بھی نہ سنا تھا۔ یہ چودھری نصیر احمد عرف لارڈ ملہی تھے جو 1913ء میں بدوملہی ضلع سیالکوٹ میں پیدا

ہوئے۔ موصوف کا شمار نہ صرف آزادی پاکستان کے رہنماؤں میں ہوتا ہے بلکہ دیانت، امانت، سچائی کے حوالے سے بھی وہ وطن عزیز کے ان معدودے چند سیاستدانوں میں تھے، جن سے وطنِ عزیز کو نیک نامی ملی۔ وہ پاکستان کا روشن چہرہ تھے۔ ہم نے سوچا کہ پاکستانی کی سیاست کی اس قد آور شخصیت کا تعارف اپنے قارئین سے بھی کروادیں، کہ بدگمانی یہی ہے کہ میری طرح لاکھوں پاکستانی "اِن" سے اور ان کی قبیل کے دوسرے افراد سے ناواقف ہوں گے، وہ قافلہ حق جو گزر گیا اور ہمارے زمانے کا کوئی نام ان کے پاسنگ بھی نہیں.... کتاب میں موصوف کی تعریف میں صرف روز ویلٹ والا واقعہ درج تھا۔ اس لیے چودھری صاحب کی تفصیلی سوانح جاننے کے لیے ہمیں Wikipedia کا سہارا لیناپڑا۔پڑھیے اور سوچیے کہ اب ایسے مخلص لوگ ہماری سیاست کو کیوں نصیب نہیں ہو رہے؟

ان کے والد کے ذکر سے شروع کرتے ہیں، کیوں کہ یہ ان کے والد کے زریں اصول ہی تھے، جن کا پرتو ساری زندگی ان کے ہونہار بیٹے کے روز و شب میں نظر آیا۔ والد کا نام تھا چودھری غلام حیدر اور وہ بدوملہی ضلع سیالکوٹ کے ایک بڑے زمیندار ہونے کے باوجود روایت سے ہٹ کر غریبوں کے حقیقی غم خوار تھے۔ دیگر زمینداروں کے برعکس وہ اپنے مزارعوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اس سلسلے میں انہوں نے 1918ء میں ایک تعلیمی ادارہ بھی قائم کیا تھا، جو

خود انہی کے نام سے موسوم ہوا۔ غلام حیدر مسلم ہائی اسکول میں نہ صرف طلباء کی تعلیم بالکل مفت تھی، بلکہ یونیفارم اور کتابیں بھی چودھری صاحب کی طرف سے مہیا کی جاتی تھیں۔ انہی کے گھر میں ننھے نصیر احمد نے آنکھ کھولی۔ جس نے ہوش سنبھالتے ہی اپنے گھر میں مسلم امہ کی زبوں حالی پر اپنے عزیزوں کو پریشان دیکھا۔ جب نصیر احمد کے اسکول جانے کی عمر ہوئی تو چودھری غلام حیدر نے انہیں بھی اپنے ہی اسکول میں مزارعوں کے بچوں کے ساتھ بٹھایا۔ جب کہ چودھری صاحب اس زمانے کے اعتبار سے بھی کروڑ پتی شخص تھے۔ وہ چاہتے تو اپنے قابل بیٹے نصیر احمد کو دیگر بڑے زمینداروں کی طرح معروف پرائیویٹ اسکول میں بھیج سکتے تھے، لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ اُس تعلیمی ادارے میں کسی کو کسی پر فوقیت دینے کی پابندی تھی، صرف قابلیت کو ترجیح دی جاتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ چودھری نصیر احمد کو بھرپور محنت کرنا پڑتی تھی۔ والد کے قائم کردہ اسکول سے چودھری نصیر احمد نے میٹرک پاس کیا، پھر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے، جہاں سے انہوں نے گریجویشن کیا۔ پھر پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی اور وکالت کے پیشے میں آگئے۔ خدمتِ خلق خون میں شامل تھی، اس لیے عوام سے زیادہ قریب تھے۔ آہستہ آہستہ سیاست کی جانب مائل ہونے لگے۔ سیاست کا آغاز کیا انڈین نیشنل کانگریس سے اور 1939ء میں کانگریس کے ٹکٹ پر ڈسٹرکٹ بورڈ سیالکوٹ کے رکن منتخب ہوئے، لیکن اگلے ہی سال 22-24 مارچ 1940ء کو جب لاہور میں مسلم لیگ کی تاریخی قرارداد

قراردادِ پاکستان" منظور ہوئی تو مسلم لیگ میں آ گئے۔ گھٹی میں پڑی ہوئی مسلم امہ کی" محبت اور ان کے لیے ایک الگ ملک کے حسین خواب نے انہیں چند ہی مہینوں میں آل انڈیا مسلم لیگ کا نہایت سرگرم اور متحرک ترین رکن بنا دیا۔ آپ نے پنجاب میں مسلم لیگ کو مقبول بنانے کے لیے اپنا خاندانی اثر و رسوخ، اپنا مال اور اپنی ساری صلاحیتیں لگا دیں۔ 1944ء میں پنجاب مسلم لیگ کونیشن میں قائدِ اعظم کو شرکت کی دعوت دینے خود گئے، وہیں ان کی ملاقات نواب بہادر یار جنگ سے ہوئی۔ انہوں نے انہیں بھی کونشن میں شرکت کی دعوت دی۔ کونشن ہوا اور اتنا کامیاب ہوا کہ خضر حیات ٹوانہ کی حکومت ہل گئی۔ قیام پاکستان کے حق میں انہوں نے پورے پنجاب میں کونشن، کانفرنس اور جلسے کرائے مگر ان جلسوں پر خرچ ہوئی رقم ان کی ذاتی تھی۔ وہ اپنی جائیدادیں بیچ بیچ کر کارکنوں کی فوج تیار کرتے رہے۔ اسی فوج نے خضر حیات ٹوانہ کی حکومت کو گرا کے مسلم لیگ کو پنجاب میں مستحکم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ قیام پاکستان تک ان کی آدھی سے زیادہ جائداد بک چکی تھی۔ قیام پاکستان کے بعد انہیں وزیرِ تعلیم کا قلمدان ملا تو انہوں نے پہلا حکم نامہ یہ جاری کیا کہ ایچیسن کالج کی سرکاری گرانٹ بند کی جائے کیوں کہ یہ کالج امراء کے بچوں کے لیے ہے تو اس کے اخراجات بھی امراء کے ذمہ ہونے چاہئیں۔ پھر انہوں نے اسکول اور کالجز میں طبقاتی فرق مٹانے کے لیے" ایک" یونیفارم کا نظام نافذ کیا۔ وہ وزیر ہوتے ہوئے بھی نجی دوروں اور دوستوں کی مدارات پر خود خرچ کرتے۔ سرکاری

رقوم کو عوام کی کمائی کہتے اور اس کے زیاں کو حرام قرار دیتے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے کہ جن دنوں روز ویلٹ جنرل اسمبلی کی صدر تھیں۔ بھارتی مندوب نے مادام کے اعزاز میں استقبالیہ دینے کی لابنگ شروع کی۔ چوہدری نصیر احمد نے بھی پاکستان کی طرف سے لابنگ شروع کی۔ مہم کامیاب قرار پائی۔ اس استقبالیہ میں اقوام متحدہ کے تمام رکن ممالک نے شرکت کی اور یہ ایک کامیاب ترین سیاسی تقریب قرار پائی۔ اس دعوت کے تمام اخراجات انہوں نے اپنی جیب سے ادا کیے۔ دوستوں نے مشورہ دیا کہ اخراجات حکومتِ پاکستان سے لے لیں تو انہوں نے جواب دیا :

یہ دعوت میں نے صرف ملک کا وقار بلند کرنے کے لیے اپنے طور پر دی تھی پھر میں" عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر ڈاکا کیوں ڈالوں ؟" پہلو میں مسلمانوں اور ہم وطنوں کے لیے دردمند دل رکھنے والے وطن کے یہ سچے خدمت گزار 1991ء میں اچانک دل کے دورے سے بدوملہی میں اپنی حویلی کی دہلیز پر گرے اور روح پرواز کر گئی۔ اللہ تعالٰی ان کی مغفرت فرمائے۔

آخر میں لاہور سے ایک دوست کا انتخابات کے پس منظر میں ایس ایم ایس .... لکھا ہے کہ

سکندرِ اعظم فتح کے بعد یونان کے علاقے میں گیا تو دیکھا، ایک جگہ ایک شخص دنیا سے بے خبر سو رہا تھا۔ سکندرِ اعظم نے اسے لات مار کر جگایا اور کہا

کہ تو بے خبر سو رہا ہے، میں نے اس شہر کو فتح کر لیا ہے۔ اس شخص نے سکندر کو دیکھا اور کہا کہ شہر فتح کرنا بادشاہ کا کام ہے اور لات مارنا گدھے کا، کیا کوئی انسان دنیا میں نہیں رہا جو بادشاہت ایک گدھے کو مل گئی ہے۔

ووٹ دینے سے پہلے ذرا سوچیے گا، ورنہ بادشاہت پھر گدھوں کو مل جائے گی!

میں نے اسلام کیوں قبول کیا(4)

(4) میں نے اسلام کیوں قبول کیا

چودھری آر کے عادل/ چودھری رام کرشن لاکڑا

کفر کے اندھیروں سے ایمان کے اجالے تک آنے والے چند خوش نصیبوں کا تذکرہ، جنھوں نے سچائی کے راستے کے لیے ایسی قربانیاں دیں جنھوں نے صحابہ کرام کی یاد تازہ کر دی۔ قارئین کی بے حد پسندیدگی پر اس مبارک سلسلے کا چوتھا حصہ ذیل میں پیش ہے۔

میرا پرانا نام رام کرشن لاکڑا ہے۔ میں دہلی نجف گڑھ کے علاقے کی ہندو جاٹ فیملی سے تعلق رکھتا ہوں۔ میرے باباجی ہمارے گاؤں کے پردھان اور زمیں داروں میں سے ہیں۔ ہمارا گاؤں کچھ زمانہ پہلے روہتک ضلع ہریانہ میں تھا۔ میں آج کل دہلی میں پراپرٹی ڈیلنگ کا کام کرتا ہوں۔ یوں تو میں اس سنسار (دنیا) میں 27 ستمبر 1959ء کو آ گیا تھا، مگر دوسرا جنم ٹھیک 4 سال بعد 27 ستمبر 2004ء کو ہوا ہے۔

میں اپنے پڑوس کی مسجد کے مولوی صاحب سے بھی کہہ رہا تھا کہ عجیب بات یہ ہے کہ پہلے جنم کے ٹھیک ۴۵ سال بعد میں نے نیا جنم لیا اور دوبارہ جنم کے عقیدے سے توبہ کی۔ میں نے 27 ستمبر 2004ء پیر کے دن ساڑھے سات بجے دن چھپنے کے بعد مولوی کلیم صدیقی صاحب کے ہاتھ پر پھلت ضلع مظفر نگر، یوپی میں ان کے گھر کے اوپر والے کمرے میں کلمہ پڑھ کر اپنی نئی اسلامی زندگی شروع کی۔

میں نے 1976ء میں ہائی اسکول پاس کیا اور آگے پڑھنے سے منع کر دیا۔ دو سال تک چھٹی کرتا رہا۔ میرے تاؤ اور ایک موسا (پھوپھا) فوج میں بڑے کرنل ہیں۔ وہ گھر آئے۔ انھوں نے مجھے دھمکایا: اگر تو پڑھنے نہیں جاتا تو تجھے فوج میں بھرتی کر دیں گے اور تجھے لام پر جانا پڑے گا۔ میں نے داخلہ لے لیا اور انٹر کر لیا، مگر پھر پڑھنے کو دل نہ چاہا۔ میری ماں نے بابا سے کہہ کر میری شادی کرا دی اور ماں کی خوشی کے لیے میں نے پرائیویٹ بی اے بھی کر لیا۔ شادی کے دو سال بعد میرے پھوپھا نے ایک ضروری کام کے بہانے دھوکے سے بریلی بلایا اور مجھے بیرک میں لے جا کر میرے بال کٹوائے۔ وہ فوج میں کرنل تھے۔ سارے کاغذات اور میڈیکل کرا کے مجھے بھرتی کر لیا اور مجھ سے کہا کہ تیری بھرتی ہو گئی ہے۔ اب اگر تو بھاگے گا تو فوجی تجھے پکڑ کر لائیں گے اور بھگوڑا اقرار دے کر گولی مار دیں گے یا جیل میں ڈال دیں گے۔ مجھے ڈر سے ٹریننگ میں جانا پڑا۔ میرا دل نہیں لگتا تھا اور گھر یاد آتا تھا، اور گھر

سے زیادہ گھر والی ۔ بے چاری بڑی محبت کرنے والی شریف عورت ہے۔ میں نے ٹریننگ میں ساتھیوں سے مشورہ کیا کہ اس فوج سے جان چھوٹنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے؟ میرے ایک ساتھی نے بتایا کہ اگر افسر اَن فٹ (unfit) کر دے تو کام آسان ہے۔ میں نے سوچا کہ یہ بہت آسان ہے۔ میں نے پاگل پن کا بہانہ کیا۔ بہکی بہکی باتیں کرتا۔ کبھی ہنستا تو ہنستا رہتا۔ کبھی چیختا تو چیختا رہتا۔ مجھے اسپتال میں بھرتی کیا گیا اور میڈیکل چیک اپ ہوا۔ ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ یہ بہانہ ہے۔ مجھے افسر نے بہت گالیاں دیں اور سخت سزا کی دھمکی دی۔ ناچار پھر ٹریننگ شروع ہو گئی۔ ایک روز پریڈ میں صبح کے وقت جیسے ہی افسر آئے، میں نے رائفل کھڑی کی اور تمباکو کی پڑیا ہتھیلی پر ڈال کر اس میں چونا ملانا شروع کیا۔ جیسے ہی افسر سامنے آیا، میں نے دوسرے ہاتھ سے سلوٹ ماری اور جے ہند بولا۔ میرے ہاتھ میں تمباکو کو دیکھ کر اس نے پوچھا: یہ کیا ہے؟ میں نے ہاتھ آگے کرکے کہا: سر! یہ تمباکو ہے، لو آپ بھی کھالو۔ وہ دھمکا کر بولے: نالائق! تیرا بیلٹ نمبر کیا ہے؟ میں نے نمبر بتا دیا۔ دوپہر کے بعد انھوں نے مجھے دفتر میں بلا لیا اور مجھ سے کہا: جب جنگ میں دشمن کے سامنے ہو تو تمباکو کھائے گا یا گولی چلائے گا؟ میں نے عرض کیا: سر! تمباکو کو کھا کر گولی چلانے میں تو مزہ ہی آ جائے گا۔ وہ بہت غصہ ہوئے۔ میری فائل نکالی اور اس پر لال قلم سے ان فٹ (unfit) لکھ دیا۔ میں نے جے ہند کہہ کر خوشی سے سلام کیا اور رات کو ہی گاڑی میں بیٹھ کر دلی آ گیا۔

میرے پھوپھا کو

معلوم ہوا تو انھوں نے گھر فون کر دیا کہ بھگوڑا، غدار فوج سے جان بچا کر بھاگ آیا ہے۔ میری بیوی مجھ سے بات نہیں کرتی تھی کہ تو غدار، بھگوڑا ہے۔ میں نے سمجھایا کہ بھاگیہ وان! (خوش قسمت) اگر وہ جنگ میں بھیج دیتے تو تو ودھوا (بیوہ) ہو جاتی۔ اب موج سے ساتھ رہیں گے۔ بڑی مشکل سے اس کی سمجھ میں آیا اور وہ راضی ہو گئی۔ میں نے ماں کو بھی بہت سمجھایا، کچھ روز یار دوستوں میں آوارہ پھر کر اپنے بابا کے ڈر سے پراپرٹی ڈیلنگ کا کاروبار شروع کر دیا۔ میری دوستی کچھ غلط لوگوں سے ہو گئی۔ جھگڑے کی زمین خریدی۔ مار پیٹ کر، دھمکا کر قبضہ کیا اور بیچ دی۔ نہ جانے کتنے لوگوں کو ستایا۔ کتنوں کا مال مارا۔ مار دھاڑ اور پراپرٹی کے ۱۹ مقدمے میرے ذمے لگ گئے۔ میں جیل چلا گیا، کسی طرح ضمانت ہوئی۔ میں پہلے جیل سے بہت ڈرتا تھا۔ ڈھائی مہینے کی جیل سے اور بھی دہشت بڑھ گئی۔

دو باتیں مجھ میں پہلے سے ہی مسلمانوں جیسی تھیں۔ جب ہوش سنبھالا، کسی مورتی، کسی دیوی کی پوجا نہیں کی۔ اور دوسری یہ کہ نجف گڑھ سے آگے ایک جگہ سؤر کے گوشت کی دکانیں تھیں، مگر جوانی کے دنوں میں مرغا وغیرہ کھانے کے باوجود اول تو اس راستے سے گزرنا مشکل تھا، اگر جلدی میں گزر جاتا تو سانس روک کر نیچی نگاہ کر کے گزرتا۔ سؤر کے گوشت کو دیکھتے ہی مجھے الٹی سی آتی تھی۔ جیل سے ضمانت پر واپس آیا تو ، میری ماں نے جو بہت دھارمک (مذہبی) ہیں

ہر شکر وار (جمعہ) برت (روزہ) رکھتی ہیں، مجھ سے کہا کہ تو ناستک (ملحد) ہے۔ دیوتاؤں کو مانتا نہیں، بلکہ ان کا انادر (بے ادبی) کرتا ہے، اس لیے تیرے اوپر اتنی آفت ہے۔ مجھے ایک ہنومان کی مورتی اور ہنومان چالیسا دیا کہ اس کا جاپ (ورد) کر۔ میں اندر کمرے میں ماں کی ضد اور کچھ ڈر کی وجہ سے روز ہنومان چالیسا کا جاپ ورد) کرتا رہا۔ مقدمے کی آخری تاریخ آئی۔ ایک عورت کی گواہی تھی۔ میں نے صبح) تڑکے اٹھ کر ہنومان چالیسا کا جاپ (ورد) کیا اور پرارتھنا (دعا) کی، حالانکہ دل میں وشواس (یقین) یہی تھا کہ یہ بے جان مورتی ہے اس میں کیا رکھا ہے۔ ڈھل مل یقین کے ساتھ یا شاید لالچ میں دیر تک میں نے جاپ (ورد) کیا اور پرارتھنا (دعا) کی کہ گواہی ٹوٹ جائے۔ عدالت گیا تو اس عورت نے ایسی ڈٹ کر گواہی دی کہ جج سمجھ گیا کہ بات سچ ہے۔ مجھے غصہ آگیا۔ یہ خیال بھی نہ رہا کہ عدالت ہے۔ میں نے غصے میں اس عورت سے کہا کہ تجھے باہر نہیں نکلنا ہے کیا؟ جج نے سن لیا اور برہم ہوا اور ضمانت کینسل کرکے جیل بھیجنے کا حکم کر دیا۔ دو مہینے پھر جیل میں رہا۔ باباجی نے ہائی کورٹ سے ضمانت کرائی۔ جیل سے گھر آیا تو پہلے کمرہ بند کرکے ہنومان کی مورتی پر جوتا گیلا کر کے بجایا۔ ہنومان چالیسا کو جلایا اور خوب گالیاں دیں۔ ماں نے جوتے کی آواز سنی تو باہر سے بہت چیخیں۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ میں اپنی بیوی کو مار رہا ہوں، مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ وہ باہر ہے تو ان کی جان میں جان آئی۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ روز روز مقدموں کی تاریخوں

سے میں کتنا پریشان تھا۔ ہمارے علاقے میں ایک ملاجی پھلوں کی ٹھیلی لگاتے تھے۔ میں نے ان سے بات کی کہ کوئی تعویذ والا بتاؤ۔ میں بہت پریشان ہوں۔ انھوں نے کہا کہ کسی تعویذ والے کو نہ تو میں جانتا ہوں نہ مجھے اس پر اعتقاد ہے۔ ہاں، تمھیں ایک چیز بتاتا ہوں، روزانہ سو بار صلی اللہ علیہ وسلم پڑھ لیا کرو۔ میں نے کہا: بہت اچھا۔ میں پریشان تھا ہی، اس لیے میں نے صبح شام پانچ پانچ سو بار پڑھا۔ اصل میں مالک کو مجھ پر دیا (رحم) آ رہی تھی۔ پہلی ہی تاریخ میں میں بری ہو گیا۔ ایک سال میں گیارہ مقدمے حق میں فیصل ہوئے۔ میں ملاجی کے پاس آنے جانے لگا، اور ان سے کہا کہ اور کچھ بتاؤ، تاکہ سارے مقدموں سے میری جان بچے۔ انھوں نے خود کچھ بتانے کے بجائے مجھے ہندی زبان میں ایک کتاب ''مرنے کے بعد کیا ہوگا؟'' دی۔ میں نے اس کو غور سے پڑھا۔ دوزخ کی سزاؤں کو پڑھ کر میرے دل میں ڈر بیٹھ گیا۔ رات کو ڈراؤنے خواب بھی دکھائی دیتے۔ مجھے بار بار خیال آتا کہ میں نے کتنے لوگوں کی زمینیں دبائیں، کتنے لوگوں کو مارا، میرا اب کیا ہوگا؟ مجھے اس کتاب نے بے چین کر دیا۔ مقدموں سے زیادہ رات دن موت اور دوزخ کا خوف سوار رہتا۔ میں سوچتا اس سنسار (دنیا) کی عدالت کے انیس مقدموں سے زندگی خراب ہے تو اس مالک کے سامنے ان گنت مقدموں سے کیسے چھٹکارا ملے گا؟ میں نے ملاجی سے مشورہ کیا۔ انھوں نے مسلمان ہو جانے کو کہا۔ میں نے اسلام کے بارے میں کسی کتاب کے لیے کہا تو انھوں نے ''اسلام کیا ہے؟'' لا کر دی۔ میری سمجھ میں

اسلام آ گیا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ میرا فوج میں دل کیوں نہیں لگا۔ اگر میں فوج میں رہتا تو یہ ظلم، مار پیٹ نہ کرتا، اور مرنے کا خیال بھی نہ آتا۔ میرے مالک نے میری ہدایت کے لیے مجھے فوج سے بھگا دیا اور الٹ پلٹ کام کرائے۔

اسلام قبول کرنے کے لیے میں امام بخاری کے پاس جامع مسجد دہلی گیا۔ پہلے تو ان تک پہنچنا ہی مشکل ہے۔ میں کسی طرح ترکیب سے پہنچ گیا۔ امام صاحب نے کہا: اپنے یہاں کے ذمے دار لوگوں کو لے کر آنا، جو تمھیں جانتے ہوں۔ میں دو چار روز کی کوشش سے دو مسلمانوں کو لے کر گیا تو وہ کہنے لگے: شناختی کارڈ لاؤ۔ میں نے کہا: آپ نے پہلے کیوں نہیں بتایا؟ بار بار کیوں پریشان کرتے ہیں! وہ ناراض ہو گئے اور بولے: بات کرنے کی تمیز نہیں۔ میں نے کہا: تمھیں تمیز نہیں، مجھے تو ہے اور میں چلا آیا۔

اس کے بعد ایک صاحب نے دہلی کی فتح پوری مسجد جانے کو کہا۔ میں وہاں پہنچا تو مفتی صاحب نے کہا کہ مسلمان ہونے کے بعد تمہارا نکاح ختم ہو جائے گا۔ تمھیں اپنی بیوی چھوڑنا پڑے گی۔ میں نے کہا: وہ 25 سال سے میرے ساتھ رہ رہی ہے، ایسی بھلی عورت ہے کہ آج تک مجھے اس سے شکایت نہیں ہوئی، میں اسے کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟ انھوں نے کہا: پھر تمھیں کلمہ نہیں پڑھوایا جا سکتا اور نہ

تم مسلمان ہو سکتے ہو۔ وہاں سے مایوس ہو کر میں نے تلاش جاری رکھی۔ ایک صاحب نے مجھے ایک مزار پر بھیج دیا۔ وہاں ایک میاں جی لمبے لمبے بال، ڈھیر ساری مالائیں گلے میں ڈالے، ہرے رنگ کا لمبا کرتا اور بہت اونچی ٹوپی پہنے ملے۔ میں ایک جاننے والے کو وہاں لے کر گیا تھا۔ انھوں نے کہا کہ میں تمھیں کلمہ پڑھواتا ہوں۔ میرے قریب بیٹھو۔ گھٹنوں سے گھٹنے ملا کر ادب سے بٹھایا۔ اپنے داہنے ہاتھ میں میرا بایاں انگوٹھا اور بائیں ہاتھ میں دایاں انگوٹھا لے لیا اور بولے: مرید ہونے کی نیت کرو۔ اور میرے پیروں پر ادب سے نگاہ رکھو۔ مجھے بچپن کے کھیل کا دھیان آ گیا۔ ہم بچے ایک دوسرے کو اسی طرح گھمایا کرتے تھے۔ مجھے ہنسی آ گئی۔ وہ غرائے کہ ہنس رہا ہے۔ میں نے کہا: مجھے بچپن کا ایک کھیل یاد آ گیا ہے۔ اگر بچوں کی طرح آپ کو بھی سر کے اوپر گھما کر پھینک دوں تو؟ انھوں نے پھر دھمکایا۔ نہ جانے کیا کیا کہلوایا: قادریہ، غوثیہ وغیرہ وغیرہ۔ پھر بولے: میرے پاؤں کے بیچ سر رکھو۔ میں نے منع کیا تو دھمکا کر بولے: مرید ہو کر بات نہیں مانتا۔ میں نے سر ٹیکا اور جلدی سے اٹھا لیا۔ وہ دوبارہ بولے: ادب سے قدموں میں سر رکھو اور یہ سوچو کہ مجھ میں خدا کا نور ہے۔ جس طرح خدا کو سجدہ کرتے ہیں، اسی طرح کرو۔ مجھے غصہ آ گیا۔ میں اسلام کے بارے میں بہت کچھ پڑھ لیا تھا۔ میں نے اس نالائق سے کہا کہ اگر میں تجھے اٹھا کر دے ماروں تو خدا تو میں ہوں گا، اس لیے کہ جو طاقت ور ہوتا ہے، وہ خدا ہوتا ہے۔ میں نے دو چار گالیاں دیں اور چلا

آیا۔

مجھے مسلمان ہونے کی بے چینی تھی اور موت کا کھٹکا تھا۔ میں نے ایک ملا جی سے ذکر کیا، وہ مجھے ایک قاضی جی کے یہاں لے گئے۔ قاضی جی نے کہا: مسلمان تو ہم تمھیں کر لیں لے، مگر دو ہزار روپے فیس ہو گی۔ میں نے کہا مجھے مسلمانوں کا اسلام نہیں چاہیے، میں تو محمد صاحب والا اسلام قبول کرنا چاہتا ہوں۔ اگر محمد صاحب نے کسی کو مسلمان کرنے کے لیے پیسے لیے ہوں تو آپ بھی لے لیں۔ جب انھوں نے کبھی ایک پیسہ نہیں لیا تو آپ کیسے پیسے لیتے ہیں؟ دو ہزار کی بات بڑی نہیں تھی، مگر مجھے وشواس (یقین) نہیں ہوا۔ میں وہاں سے بھی واپس آ گیا۔

اگلے روز ایک مسجد کے سامنے سے جا رہا تھا تو ذرا صاف ستھرے کپڑوں میں ایک مولوی صاحب مسجد کی طرف جاتے دکھائی دیے۔ بعد میں ان سے تعارف ہوا۔ ان کا نام مولوی عبد السمیع قاسمی تھا۔ میں نے ان سے کہا: مجھے اسلام کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنی ہیں۔ پہلے تو وہ ٹھٹکے، بعد میں وہ تیار ہو گئے۔ میں نے ان سے کہا کہ اسلام کے بارے میں میں نے 50 سے زیادہ کتابیں پڑھی ہیں۔ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم آخری حج کو گئے تو ان کے ساتھ سوا لاکھ ساتھی تھے۔ آپ نے سب کو اکٹھا کر کے ان سے سوال کیا کہ میں نے اسلام تم تک

پہنچا دیا؟ سب نے کہا کہ بالکل پہنچا دیا۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اب جو یہاں سے غائب ہیں، یہاں موجود نہیں ہیں، یہ اسلام تمھیں ان تک پہنچانا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جن مسلمانوں تک اسلام پہنچ چکا ہے وہ دوسرے انسانوں تک اسلام پہنچائیں؟ مولوی قاسمی نے کہا کہ ہاں ضرور پہنچانا چاہیے۔ میں نے کہا کہ مولوی صاحب! آپ مجھے ایسے دو چار لوگوں سے ملوائیں، جو دین کو دوسروں تک پہنچانے کا کام کر رہے ہوں۔ مولوی صاحب بولے: ایسے لوگ بھی ہیں۔ میں نے کہا کہ یہ کام تو سارے مسلمانوں کو کرنا چاہیے، مگر مجھے ایک مسلمان بھی نہیں ملا۔ میں خود اسلام لانا چاہتا ہوں، چار بڑے مولویوں نے مجھے دھکے دیے۔ مولوی قاسمی نے کہا کہ میں آپ کو ایک صاحب کا پتا بتاتا ہوں۔ آپ پھلت (ضلع مظفر نگر، یوپی) چلے جاؤ۔ میں نے ان کا پورا پتا اور فون نمبر مانگا۔ انھوں نے کہا: فون نمبر معلوم کرکے دیتا ہوں۔ ناگلوئی دہلی) کے کسی مولوی صاحب کو انھوں نے فون کیا، اور مولوی محمد کلیم صدیقی صاحب) کا فون نمبر مل گیا۔ انھوں نے فون ملایا۔ مولوی صاحب دلی سے پھلت جا رہے تھے۔ مولوی قاسمی نے کہا کہ ہمارے ایک چودھری صاحب اسلام قبول کرنا چاہتے ہیں۔

مولوی صاحب نے کہا: ان کو آج شام تک پھلت بھیج دیں۔ میں نے کہا: فون پر مجھ سے بات کروا دو۔ انھوں نے مجھے فون دے دیا۔ میں نے بات کی۔ مولوی صاحب نے کہا: آپ جب بھی آئیں، ہمارے اتھتی (مہمان) بلکہ آدرنیہ اتھتی (معزز مہمان) ہوں گے۔ میں سیوا (خدمت) کے لیے ہر سے

وقت) حاضر ہوں۔ میں نے کہا: بہت بہت شکریہ، مجھے بڑا عجیب لگا۔ ایک آدمی سو) ڈیڑھ سو کلو میٹر دور میرا ایسا سواگت (استقبال) کر رہا ہے۔

مجھے تو ایک ایک منٹ مشکل ہو رہا تھا۔ میں اسی روز 27 ستمبر 2004ء کو دن چھپنے تک پھلت پہنچ گیا۔ مولوی کلیم صاحب نماز پڑھنے گئے تھے۔ میں بیٹھک میں کرسی پر بیٹھ لیا۔ مولوی صاحب آئے تو میں نے ملاقات کی۔ مولوی صاحب بہت خوشی سے ملے۔ ان کے یہاں باہر کے کچھ مہمان آئے ہوئے تھے، جو مکان کے اوپر والے کمرے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر میں مولوی صاحب نے مجھے بھی وہیں بلا لیا۔ مجھ سے پیار سے سوال کیا: میرے لیے سیوا (خدمت) بتایئے۔ میں نے کہا: میں مسلمان ہونا چاہتا ہوں۔ مولوی صاحب نے کہا: بہت مبارک ہو، جو سانس اندر چلا گیا، اس کے باہر آنے کا اطمینان نہیں اور جو باہر گیا اس کے اندر جانے کا بھروسا نہیں۔ اصل میں تو ایمان دل کے وشواس (یقین) کا نام ہے۔ آپ نے ارادہ کر لیا، دل سے طے کر لیا کہ مجھے مسلمان ہونا ہے تو یہ کافی ہے، مگر اس سنسار (دنیا) میں ہم لوگ دل کے حال کو جان نہیں سکتے، اس لیے زبان سے بھی کلمہ پڑھنا پڑتا ہے۔ آپ جلدی سے دو لائن جس کو کلمہ کہتے ہیں، پڑھ لیجیے۔ میں نے کہا: مجھے ایک بات پہلے بتایئے کہ مسلمان ہو کر مجھے بیوی کو چھوڑنا پڑے گا۔ مولوی صاحب نے کہا: واہ صاحب! آپ کیسے مسلمان ہوں گے، جو آپ اپنے جیون ساتھی (شریک حیات) کو چھوڑیں گے۔ آپ چھوڑنے کی بات کرتے ہیں۔ اگر

آپ سچے دل سے مسلمان ہیں تو آپ کو اپنی بیوی کو بھی سورگ (جنت) لے جانے کی کوشش کرنی ہو گی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ چلو، یہ اچھے آدمی ملے ہیں۔ مولوی صاحب نے مجھے کلمہ پڑھایا۔ ہندی میں ارتھ (مطلب) کہلوایا اور بتایا کہ تین باتوں کا آپ کو خیال کرنا ہے۔ ایک یہ کہ ایمان اس مالک کے لیے قبول کیا ہے، جو دلوں کے بھید جانتا ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ میں مسلمان ہوں۔ لوگ مجھے نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں، مگر میرا مالک جانتا ہے کہ میں مسلمان ہوں یا نہیں اور اسلام وہ ہے، جو دلوں کے بھید جاننے والے کو قبول ہو جائے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اس دنیا میں ایمان کی ضرورت ہے، اور وہ آدمی جو ایک مالک کو چھوڑ کر دوسرے کے آگے جھکے، کتے سے بھی زیادہ گزرا ہے، کیونکہ کتا بھی بھوکا پیاسا اپنے مالک کے در پر پڑا رہتا ہے۔ وہ آدمی کتے سے بھی بدتر ہے، جو در در جھکے، مگر اصل ایمان کی ضرورت موت کے بعد پڑے گی۔ جہاں ہمیشہ رہنا ہے تو موت تک اس ایمان کو بچا کر لے جانا ہے۔

تیسری سب سے ضروری بات یہ ہے کہ یہ ایمان ہماری آپ کی ملکیت نہیں ہے۔ بلکہ ہمارے پاس ہر اس انسان کی امانت ہے، جس تک ہم اسے پہنچا سکتے ہیں۔ اب اگر مالک نے ہمیں راستہ دکھا دیا ہے تو ہمیں سارے خاندان، دوستوں اور جاننے والوں تک اس سچائی کو پہنچانے کی ذمہ داری ادا کرنی ہے۔ میں نے کہا: مولوی

صاحب! آپ سچ کہتے ہیں۔ میں اصل میں خوف اور لالچ سے مسلمان ہو رہا ہوں۔ مرنے کے بعد کیا ہوگا''، ''دوزخ کا کھٹکا'' اور ''جنت کی کنجی'' کتابوں میں میں نے'' جو کچھ پڑھا، فلم کی طرح میرے دل و دماغ میں گھومتا رہتا ہے۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ تو نے اتنے ظلم کیے ہیں، موت کے بعد کیا ہوگا۔ اب میں آپ کے سامنے عہد کرتا ہوں کہ اسلام میں مالک نے جن کاموں سے روکا ہے، پوری جان لگا کر ان کاموں سے بچنے کی کوشش کروں گا۔ شاید میرے مالک کے سامنے جانے کا میرا منہ ہو جائے۔ میں نے مولوی صاحب کو بتایا کہ یہ بھی اچھا ہوا کہ میں نے اسلام کو پڑھ کر مسلمان ہونے کا فیصلہ کیا، مسلمانوں کو دیکھ کر نہیں۔ آج کے مسلمانوں کو دیکھ کر کون مسلمان ہو سکتا ہے؟ میرے چاروں طرف بہت سے مسلمان رہتے ہیں۔ ہمارا ایک کرائے دار ہے، جس کا نام سید غلام حیدر ہے۔ نماز بھی نہیں پڑھتا۔ میں نے اس سے ایک بار کہا: تم ہر مہینے میرے ماں باپ کو کرایہ دیتے ہو۔ اگر تم ان سے مسلمان ہونے کو کہو تو کیا خبر وہ مسلمان ہو جائیں۔ اور اگر وہ مسلمان ہو جائیں تو پورا خاندان مسلمان ہو جائے گا۔ وہ بولے: تمہارے بابا علاقے کے پردھان ہیں۔ اگر میں نے ان سے کہہ دیا تو وہ ہمارا جینا مشکل کر دیں گے۔ میں نے کہا: تم اللہ سے نہیں ڈرتے، میرے بابا سے ڈرتے ہو۔ اس لیے یہ کعبہ کا فوٹو ہٹا کر میرے بابا کا فوٹو لگاؤ اور روزانہ اس کے نام کا جاپ (ورد) کر کے میرے بابا کو ڈنڈوت کرو (سر جھکاؤ)۔ میرے بابا نے کسی دن دیکھ لیا، تو وہ تمہارا کرایہ معاف کر

دیں گے۔ تمہارے مزے آجائیں گے۔ میں نے اس سے کہا کہ تم اپنے آپ کو سید بتاتے ہو، اللہ کے یہاں تمھیں بھی جانا ہے۔ میں مالک کے سامنے ہی لٹھ ماروں گا کہ انھوں نے سید ہو کر ایک دن بھی ہمیں ایمان لانے کو نہیں کہا۔

میں نے مولوی صاحب کو اپنی روداد سنائی اور چار بڑے مولویوں کے پاس سے واپس آنے کی بات بھی سنائی۔ مولوی صاحب نے مجھے بہت پیار سے سمجھایا اور مجھے تسلی دی۔ میرے دو لڑکے اور دو لڑکیاں ہیں۔ بڑی لڑکی کی شادی میں نے کر دی ہے۔ ہمارا سماج اصل میں پٹھانوں سے بہت ملتا جلتا ہے۔ بہت شرم وحیا ہے۔ مردوں کا باہر رہنا اور عورتوں کا اندر رہنا، یہ ہمارے یہاں کا دستور ہے۔ میں اپنی ماں کے سامنے اپنی بیوی سے آج تک بات نہیں کر سکتا۔ ماں بیٹھی ہو گی تو میں اس کو ہی بتاؤں گا۔ وہ کبھی کہتی بھی ہے کہ یہ تیری پانچ ہاتھ کی بہو ہے تو اس سے کیوں نہیں کہتا۔ میں کہتا ہوں: ماں، جب تو مر جائے گی، تب اس سے کہوں گا۔ ہمارے یہاں ابھی تک لڑکی کو پڑھانے کا رواج نہیں ہے۔ پورے خاندان میں، میں نے بغاوت کرکے بڑی لڑکی کو پڑھایا۔ ہائی اسکول پاس کیا تو اس نے مجھ سے کہا: پتاجی! (ابوجی) مجھے دو ہزار روپے چاہییں۔ میں نے کہا: بیٹی! دو ہزار کیا کرو گی؟ اس نے کہا: ایک ہزار کا موبائل مل رہا ہے۔ میں نے اس

سے کہا: موبائل کا کیا کرو گی؟ اس نے کہا کہ بات کیا کروں گی۔ میں نے پوچھا اور ایک ہزار کا کیا کرو گی؟ اس نے کہا: جینز لاؤں گی۔ میں نے اس سے کہا کہ دو ہزار کی جگہ پانچ ہزار دوں گا، مگر 15 دن کے بعد۔ میں نے لڑکے والوں کو بلوایا، جہاں اس کا رشتہ طے کر رکھا تھا اور کہا: آٹھ دن میں پھیرے پھروالو تو لڑکی تمہاری، ورنہ میں کسی دوسری جگہ شادی کر دوں گا۔ وہ تیار ہو گئے۔ بابا سے کہہ کر پنڈت بلوایا اور پھیرے پھروائے۔ میں نے لڑکی کو ڈھائی ہزار روپے دیے اور کہا کہ آدھے تو یہ لو اور آدھے اس دن دوں گا جس روز گود میں بٹھا کر رخصت کرنے کے لیے تجھے گاڑی میں ٹیکوں بٹھاؤں) گا۔ آج ہائی اسکول کر کے موبائل اور جینز مانگ رہی ہے۔ اگر انٹر کر لیا تو) کسی ایرے غیرے کا ہاتھ پکڑ کر گھر لے آئے گی کہ پتا جی (ابو جی) یہ تمہارا داماد ہے۔ میں نے عہد کر لیا کہ لڑکی کو پانچویں سے آگے ہر گز نہیں پڑھانا ہے۔ یہ بات میں نے مولوی صاحب سے بھی کہی تھی۔ انھوں نے کہا کہ یہ سوچ ٹھیک نہیں ہے۔ اب تم مسلمان ہو گئے ہو۔ تم کو اسلام کی ہر بات ماننا ہو گی۔ اسلام نے تعلیم حاصل کرنے کو فرض کہا ہے۔ اور لڑکا لڑکی دونوں کو پڑھانا ضروری ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اسلامی ماحول اور تربیت میں تعلیم ہونی چاہیے۔ میں نے وعدہ کر لیا: اب میرا پکا ارادہ ہے کہ اپنے تینوں بچوں کو اسلامی تعلیم کی جو سب سے بڑی ڈگری ہو گی، اس تک پڑھاؤں گا۔ آگے مالک کے ہاتھ میں ہے۔ اب میں نے بالکل اسلامی اصولوں پر زندگی گزارنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں شراب

کا بہت عادی تھا۔ جب میں ہندو تھا اور لوگوں کو اپنے ہاتھوں سے پلائی، مگر خود نہیں پی، مگر جب سے میں نے کلمہ پڑھا ہے، اب زندگی بھر نہ پینی ہے اور نہ پلانی ہے۔ اور نہ پینے والوں کے پاس بیٹھنا ہے۔ اب تو مجھے شراب کا خیال بھی نہیں آتا۔ اور مالک کا کرم ہے کہ کسی دوست نے بھی میرے سامنے نہیں پی، حالانکہ کسی کو معلوم بھی نہیں ہے کہ میں نے چھوڑ دی ہے، یا اسلام قبول کر لیا ہے۔

میری بیوی میری ماں کی طرح بہت کٹر دھارمک (مذہبی) ہے۔ جب مولوی صاحب مجھ سے کہہ رہے تھے کہ اس کو اپنے ساتھ جنت میں لے جانا ہے تو میں نے بتایا کہ وہ تو بہت کٹر ہندو ہے۔ جس روز گوشت کھا کر آتا ہوں، گھر میں گھسنا مشکل کر دیتی ہے۔ نہ جانے اس کو کیسے خوشبو آ جاتی ہے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ کٹر ہندو ہی سچی مسلمان ہوتی ہے۔ انسان اپنے مالک کو خوش کرنے کے لیے ہی دھرم (مذہب) کی پابندی کرتا ہے۔ اگر آپ اس کو سمجھا دیں کہ یہ راستہ غلط ہے اور سچا راستہ اسلام ہے تو اسلام پر بھی وہ بہت سختی سے عمل کرے گی۔ میں نے پھلت میں مولوی صاحب کے بھانجے کے موبائل سے اس کو بتا دیا کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں تو وہ بہت ناراض ہوئی۔ میں نے یہ کہہ کر بات بند کر دی کہ میں دوسرے کے موبائل سے فون کر رہا ہوں۔

اگلے روز صبح کو میرے مقدمے کی تاریخ تھی۔ مجھے صبح وکیل سے بھی ملنا تھا، اس لیے رات کو مولوی صاحب نے اپنی گاڑی سے کھتولی پہنچا دیا۔ رات کو بارہ بج کر 45 منٹ پر گھر پہنچا۔ مہارانی جی غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔ دھکے دینے لگی، بار بار گالیاں دیں۔ 25 سال کا ادب بھول گئی۔ کہنے لگی کہ تو دھرم بھرشٹ (مذہب برباد) کر کے آیا ہے۔ تو میرا کیا لگتا ہے، بھاگ جا، نہ جانے کیا کیا کہا۔ صبح تک لڑائی ہوتی رہی۔ مولوی صاحب نے بیوی کو دعوت دینے کے لیے آخری ہتھیار کے طور پر ایک پوائنٹ بتا دیا تھا۔ صبح ہونے کو ہوئی تو اس ڈر سے کہ دن نکل آیا تو یہ سب کو بتا دے گی، اس لیے میں نے آخری تیر کے طور پر استعمال کیا۔ میں نے کہا کہ تو اصلی ہندو ہے یا نقلی؟ اس نے کہا کہ اصل ہوں، بالکل اصلی۔ میں نے کہا کہ اگر اصلی ہندو ہے اور میں اسلام کی چتا میں جل رہا ہوں تو تجھے بھی میرے ساتھ ستی ہو جانا چاہیے۔ تیر نشانے پر لگ گیا، وہ چپ ہو گئی۔ دیر تک ہچکیوں سے روتی رہی۔ میں اس کے قریب گیا۔ پیار کیا۔ اور دکھ سکھ اور جیون مرن (زندگی و موت) میں ساتھ دینے کے وعدوں کی دہائی دے کر مسلمان ہونے کے لیے کہا۔ وہ تیار ہو گئی۔ ٹوٹا پھوٹا کلمہ پڑھوایا اور صبح فجر کی نماز ہم دونوں نے ساتھ پڑھی۔ بیوی کے مسلمان ہونے کی اپنے مسلمان ہونے سے زیادہ خوشی ہوئی۔ مجھے مولوی صاحب کی ہر بات سچی لگنے لگی۔ انھوں نے کہا تھا کہ بیوی کو چھوڑنے کی بات کا کیا مطلب؟ اس کو تو جنت میں ساتھ لے جانا ہے۔ ہمارے علاقے میں ایک مولوی صاحب مسجد میں امام ہیں۔ میں

روزانہ رات کو ان کے پاس جاتا ہوں۔ مجھے جماعت میں جانا ہے، مگر مقدموں کی تاریخوں کی وجہ سے ابھی مجبور ہوں۔ میں نے اپنی بڑی لڑکی اور داماد کو بھی ''مرنے کا بعد کیا ہوگا؟'' اور ''آپ کی امانت آپ کی سیوامیں'' پڑھنے کے لیے دی ہے۔
مجھے مسلمانوں سے صرف یہ کہنا ہے کہ یہ دین جب امانت ہے، جیسا کہ مولوی صاحب نے ''آپ کی امانت آپ کی سیوامیں'' کتاب میں لکھا ہے تو پھر اسے سارے سنسار (دنیا) تک پہنچانا چاہیے۔ آج کے دور میں اسلام پہنچانا بہت مشکل ہے۔ میں لاکٹر جاٹ (ہوں۔ جاٹ قوم کی سائیکالوجی اچھی طرح جانتا ہوں۔ جاٹ عموما بہت لالچی ہوتا ہے اور لالچی سے زیادہ ڈرپوک ہوتا ہے، خصوصاً جیل اور سزا سے جتنا ڈرتا ہے، شاید دوسرا نہیں ڈرتا۔ اگر ''مرنے کے بعد کیا ہوگا؟'' اور ''دوزخ کا کھٹکا'' ہندی انوواد ترجمہ) کرکے جاٹوں میں پہنچایا جائے اور قرآن مجید میں جنت و دوزخ کا جو ذکر ہے، (ان کو سنایا جائے تو جاٹ سارے کے سارے مسلمان ہو جائیں گے۔ اس سے زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ جب دین امانت ہے اور مالک کے سامنے حساب دینا ہے تو اس کا بھی حساب ہوگا کہ اس کو پہنچایا یا نہیں، اس لیے دین کو دوسروں تک پہنچانا نہ صرف یہ کہ دوسروں کے لیے ضروری ہے، مرنے کے بعد کے جواب سے بچنے کے لیے خود مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہے۔

چائنا ہی چائنا

پچھلے سال کسی کام سے ایک دن کے لیے لاہور جانا ہوا۔ ایک پرانے دوست سے ملنے کے لیے تھوڑا وقت نکالا اور پہنچ گئے موہنی روڈ۔ وہاں موصوف ایک چھوٹا سا الیکٹرک اسٹور چلاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کے پارٹنر کاروباری دورے پر چائنا گئے ہوئے ہیں۔ ہمیں حیرت ہوئی کہ ایک اسٹور کا سامان چائنا سے لایا جاتا ہے! اس نے یہ بتا کر ہماری حیرت میں اضافہ کر دیا کہ دو تین مہینے میں ایسے چکر لگتے رہتے ہیں اور بہت سارے الیکٹرک آئٹم وہاں سے بہت کم قیمت پر مل جاتے ہیں، جو پھیرے کے اخراجات نکال کر بھی بہت اچھا نفع دے جاتے ہیں اور اب ہم کئی دکانداروں کو ہول سیل میں بھی مال سپلائی کرتے ہیں۔ اگلے ایک سال میں ہمیں کراچی اور اندرونِ سندھ کے بھی کئی اوسط درجے کے کاروباری حضرات کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ لوگ باقاعدگی سے کاروباری دورے پر چینجا رہے ہیں۔ یہ سن کر ہمیں نوے کی دہائی یاد آ گئی، جب ہم سنتے تھے کہ فلاں شخص مہینے دو مہینے میں سنگاپور چکر لگاتا ہے اور وہاں سے گھڑیاں، الیکٹرک آئٹمز مثلاً کیمرے، ٹیپ ریکارڈر وغیرہ لاتا ہے، جو نہ صرف معیار میں اعلیٰ ہوتا تھا بلکہ مقامی مارکیٹ سے کافی کم قیمت پر بھی پڑتا تھا۔ اس وقت یہ پھیرے سنگاپور کے ساتھ بنکاک اور دبئی وغیرہ بھی جاتے

تھے۔

یعنی اب اس فہرست میں چین کا اضافہ ہو گیا ہے۔" ہم نے کہا تو وہ ہنس پڑا۔" اضافہ" کیا مطلب اب تو پھیریے کی فہرست میں چائنا ہی چائنا ہے یا پھر دوسرے نمبر پر "دوبئی.... سنگاپور، بنکاک وغیرہ تو اب پرانی بات ہو گئی۔

شاید یہی وجہ ہے کہ آج انگریزی کے بعد پاکستان میں جس بیرونی زبان کے سیکھنے کا سب سے زیادہ رجحان نظر آ رہا ہے، وہ چینی زبان ہے۔اس کی بڑی وجہ یہی نظر آتی ہے کہ پاکستان میں کئی چینی کمپنیاں سرمایہ کاری کر رہی ہیں، اور چینی زبان جاننے والے نوجوانوں کو چینی کمپنیوں میں ملازمت ملنے کا زیادہ چانس ہوتا ہے،اس کے علاوہ چونکہ چائنا کے مال کے لیے بھی اب مقامی پھیریے اور دکاندار بھی براہ راست چائنا کا رخ کر رہے ہیں، اس لیے کاروبار بھی ایک وجہ بن گیا ہے چینی زبان سیکھنے کا، کیوں کہ چینی دنیا بھر میں رابطے کی بین الاقوامی زبان انگریزی میں عموماً بہت کمزور ہوتے ہیں اور جو کچھ انگریزی جانتے بھی ہیں تو وہ بھی حتی الامکان اپنی زبان کو ہی اولیت دیتے ہیں۔یوں چینیوں کے اس قابل فخر عمل کی وجہ سے جو لوگ اُن سے کاروبار کرنا چاہتے ہیں، اس پر مجبور ہیں کہ بہر طور چینی زبان کی شد بد حاصل کریں۔ چینی زبان سیکھنے کے رجحان میں اضافے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جا رہی ہے کہ اب اعلیٰ تعلیم

حاصل کرنے کے لیے ہمارے نوجوانوں کی فہرست میں یورپ اور امریکا کے ساتھ چین بھی موجود ہے جہاں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا یورپ و امریکہ کے مقابلے میں کہیں سستا بھی پڑتا ہے اور تعلیم کا معیار بھی کسی طرح یورپ کی یونیورسٹیوں سے کم نہیں۔شاید یہی وجوہات ہیں کہ صرف پرائیوٹ سیکٹر میں ہی نہیں بلکہ چینی زبان کی اہمیت کا اعتراف پچھلے چند سالوں میں سرکاری سطح پر بھی ہوا ہے، جس کی مثال 2011ء میں سندھ حکومت کا،2013ء سے تمام اسکولوں میں درجہ ٔ ششم سے چینی زبان کی تعلیم لازمی کرنے کا فیصلہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمارے نظامِ تعلیم کا جو انفرااسٹرکچر اور معیار ہے اور چینی زبان جیسی دنیا کی سب سے مشکل زبان کے اسکول لیول میں سیکھنے کے لیے جو تیاری اور پلاننگ ضروری ہے، اس کی عدم موجودگی کے باعث ہمارے خیال میں یہ فیصلہ عملی صورت اختیار نہیں کر سکتا اور اگر اس پر عمل کر بھی لیا جائے تو سوائے وقت کی بربادی اور سرمائے کے زیاں کے کچھ حاصل نہیں ہو سکتا۔ خیر یہ الگ بحث ہے، بات ہو رہی تھی چین کے دنیا کے ہر میدان میں دمادم کامیابیاں حاصل کرنے کی، جس کی وجہ سے وہ نگاہیں جو اعلیٰ تعلیم کے حصول یا محفوظ سرمایہ کاری کے لیے پہلے یورپ اور امریکا کی طرف اٹھتی تھیں اب چین کی طرف متوجہ ہیں....

اس وقت کا سچ تو یہ ہے کہ چین جو مشرقی ایشیا میں واقع دنیا کی نہایت قدیم تہذیبوں میں سے ایک ہے، ہر طرف چھا رہا ہے۔وہ عالمی کساد بازاری میں سرمایہ

داروں کے لیے امید کی نئی کرن ہے۔ اس نے اپنی تجارتی پالیسیوں اور آسان وزنہ شرائط سے یہ باور کرادیا ہے کہ اس وقت جو چین سے کاروبار کرے، وہ فائدے میں ہے۔

چین 'جس نے ہمیشہ دنیا کی ترقی میں اپنا بھرپور حصہ ڈالا (صرف چار بڑی ایجادات یعنی کاغذ، قطب نما، بارود اور چھاپہ خانہکو دیکھ لیجیے،اور فیصلہ کر لیجیے کہ ان ایجادات کا انسان کی ترقی میں کتنا بڑا حصہ ہے !) آج بھی دنیا میں سب سے زیادہ تیزی سے ترقی کرنے والا ملک ہے۔ معیشت سے لے کر دفاع تک ،صنعت سے لے کر کمپیوٹر ٹیکنالوجی تک اور خلا بازی سے لے کر سماجی، سائنسی، زرعی شعبوں میں انقلاب آفریں ترقی کی بدولت روئے زمین پر ہر جگہ چین کا ڈنکا بج رہا ہے۔ ماہرین چین کی اس برق رفتار ترقی پر انگشت بدنداں ہیں اور یہ پیش گوئیاں کر رہے ہیں کہ مستقبل کا سپر پاور مغرب سے نہیں بلکہ مشرق سے ہو گا جو کوئی اور نہیں صرف چین ہے۔ ہمارے خیال میں چین کی اس بے مثال ترقی کا راز چینیوں کی ان تھک محنت، حب الوطنی اور دیانت دارانہ قیادت میں مضمر ہے۔ چینی دنیا بھر میں اپنی انتھک محنت کے لیے مشہور ہیں۔ وہ کسی بھی کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں تو شفٹوں میں کام کو اس طرح سے جاری رکھتے ہیں کہ ایک منٹ کے لئے بھی کام میں رخنہ نہیں پڑتا۔ گزشتہ سال سوشل میڈیا پر چین کے حوالے سے ایک ویڈیو بہت پاپولر ہوئی ، جس میں دکھایا گیا تھا کہ بیجنگ سے باہر

کسی شہر میں چینیوں نے ایک پندرہ منزلہ ہوٹل کی عمارت صرف چھ دن میں تعمیر کردی۔اسی طرح 2008ء میں چین میں منعقد ہونے والے اولمپک میں بھی چینیوں نے اپنی اس مستعدی اور کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا، جب انہوں نے صرف تین ماہ میں اولمپک اسٹیڈیم تیار کر لیا تھا۔چین کی یہ معرکتہ الآرا کارکردگی انٹرنیشنل میڈیا پر کئی روز چھائی رہی۔

چین کی دنیا بھر کی مارکیٹوں میں گرفت کا اندازہ اس سے کیجیے کہ پاکستان جیسے ترقی پذیر ممالک کی مارکیٹ پر ہی چائنا چھایا ہوا نہیں ہے، جہاں آپ کو کراچی اور لاہور جیسے بڑے شہروں کی مارکیٹوں یں پھیری والوں کی "چائنا ہے چائنا" کی صدائیں سنائی دیتی ہیں، بلکہ یورپ اور امریکا (جو ہر میدان میں چین کا سب سے بڑا حریف سمجھا جاتا ہے) یں بھی آپ کو 70 فیصد اشیاء چین کی نظر آئیں گی جو مزے کی بات یہ ہے کہ ان ترقی یافتہ ممالک کے معیار کی بھی ہوتی ہیں، ورنہ ہمارے ہاں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ چائنا ہے تو معیار دو نمبر ہوگا، جب ہی اتنا سستا ہے، لیکن ہر جگہ ایسا نہیں ہے کیوں کہ چائنا ہر ملک کی ڈیمانڈ اور ریٹ کے مطابق اسی معیار کا مال بنا کر دیتا ہے۔

قصہ مختصر آپ نے بچپن میں وہ مشہور کہانی پڑھی ہوگی جس میں بتایا گیا تھا کہ زمین کے نیچے دفن خزانے کسی ایک جگہ نہیں رہتے، یہ چلتے رہتے ہیں اور

آواز دیتے رہتے ہیں کہ ہم یہاں ہیں، جو ان کی آواز پر دھیان دیتا ہے، وہ انہیں حاصل کرلیتا ہے۔شاید یہی حال زمین کے اوپر موجود خزانوں کا ہے۔ سرمایہ وہاں جاتا ہے جہاں مزید سرمایہ ہوتا ہے، اور چینیوں کی ذہانت، قابلیت، علم اور محنت کی بدولت ساری دنیا کا سرمایہ تیزی سے کھنچ کر چائنا میں آ رہا ہے۔

چین اور پاکستان ایک دوسرے کے دیرینہ دوست ہیں۔ چینی نومنتخب وزیراعظمکا حالیہ دورہ اس دوستی کے رشتے کو اور مضبوط کر گیا ہے۔ چینی وزیر اعظم لی کی چیانگ نے سینٹ میں خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ "ہمیں پاکستان سے دوستی پر فخر بھی ہے، ناز بھی، ہم سونا پھینک سکتے ہیں لیکن پاکستان سے دوستی نہیں چھوڑ سکتے۔" اللہ کرے ایسا ہو، لیکن بہرحال نئے پاکستانی حکمرانوں اور پالیسی سازوں کو چاہیے کہ وہ چین کی دوستی پر تکیہ کرکے ان سے ہمیشہ امداد مانگنے کی بجائے ان کی عقل دنگ کردینے والی اقتصادی، معاشی، دفاعی اور سائنسی ترقی کے بنیادی اسباب پر غور کرکے خود کفالت کا راستہ اختیار کریں، کیوں کہ ریاستی دوستیاں باہمی مفاد سے وابستہ ہوتی ہیں۔پاک چین دوستی میں بھی سب سے بڑا عنصر" دشمن کا دشمن دوست ہوتا ہے "کا آفاقی اصول کارفرما رہا ہے، لیکن جب دشمن سے دشمنی ختم ہوتی ہے تو پھر دشمن کے دشمن سے دوستی بھی نئے مفادات سے مشروط ہوتی ہے۔اور سب کو معلوم ہے کہ چین بھارت دشمنی کی

.برف کئی دہائیوں کے بعد اب پگھلنے لگی ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان افہام و تفہیم
اور مذاکرات کی بات ہو رہی ہے، نئے معاہدے ہو رہے ہیں۔اس کی تازہ مثال ابھی
دس دن پہلے چین کے نو منتخب وزیراعظم لی کی چیانگ کا پاکستان سے پہلے بھارت کا تین
!روزہ دورہ ہے، جو نہایت کامیاب بھی رہا ہے

عالم ربانی کی رحلت

دو جون مغرب کا وقت تھا، جب موبائل پر پیغام آمد کی بیپ ہوئی۔ دیکھا تو کسی انجانے نمبر سے پیغام آیا تھا۔ پیغام کھولا، تو پہلی سطر پڑھتے ہی بے اختیار اک آہ نکل گئی۔ لکھا تھا، عارف باللہ حضرت مولانا شاہ حکیم اختر صاحب انتقال فرما گئے۔ پیغام چونکہ انجانے نمبر سے تھا،اس لیے فوراً اِدھر اُدھر کچھ دوستوں سے رابطہ کیا تو اس دلخراش خبر کی تصدیق ہو گئی۔ تصور میں حضرت کا نورانی اور بچوں کی سی معصومیت لیا چہرہ آگیا۔ ہم نے 2004ء میں پہلی مرتبہ حضرت کی زیارت، گلشن اقبال میں واقع حضرت کی خانقاہ میں اپنے دوست خالد رضا کے وسیلے سے کی۔ اس وقت بھی حکیم صاحب رحمہ اللہ بات نہ فرما سکتے تھے،دراصل آپ پچھلے تیرہ سال سے سخت علیل تھے۔آپ پر مئی 2000ء مے ں فالج کا حملہ ہوا تھا، اس کے بعد سے بات کرنے میں آپ کو شدید تکلیف ہوتی تھی۔

آپ متبحر عالم بھی تھے اور عارف باللہ بھی، داعی الی اللہ بھی تھے اور کامل فن شیخ طریقت بھی۔ آپ کی شخصیت میں بہت سی صفات محمودہ جمع ہو گئی تھیں لیکن ان سب میں سب سے غالب صفت جو تمام صفات محمودہ کی گویا بنیاد ہے، وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید محبت تھی۔ اسی محبت کا

لازمی نتیجہ تھا کہ حدیث پاک کے مصداق پھر آپ کی محبوبیت کے زمزمے بھی چہار عالم میں گونجے۔ نہ صرف برصغیر بلکہ افریقہ، یورپ، امریکا اور کینیڈا کے ہزاروں لوگوں کے دل بھی آپ کی محبت سے معمور تھے۔

مولانا حکیم محمد اختر 1924ء میں ہندوستان کے صوبہ یوپی کے شہر پرتاب گڑھ کے گاؤں اٹھیہہ میں محمد حسین نامی سرکاری ملازم کے گھر میں پیدا ہوئے۔ آپ نے عصری تعلیم طبیہ کالج علی گڑھ سے حاصل کی اور حکمت کی سند حاصل کی۔ آپ شروع سے ہی بزرگوں کی صحبت کی وجہ سے دینی کاموں میں سرگرم رہے اور پھر جوانی میں عالم دین کا کورس مکمل کیا۔ حکیم اختر رحمہ اللہ نے ابتداء میں نامور بزرگ حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی اور مولانا سید بدر علی شاہ رحمہم اللہ سے فیض حاصل کیا، اسی دوران مولانا شاہ محمد احمد پرتاب گڑھی سے خلافت حاصل کی۔ بعد ازاں سترہ برس مولانا شاہ عبدالغنی پھولپوری رحمہ اللہ کی صحبت میں سرائے میر میں رہے، جہاں ان کے مدرسہ میں جوانی میں درسِ نظامی کی تعلیم مکمل کی اور خلافت بھی حاصل کی۔ بعد ازاں ہر دوئی مے ں مولانا شاہ ابرار الحق رحمہ اللہ سے اکتسابِ فیض کیا اور خلافت حاصل کی۔ آپ کو تصوف کے چاروں معروف سلسلوں چشتیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور سہروردیہ سے اجازتِ بیعت حاصل تھی۔ قیام پاکستان کے چند سالوں بعد 1955ء یں آپ پاکستان تشریف لے آئے اور ناظم آباد نمبر 4 میں تقریباً دو دہائیوں تک دینی خدمات سرانجام دیتے

رہے۔ بعد ازاں خانقاہ امدادیہ اشرفیہ گلشن اقبال کراچی میں منتقل ہوئے اور آخری وقت تک وہیں قیام پذیر رہے۔ مولانا نے ایک بڑا دینی ادارہ جامعہ اشرف المدارس کے نام سے سندھ بلوچ سوسائٹی گلستان جوہر میں قائم کیا جس میں 5000 سے زاید مقامی و بیرون ملک سے آئے طلبہ زیر تعلیم ہیں اور کراچی میں اس کی 10 سے زیادہ شاخیں ہیں۔ ان کی مواعظِ حسنہ پر مشتمل چھوٹی بڑی تصانیف کی تعداد150 سے زاید ہے۔ مولانا نے "معارف مثنوی" کے نام سے مثنوی مولانا مرحوم کی شرح لکھی جو پوری دنیا میں شائع ہوئی اور کئی زبانوں میں اس کے تراجم ہوئے، دیگر کتابوں کے بھی اردو، سندھی، عربی، پشتو، بنگلا، برمی، جرمن، فرنچ، انگریزی، روسی اور دیگر کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔

حضرت حکیم اختر صاحب کی دکانِ معرفت سے ہر آنے والے کو دردِ دل کی سوغات بٹتی تھی۔ جو آپ کے دامن سے وابستہ ہوجاتا، اس کی زندگی بدل جاتی۔ جو نگاہیں سرکش ہوتیں، آپ کے مواعظ کی برکت سے جھکنا سیکھ لیتیں، کان غیبت اور لہو ولعب سننے سے بچنے لگتے، شرعی پردے کا اہتمام شروع ہوجاتا۔ غرض آپ کی بیانات کی برکت سے خاندان کے خاندان بدل گئے۔

حضرت مولانا اتحادِ امت کے زبردست داعی تھے۔ تعصب جو آج پاکستان میں خونریزی کی سب سے بڑی وجہ ہے، سے آپ کو سخت بغض تھا۔ تعصب چاہے جس رنگ میں ہو، اس

نے لسانیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو، یا قومیت کے نعرے میں چھپا ہو،اس کی بنیاد علا قائیت ہو یا رنگ و نسل، آپ کے نزدیک امت مسلمہ کو پارہ پارہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ تھا۔آپ کے نزدیک وطن، قوم، نسل اورزبان و تہذیب کی ہر نسبت سے زیادہ اسلام کی نسبت و حمیت اہم تھی۔آپ نے اپنے درد بھرے مواعظ کے ذریعے اسی تعصب جاہلیہ کی بیخ کنی کی اور مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے نام پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے مریدین میں دنیا بھر کے مختلف زبان بولنے والے، ہر رنگ و نسل کے لوگ شامل تھے، جن میں جنوبی افریقہ کے معروف کرکٹر عبداللہ آملہ اور ہاشم آملہ بھی شامل ہیں۔

درحقیقت آپ کا وجود امت مسلمہ کے لیے عموماً اور خصوصاً شہر کراچی کے باسیوں لیے رحمت تھا، اور آپ کا انتقال پر ملال امت کا ایک بہت بڑا اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔

حضرت حکیم صاحب اتحادِ امت کے زبردست داعی تھے۔تعصب سے جو آج پاکستان میں خونریزی کی سب سے بڑی وجہ ہے، آپ کو سخت بغض تھا۔ تعصب چاہے جس رنگ میں ہو، اس نے لسانیت کا لبادہ اوڑھ رکھا ہو، یا قومیت کے نعرے میں چھپا ہو،اس کی بنیاد علا قائیت ہو یا رنگ و نسل، آپ کے نزدیک امت مسلمہ کو پارہ پارہ کرنے کی سب سے بڑی وجہ تھا۔آپ کے نزدیک وطن، قوم، نسل اورزبان وتہذیب کی ہر

نسبت سے زیادہ اسلام کی نسبت و حمیت اہم تھی۔ آپ نے اپنے درد بھرے مواعظ کے ذریعے اسی تعصب جاہلیہ کی بیخ کنی کی اور مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے نام پر جمع ہونے کی دعوت دی۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے مریدین میں دنیا بھر کے مختلف زبان بولنے والے، ہر رنگ و نسل کے لوگ شامل تھے۔

حضرت کی رحلت سے امت ایک شفیق مربی اور عظیم عالم دین و مصلح سے محروم ہو گئی۔ ان کا شمار عالم اسلام کی ان چند ممتاز اور نمایاں دینی و روحانی شخصیات میں ہوتا تھا، جن سے بلا مبالغہ لاکھوں انسانوں نے بلاواسطہ یا بالواسطہ فیض حاصل کیا۔ اس فتنے کے دور میں جب اولیاء اللہ کا وجود بہت بڑی غنیمت ہے، حضرت کی وفات یقیناً امت کا ایک بہت بڑا اور ناقابل تلافی نقصان ہے۔ خصوصاً شہر کراچی کے باسیوں کے سر سے ایک سائبان تھا جو اٹھ گیا۔

مولانا کی نماز جنازہ دوسرے دن پیر کو صبح 9 بجے جامعہ اشرف المدارس گلستان جوہر سندھ بلوچ سوسائٹی میں ادا کی گئی، جس میں صرف کراچی کے ہزاروں معتقدین نے ہی نہیں بلکہ ملک بھر سے راتوں رات آئے سینکڑوں معتقدین نے بھی شرکت کی سعادت حاصل کی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت کو اپنا خصوصی قرب عطا فرمائیں اور تمام مسلمانوں کو صبر جمیل عطا فرمائیں۔

آج ۱۵ جون ہے، حضرت کو رخصت ہوئے تیرہ دن ہوئے، لیکن اب تک یقین نہیں آ رہا

.... کہ گلشن ویران ہو گیااور حضرت یوں چپ چاپ چلے گئے

کیسی بے فیض سے رہ جاتی ہے دل کی بستی
کیسے چپ چاپ چلے جاتے ہیں جانے والے

شیطان اور ابو جہل کے متبعین

آج (8 جون) کا ایکسپریس دیکھا تو یقین جانیں دنگ رہ گیا۔ سرورق پر ایک تصویر شایع ہوئی ہے، جس میں شاہ زیب قتل کیس کے مرکزی ملزمان (جن کا مجرم ہونا اب ثابت ہو گیا ہے) شاہ رخ جتوئی اور سراج تالپور عدالت سے سزائے موت کا فیصلہ سن کر ڈھٹائی سے وکٹری کا نشان بنا رہے ہیں اور تالیاں بجا رہے ہیں۔ یہ کس قسم کا فرعونی ردعمل ہے میں سمجھ نہیں سکا۔ دوبارہ سہ بارہ خبر غور سے پڑھی کہ شاید عدالت نے اس کیس میں ان دونوں کو بے قصور قرار دے کر باعزت بری کر دیا ہے، جس پر وہ فتح یابی کا نشان بنا رہے ہیں لیکن .... مجھے کہنے دیجیے کہ یہ ردعمل انسانی عمل نہیں، کیوں کہ انسان کے مادے میں اگر کا خطا اور بھول کا مادہ ہے تو ندامت کا مادہ بھی ہے۔ خصوصاً پکڑے جانے کے بعد اور سزا سنانے کے بعد تو ندامت اور غم کا اظہار ایک نارمل رویہ ہے۔ اور ندامت کا خاصہ یہ ہے کہ نادم کے خلوص کو پرکھ کر اکثر معافی دے دی جاتی ہے، لیکن ان دونوں انسان نما درندوں کا یہ عمل سراسر شیطانی اور تکبر و نخوت کی انتہا ہے۔ تفاسیر میں لکھا ہے کہ جب شیطان نے اللہ رب العزت کی نافرمانی کی تو اللہ تعالیٰ نے جلال میں اس کے سارے اعزازات چھین لیے، وہ جو معلم الملکوت تھا، اسے راندہ درگاہ کرکے ہمیشہ ہمیش کی مردودیت کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا گیا تو اس نے

بجائے نادم ہو کر رحم طلب کرنے کے اور زیادہ اکڑ فوں دکھائی اور قیامت تک کی مہلت طلب کرکے مختلف دعوے کرنے لگا۔ اس کے برعکس دوسری طرف دیکھیں تو خطا حضرت آدم اور حضرت حوا علیہم السلام سے بھی ہوئی تھی لیکن انہوں نے ندامت کے آنسوؤں کے ایسے دریا بہائے کہ حق ادا کر دیا۔

ہمیں عموماً غصہ بہت کم آتا ہے اور نفرت تو شاید کسی کی بھی دل میں نہیں لیکن ان دونوں مجرموں کی اس اکڑ فوں کے مظاہرے نے مجھے اُن سے نفرت کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ انسان خطا کا پتلا ہے، اس سے بڑی بڑی غلطیاں ہو جاتی ہیں، بڑے بڑے گناہ بھی ہو جاتے ہیں، آدمی ان کی سزائیں بھی پا لیتا ہے اور کبھی بچ بھی جاتا ہے لیکن سزا ملنے پر بجائے نادم ہونے کے یا کم از کم غمگین ہونے کے ایسی خوشی کا اظہار دراصل اس نفسیاتی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے جس میں مبتلا شخص تکبر کی انتہا کو چھو لیتا ہے، وہ بزبانِ حال یہ کہتا ہے کہ دیکھو ہم اگر پیسے اور طاقت کے بل پر کسی کی عزت اچھالیں، کسی کو بے گناہ قتل کر دیں تو یہ ہمارا حق ہے۔ پھر اگر ایسے زمینی خدا، قدرت کی پکڑ میں آ جائیں تو وہ مرتے مر جاتے ہیں لیکن بجائے نادم ہونے کے اپنی اکڑی ہوئی گردن جھکنے نہیں دیتے۔ تاریخ سے ایک اور واقعہ یاد آ رہا ہے کہ ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا مفہوم ہے کہ میری امت کا فرعون ابو جہل ہے جو موسیٰ علیہ السلام)کے فرعون سے زیادہ شقی ہے۔ استفسار پر فرمایا کہ)

موسیٰ کا فرعون جب خدائی پکڑ میں آکر دریا میں غوطے کھانے لگا تو پکار اٹھا کہ میں موسیٰ کے رب پر ایمان لے آیا اور استغفار کرنے لگا لیکن ابو جہل کی جب گردن کاٹی جانے لگی تو مرتے مرتے بھی کہنے لگا کہ میری گردن ذرا نیچے سے کاٹنا، کہ یہ سردار کی گردن ہے! یعنی ابو جہلملعون نے مرتے وقت بھی بجائے خوف کھانے کے غرور و تکبر کا اظہار کیا۔ ابو جہل کی اتباع میں ان دونوں مجرموں کا بھی یہی رد عمل ہے.... تصویر دیکھ کر یوں لگ رہا ہے جیسے انہوں نے ایک جیتے جاگتے انسان کو نہیں مارا بلکہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جس پر وہ میڈیا کو وکٹری کا نشان دکھا رہے ہیں!

ڈھٹائی اور حیوانی خوشی کے اظہار کا یہ پہلا واقعہ نہیں ہے۔ گزشتہ کچھ عرصہ سے تواتر کے ساتھ میڈیا میں ایسے کیسز رپورٹ ہوئے ہیں جن میں عدالت نے ایک ملزم کو مجرم ڈیکلیئر کرکے اسے سزا سنائی لیکن وہ مجرم عدالت سے جاتے ہوئے میڈیا کو وکٹری یعنی فتح کا نشان دکھا کر رخصت ہوا۔ نہ جانے یہ کیسی فتح ہے، جسے کم سے کم الفاظ میں بھی ڈھٹائی اور بدمعاشی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ گذشتہ سال کی ہی بات ہے کہ جب سابق وزیراعظم گیلانی کے سابق ایڈوائزر خرم رسول ایک کیس میں سپریم کورٹ میں پیش ہوئے۔ ان پر ایک پارٹی سے 62 کروڑ کی رشوت کا الزام تھا۔ بنک سے 2 کروڑ قرض لے کر واپس نہ کرنے پر ایک عدالت نے ان کی جائیداد ضبط کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔ یہ صاحب بھی سزا

سننے کے بعد جب عدالت سے واپس ہو رہے تھے تو وکٹری کا نشان بنا کر میڈیا کو دکھاتے ہوئے گویا قوم کو چڑا رہے تھے۔

اسی طرح آپ کو یاد ہو گا کہ 2007ء میں ایک فوجی دستے کو لال مسجد اور جامعہ حفصہ آپریشن کا ناخوشگوار فریضہ ادا کرنا پڑا جس میں سفاک صفت ڈکٹیٹر مشرف کے حکم پر معصوم بچیوں تک کو بارود سے پگھلا دیا گیا۔ آپریشن مکمل ہوا تو گاڑی میں واپس جاتے ہوئے بعض سکیورٹی اہلکار میڈیا کو دیکھتے ہوئے وکٹری کا نشان بنا رہے تھے۔ جیسے انہوں نے کشمیر فتح کر لیا ہو، یہ انداز انتہائی شرمناک تھا۔

ہمارے معاشرے میں یہ سفاکیت کیوں پیدا ہو گئی ہے؟ اس کا جواب زیادہ مشکل نہیں۔ جب گھٹی میں ہی بچوں کو خون چٹا دیا جائے، جب نوخیز ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی جائے کہ بس تم ہی انسان ہو، کیوں کہ تمہارے پاس بے حد و حساب پیسہ، اختیار اور طاقت ہے، باقی سب کیڑے مکوڑے ہیں اور کیڑے مکوڑوں کو جب چاہو مسل دو، کون پوچھنے والا ہے، یہ سوچ جب جوان ہو جاتی ہے تو پھر ایسے ہی سانحے جنم لیتے ہیں۔

امریکا کی نئی نسل دماغی خلل کا شکار

دنیا میں ہر شے کے دو پہلو ہوتے ہیں، ایک خیر کا پہلو اور ایک شر کا پہلو.... میڈیا کے بھی دونوں پہلو ہیں۔ اسی میڈیا سے ہم تعلیم وتربیت کا اور درست سمت میں رہنمائی کا تعمیری کام لے سکتے ہیں،اور اسی میڈیا سے ہم انسانوں کے بڑے مجمع کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ اس وقت میڈیا خصوصاً انٹر نیشنل میڈیا پر شر کا پہلو غالب ہے۔ انٹر نیشنل میڈیا تعمیری کردار ادا کرنے کی بجائے ایک ہتھیار بن چکا ہے، ایک ایسا ہتھیار جو دو بدو جنگ کیے بغیر ایک فریق کو جتوا سکتا ہے، جو میدان میں نکلے بغیر ہزاروں لاکھوں لوگوں کو بھڑکا کر خون کی ندیاں بہا سکتا ہے۔اس پروپیگنڈا ہتھیار کے لیے اب میڈیا وار کی اصطلاح وضع ہو چکی ہے۔سب سے پہلے امریکا نے میڈیا کے دور رس اثرات کو سمجھتے ہوئے اسے انتہائی پر اثر ہتھیار میں تبدیل کیا۔وہ ہتھیار جس کے ذریعے کروڑوں بلکہ اربوں انسانوں کی مخصوص ذہن سازی کرکے اپنا مطلب بخوبی نکال لیا جاتا ہے، اور وہ اربوں انسان اس ذہنی افیون کے اثرات اس طرح قبول کرتے ہیں کہ بے انتہا ظلم دیکھتے ہوئے بھی خاموش تو کیا رہتے، اس کے برعکس مظلوم کو ظالم سمجھ لیتے ہیں،یوں اس میڈیا نے بلا مبالغہ بموں اور میزائلوں سے زیادہ ہلاکت پھیلائی۔ عراق میں مبینہ ، ہتھیاروں کا جھوٹا دعویٰ ہویا افغانستان میں طالبان کے عوام پر فرضی ظلم کے قصے

پاکستانی ایٹم بم کا دہشت گردوں کے ہاتھوں میں جانے کا واویلا ہو یا سوات میں لڑکی پر کوڑے مارنے کی جھوٹی ویڈیو.... یہ سب اسی میڈیا کی کارستانی ہے جس نے صبح شام جھوٹ کی کاشت کی اور اپنے مذموم مقاصد یں اس حد تک کامیاب ہو گئے کہ سچ ، سچ ہوتے ہوئے بھی دفاعی پوزیشن پر آگیا۔

معاشرے پر اثر انگیزی کے حوالے سے فلم سب سے پر اثر میڈیا ہے۔ فلم کا اثر ناظرین پر بہت جلد اور گہرا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے حکومتوں نے فلم کے میڈیا کو بھی بھرپور استعمال کیا۔ خصوصاً امریکا نے ہالی ووڈ کے ذریعے اپنے نظریات مثلاً نیو ورلڈ آرڈر اور اپنی ثقافت کو پوری دنیا پر مسلط کیا۔ مثال کے طور پر روسیوں کے خلاف جہادِ افغانستان سے چونکہ امریکیوں کا مفاد بھی وابستہ تھا، اس لیے اس نے اس وقت کی مقبول ترین فلم سیریز کے کردار "ریمبو" کو ایک فلم میں جہاد افغانستان کا ہیرو بنا کر پوری دنیا کو اپنے مقصد سے ہم آہنگ کر لیا۔ اسی طرح یہودیوں نے بھی ہٹلر کو دنیا کا ظالم ترین آدمی باور کرانے اور اپنے اوپر ڈھائے جانے والے فرضی ظلم کی داستان 'ہولوکاسٹ' کو عالمگیر طور پر منوانے کے لیے پرنٹ میڈیا کو استعمال کیا اور اس میں جان ڈالی فلم کے ذریعے سے۔ جب یورپ میں ناظرین ہولو کاسٹ پر بننے والی فلموں کو دیکھ کر سینما سے باہر آتے تو ان کے چہرے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہوتے اور ان کے دل میں یہود کی مظلومیت کا نقشہ اچھی

طرح جم چکا ہوتا۔

اس کے علاوہ بھی سنیما نے گزشتہ چار دہائیوں میں نفرت، بدلہ، طاقت کے زور پر کچھ بھی کر لینے کا تصور، اسمگلنگ اور منشیات، مافیا کی طاقت، عریانیت، فحاشی، ذو معنی جملے، گالی گلوچ اور بیہودہ مکالموں تک کا سفر طے کرکے پوری دنیا کی تین نسلوں کو متاثر کیا اور ان کی اخلاقیات کو تباہ کر دیا۔ جرائم پر بننے والی فلمیں جرائم کی بیخ کنی کی بجائے جرائم کی نرسری بن گئیں۔ نوجوانوں نے ان فلموں سے عصمت دری، قتل، تاوان اور اغوا کے نت نئے طریقے سیکھے۔ انہوں نے ان فلموں سے انسپائر ہو کر جلد دولت مند بننے کے لیے ڈکیتی، چوری، دن دہاڑے قتل اور لوٹ مار کو اپنا مقصد زندگی بنایا۔ اسی طرح محبت جیسے آفاقی جذبے کے نام پر بننے والی ہوسناک فلموں نے جوان لڑکیوں اور لڑکوں کو آوارگی، عیاشی، عیش کوشی، عصمت فروخت کرنے اور عزت لوٹنے کی جانب راغب کیا، جس کے نتیجہ میں آج صرف امریکا میں ہر منٹ میں اوسطاً تین خواتین عصمت فروخت کرتی ہیں جبکہ اس سے زائد کے ساتھ زنا بالجبر کیا جاتا ہے۔ سینما کی شرانگیزی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سینما دماغ پر افیون جیسا اثر کرتا ہے۔ اور اس کے اسی غیر معمولی تاثر کی وجہ سے تشدد، ڈکیتی، عصمت دری، خودکشی اور قتل و غارت یہ سب جرائم اتنے پرکشش ہو جاتے ہیں کہ کچے ذہن کے نوجوان حقیقی زندگی میں اس کی نقل کرنے لگتے ہیں، یوں

جیمزبانڈ جیسے قاتل اور عیش پرست کردار کو اپنا ہیرو سمجھنے والے نوجوان المیوں کو جنم دیتے ہیں۔

ایسے ہی المیے پچھلے دو سالوں سے تواتر کے ساتھ امریکا میں جنم لے رہے ہیں۔

دوسروں کے آشیانوں کو پھونک کر تماشا دیکھنے والے خود اپنے ہی ہتھیار کا شکار ہو گئے ہیں۔جی ہاں امریکا یں کسی عام شہری کی طرف سے فلمی تشدد و قتل وغارت سے متاثر ہو کر عوامی مقامات پر فائرنگ کرکے معصوم لوگوں کی جان لینے کے گزشتہ دو سال میں دس بڑے واقعات ہوئے ہیں۔ قابل عبرت بات یہ ہے کہ اس طرح کے سب سے زیادہ واقعات تعلیمی اداروں میں ہوئے اوراس قتل و غارت کے ذمہ دار قاتل تقریباً سب ہی نوجوان اور طالب علم تھے۔ سب سے بڑا واقعہ 2007ء میں ہوا، جب ورجینیا ٹیک یونیورسٹی میں ایک ۳۲ سالہ طالب علم نے اندھا دھند فائرنگ کرکے بتیس طلبا وا ساتذہ کی جان لے لی تھی۔اس واقعہ کے بعد تو لائن لگ گئی۔ امریکی نوجوانوں کو قتل وغارت کا یہ طریقہ کار ایسا بھایا کہ پانچ سالوں میں بارہ ایسے واقعات رونما ہوئے جن میں تعلیمی اداروں میں معصوم بچوں کو بے دریغ گولیوں سے بھون دیا گیا۔ماہرین کے مطابق ان سارے واقعات میں ہونے والی قتل وغارت کا مقصد صرف اپنی وحشی ذہنیت کو تسکین پہنچانا تھا۔ فلم کے ہیرو اور ولن کی طرح اسلحے کے زور پر طاقت کا مظاہرہ اور بے گناہوں کے خون سے ہولی کھیلنے کی مہمیز انہیں ایکشن فلموں سے ہی ملی تھی۔

کولوریڈو سینما کے

باہر والا واقعہ تو خاص طور پر اس کی نشاندہی کرتا ہے کہ اس میں قاتل نے فلم کے ولن کا ماسک پہن رکھا تھا۔

اب ایک اور حالیہ رپورٹ دیکھتے ہیں جو امریکا ہی کے ایک ادارے سینٹر فار ڈیزیز کنٹرول اینڈ پریوینشن (سی ڈی سی) نے جاری کی ہے کہ امریکا میں ہر پانچواں نوجوان دماغی خلل کا شکار ہے۔ رپورٹ کے مطابق ذہنی امراض یا خلل کے شکار نوجوانوں اور بچوں کی تعداد تیزی سے بڑھ رہی ہے اور امریکا میں سالانہ بنیادوں پر 13 سے 20 فیصد بچے ذہنی بیماریوں کا شکار ہو رہے ہیں۔ سی ڈی سی کی اس رپورٹ کے مطابق امریکی نوجوانوں میں ذہنی امراض کا سب سے بڑا سبب الیکٹرانک میڈیا ہے۔ ان کے مطابق بہت زیادہ باخبری، خصوصاً جنگوں کی خبریں، تشدد پر مبنی ایکشن فلمیں جب تواتر کے ساتھ دیکھی جاتی ہیں تو ذہن اس پر ردعمل ظاہر کرتا ہے جو ڈپریشن کی صورت ظاہر ہوتا ہے، اور پھر آہستہ آہستہ یہ ردعمل خلاف معمول رویہ ظاہر کرنے لگتا ہے، مثلاً اپنے ہی والدین کو قتل کر دینا، چھوٹے معصوم بچوں پر تشدد کرکے ان کی جان لے لینا اور اسی نوعیت کے ایب نارمل رویے ظاہر ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس رپورٹ کے مطابق امریکی نوجوانوں میں زیادہ پائی جانے والی ذہنی بیماری خلافِ معمول رویے سیکھنے کی خصوصیت ہے جو ان میں 6.8 فیصد کی شرح سے موجود ہے۔ ذہنی اضطراب کی شرح 3 فیصد، ڈپریشن یا مالیخولیا کی شرح 2.1 فیصد، خود فکری کی بیماری 1.1 فیصد

کے حساب سے پائی جاتی ہے۔ مذکورہ شرح عرصہ 2005ء سے 2011ء کے درمیان ناپی گئی ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ امریکی بچوں میں ذہنی بیماریوں سے خودکشی کی شرح بھی اس تیزی سے بڑھ رہی ہے کہ خودکشی بچوں یا نوجوانوں کی اموات کی دوسری بڑی وجہ بن چکی ہے۔ یہ رپورٹس دیکھ کر مجھے امریکی بچوں پر ترس آنے لگا ہے۔ یہ بے چارے بچے بظاہر تو اس سپرپاور میں پیدا ہوئے ہیں، جس کا آرڈر دنیا کے ایک وسیع علاقے پر چلتا ہے، لیکن یہ بے چارے شفقت اور محبت کے بنیادی حق سے محروم رہتے ہیں۔ ان کے بچپن کو اس بے دردی سے گھائل کر دیا جاتا ہے کہ وہ ذہنی مریض بن جاتے ہیں اور پھر اس کا بدلہ وہ اپنے جیسے ہی بچوں سے لیتے ہیں یا پھر بڑے ہو کر دنیا کے انسانوں کے لیے ایک عذاب بن جاتے ہیں۔

لگتا یہ ہے کہ مکافات عمل کا عالمگیر قانونِ قدرت حرکت میں آ گیا ہے۔ امریکا نے طاقت کے زعم میں دنیا بھر میں خون کی جو ہولی کھیلی ہے، اس میں ہزاروں لاکھوں بچوں نے بھی غسل کیا ہے۔ اس کی میڈیا وار کے نتیجے میں عراق اور افغانستان میں، اس کے ڈرون حملوں کے نتیجے میں پاکستان میں اور اس کی سرپرستی میں اسرائیل کے ذریعے فلسطینی بچے جس طرح بن کھلے مرجھا گئے، یہ اسی کا نتیجہ ہے۔ شاید اپنے ہی میڈیا گزیدہ نوجوانوں کے ہاتھوں اپنے معصوم بچوں کا قتل اور اپنے بچوں کے ذہنی امراض انہیں اس بات کا احساس دلا دے کہ

دوسروں کے گھروں کو آگ لگانے والے کا اپنا گھر بھی جلتے دیر نہیں لگتی۔

ایک جنگ جو ابھی جاری ہے

ایک بار پھر مئی کا ستم گر مہینہ سر پر ہے۔ عجیب اتفاق ہے کہ مئی کا مہینہ خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کے لیے الم ناک رہا ہے۔اسی مہینے کی 4 تاریخ کو ٹیپو سلطان انگریزوں کے خلاف بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔اسی مئی کے مہینے کی 6 تاریخ کو امام المجاہدین سید احمد شہید اپنے مجاہد ساتھیوں کے ساتھ بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔اسی مئی کی 10 تاریخ 1857ء کو ہندوستان میں انگریز کے خلاف سب سے بڑی مسلح جدوجہد شروع ہوئی۔اسی مہینے کی 2 تاریخ کو سید احمد شہید کی راہ پر چلتے ہوئے امت مسلمہ کے ہیرو اسامہ بن لادن، شہادت سے سرفراز ہوئے اور پچھلے سال اسی مئی کی تاریخ تھی جب داعی قرآن اسلم شیخوپوری صاحب کراچی کی سڑک پر بے دردی سے شہید کر دیے گئے۔

اس بار 2013ء کے مئی کا مہینہ پاکستان کے لیے اس لیے بھی انتہائی اہم ہے کہ اسی مہینے کی گیارہ تاریخ کو پاکستان میں انتخابی معرکہ ہے۔ وہ دن جسے تبدیلی کا دن کہا جا رہا ہے۔ بہرحال ہمارا آج کا موضوع انتخابی معرکہ نہیں بلکہ وہ عظیم مسلح جدوجہد ہے جو آج سے ٹھیک ایک سو چھپن سال پہلے ہندوستان کے شہر میرٹھ سے شروع ہوئی تھی اور آج تک کسی نہ کسی شکل میں جبر و استبداد

کے خلاف جاری ہے۔ جی ہاں جیسا کہ اوپر ذکر کیا، پاکستان میں حالیہ انتخابات کی تاریخ سے صرف ایک دن پہلے 10 مئی اس حوالے سے ایک ناقابلِ فراموش تاریخ ہے کہ اسی تاریخ کو آج سے تقریباً ڈیڑھ صدی قبل ایک بظاہر معمولی واقعے کے سبب ہندوستانیوں کی غاصب انگریزوں کے خلاف سوا سو سال طویل جدوجہد اس موڑ پر پہنچی جو بالآخر ہندوستان کی آزادی پر منتج ہوئی اور جسے انگریز نے غدر کا نام دیا۔1857ء کی یہ تاریخ دراصل ہندوستان کی سیاسی اور ثقافتی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ قدیم و جدید کے درمیان یہی وہ منزل ہے جہاں سے ماضی کے نقوش بھی پڑھے جا سکتے ہیں اور مستقبل کے امکانات کا جائزہ بھی لیا جا سکتا ہے۔ تاریخوں کی اسی مطابقت کی وجہ سے خیال ہوا کہ ذرا تفصیل سے جنگِ آزادی کے پس منظر اور اس کے نتائج کا جائزہ لیا جائے کہ آج وطنِ عزیز کی سیاسی و معاشی صورتحال غلام ہندوستان سے کم مخدوش نہیں ہے اور اس وقت کے برطانوی استعمار کی طرح امریکی استعمار کی ریشہ دوانیاں بھی آج اپنے عروج پر ہیں۔

1857ء کی جنگِ آزادی کے کئی اسباب بیان کیے جاتے ہیں جس کا ایک فوری اور بڑا سبب ہندو اور مسلمان سپاہیوں کو کمپنی کی طرف سے دیے گئے وہ کارتوس قرار دیے جاتے ہیں، جو عام خیال کے مطابق گائے اور سور کی چربی سے آلودہ تھے اور انھیں بندوقوں میں ڈالنے سے پہلے دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ مسلمان اور ہندو سپاہیوں نے اسے اپنے اپنے دین کے منافی سمجھا اور ان کے دلوں میں گورے

آقاؤں کے خلاف نفرت کا دبا لاوا ابل پڑا۔ اکثر سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا، جس کی وجہ سے ان کی فوجی وردیاں اتار کر انہیں بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ 9 مئی 1857ء کو میرٹھ میں ایک رجمنٹ کے سپاہیوں کو دس سال قید با مشقت کی سزا دی گئی۔ اس سزا کو سن کر مقامی سپاہیوں نے بغاوت کر دی اور انہوں نے انگریز افسروں کو ہلاک کرکے اپنے قیدیوں کو آزاد کرا لیا اور مشتعل ہجوم کی صورت میرٹھ سے دہلی کی طرف بڑھنے لگے۔ میرٹھ کے سپاہیوں کی دہلی میں آمد سے دہلی میں بھی حریت کی ایک لہر اٹھی اور حریت پسندوں نے مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کا اعلان کر دیا گیا۔ اس اعلان کے بعد بغاوت کی آگ دور دور تک پھیل گئی۔

عموماً 1857ء کی جنگِ آزادی کو ہندوستانیوں کی انگریز کے خلاف آزادی کی پہلی مسلح جنگ کہا جاتا ہے اور کارتوس والے واقعے کو اس جنگ کا پیش خیمہ لیکن یہ دونوں باتیں حقائق کے منافی ہیں۔ نہ یہ ہندوستانیوں کی انگریزوں کے خلاف پہلی مسلح جنگ تھی اور نہ ہی صرف ناپاک کارتوسوں والا واقعہ 1857ء کی جنگ آزادی کا اکلوتا سبب تھا۔ اگر ہم اورنگزیب عالمگیر کی وفات 1707ء کے بعد سے لے کر 1857ء تک کے ایک سو پچاس سال کی تاریخ کا سرسری جائزہ لیں تو ہمیں چھوٹے بڑے بہت سے چراغ آزادی ِ ہند کی راہ میں 1857ء سے پہلے روشن نظر آئیں گے۔ شہداء کے خون سے روشن ان چراغوں کی لَو آزادی کے متوالوں کے دلوں میں

سلگتی رہی جو بالآخر 1857ء میں بھڑک کر ایک بڑی مسلح جدوجہد میں تبدیل ہو گئی۔یوں تو ان روشن ناموں کی ایک طویل فہرست ہے کہ سرزمین برصغیر اپنی مردم خیزی اور حریت پسندی کی بنا پر زمین کے کسی بھی اور ٹکڑے سے کم نہیں، لیکن چند نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، جن کیسمجھ بوجھ، شجاعت اور مسلح مزاحمت کی وجہ سے انگریز کے لیے ہندوستان میں اپنے اہداف حاصل کرنا بے حد مشکل ثابت ہوا اور ان کی وجہ سے 1857ء کی جنگِ آزادی اور بالآخر ہندوستان سے انگریزوں کے اخراج کی منزل قریب ہوئی۔ہم انہی سرفروشوں کا مختصر تذکرہ ذیل میں کریں گے۔

آزادی کی راہ میں ہمیں پہلا چراغ علی وردی خان کا روشن نظر آتا ہے۔بنگال کے نواب علی وردی خان نے ہی سب سے پہلے انگریزوں سے باقاعدہ منظم جنگ کی۔یہ جنگ مغربی بنگال کے دارالحکومت کلکتہ میں 1745ء ہوئی جو جنوبی ہندوستان میں انگریزوں کا سب سے پہلا مرکز تھا۔کلکتہ کا ڈائمنڈ ہاربر اور فورٹ ولیم انگریزوں کا مرکز تھا۔علی وردی خان نے فورٹ ولیم پر حملہ کرکے انگریزوں کو وہاں سے بھاگنے پر مجبور کر دیا اور انگریز ڈائمنڈ ہاربر میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے۔اسے غاصب انگریز کے خلاف ہندوستان کی پہلی منظم اور مسلح جنگ قرار دیا جاسکتا ہے۔علی وردی خاں اسکے بعد زیادہ دنوں زندہ نہیں رہے۔ان کے بعد ان کے جانشین اور نواسے نواب مرزا محمد سراج الدولہ حاکم ہوئے۔نواب

بھی اپنے نانا کی طرح انگریزوں کو ملک کے لیے ایک بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ انہوں نے قلیل وسائل کے باوجود بڑے حوصلے اور ہمت کے ساتھ انگریزوں کے بنگال یں مضبوط ہوتے قدم اکھاڑنے کی کوشش کی اور اس میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کر لی لیکن ان کی بدنصیبی کہیے کہ خود ان کی صفوں میں اتحاد قائم نہ رہا اور ان کا دربار سازشوں کا گڑھ بن گیا۔ خود نواب کے کئی قریبی رشتہ داروں نے غداری کا زہر پی کر انگریزوں سے اپنی قیمت وصول کی۔ ان میں اہم نام نواب کی خالہ گھسیٹی بیگم اور ان کے چچازاد بھائی شوکت جنگ کے بتائے جاتے ہیں۔ رشتہ داروں کی ریشہ دوانیوں اور اِن سے بڑھ کر نواب کی فوج کے ایک بدفطرت سردار میر جعفر کی غداری نے جس نے اقتدار کے لالچ میں انگریزوں سے ساز باز کر لی تھی) نواب سراج الدولہ) کو انگریزوں کے مقابلے میں بالکل بے دست وپا کر دیا۔ آخرکار غداری رنگ لائی اور 1757ء میں جنگ پلاسی کے موقع پر برٹش فوج نے نواب سراج الدولہ کو شکست فاش دی۔ کہا جاتا ہے کہ جنگ کے موقع پر میر جعفر اور اس کے وفادار دستوں نے نواب کے کئی وفادار سالاروں کو قتل کیا اور پھر جنگ سے الگ ہو گیا۔ نواب کا توپ خانہ بھی خرید لیا گیا تھا۔ نواب اس جنگ میں شہید ہوئے اور ان کی شہادت سے ہی بنگال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار کا سورج طلوع ہوا اور اگلے دس برس سے بھی کم عرصہ میں یعنی 1765ء میں انگریز ایک شرمناک معاہدے "معاہدہ ٔ الہ آباد" کے ذریعے بنگال، بہار اور اڑیسہ پر حاکم ہو گئے۔

فرنگیوں کے خلاف مسلح مزاحمت میں، علی وردی خان اور ان کے نواسے سراج الدولہ کے بعد اگلا معتبر نام روہیلی سردار حافظ الملک حافظ رحمت خان کا ہے۔حافظ رحمت خاں کا تعلق قندھار کے بڑھیچ قبیلے سے تھا۔آپ روہیل کھنڈ کے علاقے بریلی اور شاہ جہاں پور کے نواب تھے۔آپ ایک بے مثال سپہ سالار ہونے کے ساتھ ساتھ علم و فضل اور تقویٰ وطہارت میں بھی اپنی مثال آپ تھے۔زبردست ادیب وشاعر، بہترین حافظ قرآن اور علم پرور وعلم دوست تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کی فوج میں علماومشائخ کی بڑی تعداد تھی جو انگریزوں کے ساتھ برسرپیکار رہتی تھی۔حافظ الملک نے انہیں علم وکمال کی بنیاد پر فوج میں اعلی عہدے دے رکھے تھے۔حافظ الملک انگریزوں کے بہت سخت دشمن تھے۔وہ کسی نہ کسی طرح انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔چنانچہ 1764ء میں جب شجاع الدولہ پٹنہ میں انگریزوں سے نبرد آزما تھا،اس نے حافظ الملک سے امداد طلب کی توانھوں نے اپنے بیٹے عنایت خاں کی سرکردگی میں 6ہزار آزمودہ کار فوجی روانہ کیے جنھوں نے پانی پت جنگ میں شرکت کرکے شجاع الدولہ کی مدد کی۔

آپ کی انگریز دشمنی کا شہرہ دوردور تک ہوچکا تھا۔اسی شہرت کی وجہ سے انگریزان کو اپنے راستے کی بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔انہوں نے دھمکی، دباو، غرض تمام ہتھکنڈے آزمائے لیکن حافظ صاحب کی بے مثل شجاعت، سمجھ بوجھ اور نصرت خداوندی کی بناپر انگریزکافی عرصہ تک کسی منصوبے میں کامیاب نہ ہوسکے

۔آخر انھوں نے اپنا روایتی حربہ آزمانے کا فیصلہ کر لیا اور ایک منظم سازش کے تحت اسی شجاع الدولہ کو حافظ رحمت خان کے خلاف اپنا ہم نوا بنا لیا جس نے انگریزوں سے لڑتے ہوئے حافظ الملک سے مدد طلب کی تھی اور حافظ رحمت خاں نے اس کی مدد بھی کی تھی ۔شجاع الدولہ نے انگریزوں کا حلیف بن کر حافظ الملک کی ساری وفاداریوں کو فراموش کرکے پہلے تو سردارانِ روہیل کھنڈ کو حافظ الملک کے خلاف برگشتہ کیا اور پھر تقریباً ایک لاکھ پندرہ ہزار فوج لے کر ان پر چڑھائی کردی۔جنگ شروع ہونے سے پہلے حافظ الملک نے صلح جوئی کی کوشش بھی کی لیکن انگریز اور شجاع الدولہ آپ کی جان کے درپے تھے، اس لیے ہر کوشش بے سود گئی۔آخر شہادت کی آرزو لیے جنگ کے لیے نکل پڑے۔آپ کے شوقِ شہادت نے آپ کو مہمیز کیا اور اپنے فوجیوں کے سامنے فرمایا:

شہادت میرے دل کی آرزو ہے اپنے ملک کی حفاظت میں ایسی عزت کی موت مجھے" پھر کب آئے گی۔"میدان جنگ میں قدم رکھتے ہی حافظ الملک نے اپنی دلیری اور بہادری کے جوہر دکھانے شروع کردیے۔وہ انگریزوں کو تہ تیغ کرتے ہوئے شجاع الدولہ تک پہنچنا چاہتے تھے لیکن انگریزی فوج نے اپنی توپ کا دہانہ کھول دیا اور گولہ باری شروع ہوگئی۔عین اسی وقت آپ کے حلیف چند روہیلہ سرداروں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا اور بھاگ کھڑے ہوئے۔یہ دیکھ کر پوری فوج منتشر ہوگئی اور حافظ الملک کے پاس بہت کم فوجی رہ گئے لیکن پھر بھی حافظ الملک نہایت جرائت وہمت کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔آخر ایک گولہ ان کے سینے پر

لگا اور فوراً ہی آپ کی روح آپ کے جسم کے پنجرے سے آزاد ہو گئی۔ جنگ کرتے ہوئے حافظ الملک کی اس عظیم الشان شہادت کا واقعہ اپریل 1774ء میں میران پور کٹرہ میں پیش آیا۔ حافظ الملک کی شہادت کے بعد جب انگریزوں نے روہیل کھنڈ پر قبضہ کیا تو اتنی بے دردی سے لوٹ مار مچائی کہ زمین کانپ اٹھی۔ شجاع الدولہ کو اس پورے علاقے کا حاکم بنا دیا گیا، گویا یہ انگریز دوستی کا انعام تھا، جو اسے دیا گیا۔ حافظ الملک کی شہادت کے بعد روہیل کھنڈ کی زمین بنجر نہیں ہو گئی بلکہ بہت بعد میں ان کے پڑپوتے نواب خان بہادر خان کا نام ہندوستان کی آزادی کی تاریخ میں سنہرے حروف سے لکھا جائے گا۔ انہوں نے اپنی بے پناہ سیاسی سوجھ بوجھ اور جوانمردی سے اپنے آپ کو اپنے پڑدادا کا سچا جانشین ثابت کیا۔ اس شیر دل مجاہد نے 31 مئی 1857 سے فروری 1857 تک صرف آٹھ ماہ روہیل کھنڈ پر آزاد اور خود مختار حکمراں کی طرح حکومت کی۔ اس چھوٹی سی مدت میں اگرچہ مستقل طور پر جنگی معرکے جاری رہے لیکن اس کے ساتھ ہی خطے میں بہترین نظم و نسق اور عوام کی فلاح و بہبود کے حوالے سے بھی خان بہادر خاں نے شاندار مثال قائم کی۔ آزادی کی جنگ پوری طرح ہار جانے کے باوجود شیر دل نواب نے آخری سانس تک کافر انگریزں کے خلاف جہاد جاری رکھا۔ وہ تھوڑے سے جاں نثاروں کے ساتھ انگریزوں پر گوریلا حملے کرتے اور زبردست نقصان پہنچا کر جنگلوں میں چھپ جاتے۔ ایک گوریلا حملے کے وقت خان بہادر خاں بری طرح زخمی ہو کر گر گئے۔ انگریزوں نے انہیں گرفتار کر لیا۔ ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ مگر یہ مقدمہ

تو ایک قانونی ڈھونگ تھا۔ فیصلہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ انہیں پھانسی کی سزا کا حکم سنا دیا گیا۔ مولانا غلام رسول مہر کے مطابق 1860ء میں انہیں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ یوں روہیل کھنڈ کا بہادر سپوت نواب خان بہادر خاں بھی اپنے پڑدادا اور دوسرے مجاہدین کی طرح مادر وطن پر قربان ہو گیا۔

حافظ الملک رحمت خان کا انگریزوں کے ساتھ جب یہ معرکہ ہو رہا تھا، اسی وقت حافظ صاحب کے ہم عصر جنوبی ہند کی سلطنتِ خداداد میسور کے حکمراں حیدر علی اور ان کے مایہ ناز صاحبزادے ٹیپو سلطان انگریزوں کے لیے ایک بڑا خطرہ بن کر ابھر رہے تھے۔ فتح علی ٹیپو سلطان کے لیے مفکر اسلام حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"سب سے پہلا شخص جس کو (انگریزوں کے) خطرے کا (وسیع پیمانے پر) احساس ہوا، وہ میسور کا بلند ہمت اور غیور فرمانروا فتح علی خان ٹیپو سلطان تھا، جس نے اپنی بالغ نظری اور غیر معمولی ذہانت سے یہ بات محسوس کر لی کہ انگریز اسی طرح ایک ایک صوبہ اور ایک ایک ریاست ہضم کرتے رہیں گے اور اگر کوئی منظم طاقت ان کے مقابلہ پر نہ آئی تو آخر کار پورا ملک ان کا لقمہ تر بن جائے گا، چنانچہ انھوں نے انگریزوں سے جنگ کا فیصلہ کیا اور اپنے پورے ساز و سامان، وسائل اور فوجی تیاریوں کے ساتھ ان کے مقابلہ میں آ گئے۔"

ان دونوں باپ بیٹے نے اپنے جذبہ ایمانی، بے مثل شجاعت اور سمجھداری سے جنوبی ہند میں انگریزی استعمار کو پینتیس سال تک روکے رکھا اور اپنی جارحانہ کارروائیوں کی وجہ سے انگریزوں کے دانت کھٹے کر دیے۔ ان کی انگریزوں کے خلاف جنگوں کے احوال پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اگر کمپنی کسی سے خائف اور غالب ہوئی تو وہ یہی میسور کے حکمراں تھے۔ حیدر علی اور ان کے بعد ٹیپو سلطان نے بے مثل سیاسی قابلیت اور تدبر کا ثبوت دیا۔ اپنی فوج کو وقت کے تقاضوں کے مطابق جدید ترین اسلحے سے لیس کیا اور میدانِ جنگ میں کئی بار انگریزوں کو شکست وہزیمت سے دوچار کیا۔ یہاں تک کہ 1784ء میں انگریز سلطان سے صلح کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن معاہدے کے باوجود انگریز اپنی فطری بدنیتیکی وجہ سے اور اپنے مکروہ عزائم کو پورا کرنے کے لیے اندرونِ خانہ سازشوں میں مصروف رہے۔ انہوں نے یہاں بھی وہی ترپ کا پتہ کھیلا جسے وہ بنگال میں آزما چکے تھے، یعنی وفاداریاں خریدنے کا طریقہ.... یہ گھناونا طریقہ بالآخر میسور میں بھی کامیاب رہا اور انگریز، ٹیپو سلطان کے دربار سے میر صادق، غلام علی اور دوسرے اہم عہدیداروں کو توڑنے میں کامیاب ہو گئے۔ اپنے خریدے ہوئے غداروں کے اعتماد پر 1799ء میں انگریزوں نے میسور کی چوتھی جنگ چھیڑی اور اس مرتبہ غداری اور سازشوں کی دھند میں سلطان اپنی کامیابیوں کا تسلسل قائم نہ رکھ سکے۔ سلطان کو شکست ہوئی اور وہ بالآخر سرنگا پٹنم کے قلعے کے دروازے کے باہر بہادری سے لڑتے ہوئے اسی مئی کی 4

تاریخ کو 1799ء کو شہید ہو گئے۔ سلطان کو انگریز اپنے مکروہ عزائم کی راہ میں کتنی بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے اور ان کی شہادت انگریزوں کے لیے کتنی مسرت کا باعث تھی، اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ جب انگریز جنرل ہیرس کو سلطان کی موت کی اطلاع ہوئی تو وہ چیخ اٹھا کہ "اب ہندوستان ہمارا ہے۔" انگریزوں نے مذہبی رسوم ادا کرکے سلطان کیشہادت پر اظہارِ تشکر کیا اور اپنی فوج کو انعام واکرام سے بھی نوازا۔

ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد ہندوستان ہیں انگریزوں کا عمل دخل انتہائی تیزی سے بڑھتا چلا گیا۔ اس وقت تک انگریزوں کے مشاہدے اور تجربے ہیں یہ بات آچکی تھی کہ ہندوستان کی دو بڑی قوموں مسلمانوں اور ہندوؤں میں سے اب تک صرف مسلمانوں ہی کی طرف سے شدید مزاحمت دیکھنے میں آئی تھی۔ اس کی وجہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ تختِ ہندوستان پر اس وقت مسلمانوں ہی کی حکومت تھی، جس کو عضو معطل بنا کر وہ ہندوستان میں اپنا دائرہ آہستہ آہستہ بڑھاتے جا رہے تھے۔ اسی سوچ کے تحت کمپنی نے اپنی ساری توجہ مسلمانوں کے خلاف سازشیں کرنے اور ان کی قوت توڑنے پر مرکوز کر دی۔ یہ وہی زمانہ تھا، جب ہندوستان کے طول و عرض میں قائم کئی دینی مراکز کی جاسوسی سخت کی گئی اور ان میں سے کئی مراکز کو مختلف بہانے بنا کر تباہ کر دیا گیا۔

اس انتہائی پستی کے دور میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی کاوشوں سے ہندوستان کے خواص مسلمانوں میں آزادی کا جذبہ بیدار ہونے لگا تھا۔ شاہ صاحب سے تعلق رکھنے والے شاگرد اور مرید برما سے لیکر عرب ممالک اور افریقہ تک پھیلے ہوئے تھے۔ حضرت شاہ صاحبرحمہ اللہ کے بعد ان کی درسگاہ کو حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب دہلوی رحمہ اللہ نے آباد رکھا تھا۔ جو علم و سلوک کی شمع روشن رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے والد محترم کی اتباع میں غاصب انگریز سے آزادی کا جذبہ بھی اپنے شاگردوں اور مریدین کے دلوں میں پیدا فرماتے رہے۔ شہداء بالاکوٹ جو برصغیر سے انگریزوں کا اخراج اور ان کی غلامی سے آزادی کی تحریک اور مسلمانوں میں جذبہ ٔ جہاد بیدار کرنے کی لازوال داستان کا انتہائی اہم باب ہیں، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ کے خوشہ چیں (کیا یہ تعبیر صحیح ہے۔ فیصل) ہی تھے۔ اب تک انگریزوں کے خلاف مزاحمت کرنے والے وہ حکمراں تھے جن کے ساتھ اپنی سلطنت کی فوج تھی، اسلحہ تھا، وسائل تھے، لیکن تحریک آزادی ہیں اگلے نام ان کے تھے، جنہوں نے خالی ہاتھ محض جذبہ ایمانی اور شوقِ شہادت کے سرمائے پر فرنگیوں کے خلاف مسلح مزاحمت کے لیے افراد تیار کیے۔ ان کے ظلم کے خلاف جہاد میں حب الوطنی ثانوی شے تھی، اولیت نیت دین کے ایک حکم جہاد فی سبیل اللہ کو زندہ کرنے کی تھی، جو دین کا چوٹی کا عمل کہلاتا ہے۔ یہ عظیم نام مصلح امت امام المجاہدین حضرت سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کا ہے جو بیک وقت عالم دین، شیخ طریقت اور سرفروش مجاہد

تھے۔آپ کی ولادت بھارت کے صوبہ اترپردیش کے ضلع رائے بریلی کے ایک قصبہ دائرہ شاہ علم اللہ میں ہوئی۔ بچپن سے ہی گھڑسواری، مردانہ و سپاہیانہ کھیلوں اور ورزشوں سے خاصا شغف تھا۔ والد کے انتقال کے بعد تلاشِ معاش کے سلسلے میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لکھنو اور وہاں سے دہلی روانہ ہوئے، جہاں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی اور ان کے بھائی حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی سے ملاقات ہوئی۔ ان دونوں حضرات کی صحبت میں سلوک وارشاد کی منزلیں طے کی۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ انگریزوں کے سخت مخالف تھے۔انہوں نے 1803ء میں انگریزوں کے خلاف جہاد کا مشہور فتویٰ دیا، جس میں ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا گیا تھا۔ان حضرات کی رفاقت میں سید احمد شہید رحمہ اللہ کے خیالات میں انقلاب آگیا اور آپحضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ کی تحریک اور انکے تجدیدی کام کو لے کر میدانِ عمل میں آ گئے۔یہ وہ وقت تھا جب ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی طاقت تقریباً فنا ہو چکی تھی۔ مسلمانوں کی بڑی بڑی سلطنتیں انگریزوں کی عمل داری میں آ گئی تھیں۔ مشرکانہ رسوم و بدعات اسلامی معاشرے میں زور پکڑ رہے تھے۔ سارے پنجاب پر سکھ اور بقیہ ہندوستان پر انگریز قابض ہو چکے تھے۔ حضرت سید احمد شہید نے اسلام کے پرچم تلے فرزندانِ توحید کو جمع کرنا شروع کیا اور جہاد کی صدا بلند کی، جس کی بازگشت ہمالیہ کی چوٹیوں اور نیپال کی ترائیوں سے لیکر خلیج بنگال کے کناروں تک سنائی دی۔ حضرت سید صاحب اپنے معتمد ساتھیوں شیخ الاسلام مولانا

عبدالحہ رحمہ اللہ اور مولانا شاہ اسماعیل شہید رحمہ اللہ کے ساتھ خاموشی سے افراد سازی کے ساتھ ہتھیار جمع کرنے کا کام کرتے رہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ر ائے بریلی سے نکل کر مونگیر، بہار اور بنگال، گوالیار، ٹونک، اجمیر، پالی اور پھر سندھ وغیرہ کا دورہ کیا۔ وہاں کے امراء و رؤساء کو صحیح صورتحال سے آگاہ کرکے جہاد کیلئے آمادہ کیا۔ پورے سفر میں لوگوں نے ان کا والہانہ استقبال کیا۔ آپ نے سرحد کے مقام کو اپنا مرکز بنایا، کیوں کہ سید صاحب رحمہ اللہ کی نگاہ کے سامنے ان لوگوں کا انجام تھا جنھوں نے ہندوستان کے کسی حصہ کو اپنی تحریک اور جنگی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور بہت جلد ان کے گرد سازشوں، مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک جال پھیلا دیا گیا جس میں وہ جکڑتے چلے گئے۔ انگریزوں کی زیرک اور سازشی قوم ہر حوصلہ مند قائد اور اپنے ہر مخالف کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیتی تھی کہ اس کی جنگی کاروائیوں اور آزادانہ سرگرمیوں کا میدان تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ ایک قفس میں محبوس ہے۔ یہ سید صاحب کی بہت بڑی سیاسی بصیرت تھی کہ انھوں نے ہندوستان کے اندر اپنی مجاہدانہ سرگرمیوں کا مرکز نہیں بنایا' جس کے لیے بہت جلد ایک ایسا جزیرہ بن جانے کے قوی امکانات تھے جس کے چاروں طرف مخالفتوں' مزاحمتوں اور سازشوں کا ایک سمندر پھیلا ہوا ہوتا اور جس کو کہیں سے کمک یا رسد ملنے کی کوئی توقع نہ رہتی۔ چنانچہ اسی وجہ سے اور سکھوں کے مسلمانوں پر روز بروز بڑھتے ظلم کی وجہ سے آپ نے ہندوستان کی

شمال مغربی سرحد کو ہی اپنا مرکزِ جہاد چنا۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہی تھی کہ وہاں انگریزوں اور سکھوں کی عملداری نہ تھی اور پنجاب چونکہ سرحد سے متصل تھا اس لئے یہ طے ہوا کہ اس مرکز میں مضبوط ہو کر سکھوں سے مقابلہ کیا جائے انہیں شکست دینے کے بعد ہندوستان میں انگریزوں سے جہاد کیا جائے۔ (حوالہ: بریلی سے بالاکوٹ، قمر امجد عثمانی)

انگریزوں نے ان کی تحریک کی نوعیت کو خوب سمجھ لیا تھا اور وہ اس جذبہ سے بھی بے خبر نہ تھے جو جماعتِ مجاہدین کے قلب وجگر کو گرمائے ہوئے تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک طرف تو وہابی کا لقب دے کر اس مکتبہ خیال کے لوگوں کو ختم کیا اور دوسری طرف کوشش کرکے اس تحریک کو اس طرح پیش کیا اور کرایا جس سے بعد کے لوگوں کو یوں محسوس ہونے لگا گویا اس کا رخ محض سکھوں کی طرف تھا۔ بہرحال حضرت مجاہدین کو لیے شمال مغربی سرحد پر پہنچے اور سکھوں سے جنگ کرکے مفتوحہ علاقوں میں اسلامی قوانین نافذ کیے۔ لیکن جن سازشوں، غداری اور بے وفائی کے خدشات آپ کو سرحد لے کر آئے تھے، یہاں بھی وہی کھیل کھیلا گیا اور برا ہو قبائلی عصبیت کا آپ کی بے مثال جدوجہد اور کامیابیوں کو بالآخر غداری کا ناسور لے ڈوبا۔ 1831ء میں رنجیت سنگھ کی سازشوں کے نتیجے میں بعض مقامی سرداروں نے بے وفائی کی اور بالاکوٹ کے میدان میں سید صاحب، شاہ اسماعیل اور دوسرے رفقاء نے جامِ شہادت نوش فرمایا۔

حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ تو شہید ہو گئے لیکن آپ کی بے مثال تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں کے تن مردہ میں گویا نئی روح پھونک دی۔ یہی جہادی جذبہ ء کی جنگِ آزادی کا روح رواں تھا۔ میرٹھ کے سپاہیوں کی بغاوت اور انگریز1857 افسروں کو جہنم رسید کرنے کے بعد آزادی کی یہ لہر بڑی سرعت سے ہندوستان بھر میں خصوصاً شمالی ہندوستان میں پھیل گئی۔ بہادر شاہ ظفر کو بادشاہ تسلیم کرنے کے بعد جنگِ آزادیِ دہلی، آگرہ، کانپور، مراد آباد، شاہ جہان پور، سہارنپور، شاملی تھانہ بھون، مظفر نگر، میرٹھ، جھانسی، الہ آباد، رام پور، لکھنو اور روھیل کھنڈ وغیرہ میں پھیل گئی، جس میں بلا امتیاز مذہب وملت اہلِ وطن نے حصہ لیا۔ علماء کرام اور خصوصاً علمائے دیوبند نے بھی اس جنگ میں بھرپور حصہ لیا اور حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اسلاف کی یاد تازہ کی۔ حضرت مدنی رحمہ اللہ کی کتاب " نقشِ حیات " کے مطابق ان حضرات میں جو لوگ دہلی میں تھے، جامع مسجد دہلی میں جمع ہوئے اور ایک فتویٰ جہاد صادر کر دیا۔ فتویٰ جہاد جاری ہونے کے بعد ہندوستان کے مختلف مقامات پر جنگی مراکز قائم ہو گئے۔ ان میں سے ایک اہم مرکز شاملی تھانہ بھون کا بھی تھا۔ یہ مرکز حاجی امداد اللہ مہاجر مکی رحمہ اللہ اور ان کے رفقائے کار نے قائم کیا تھا۔ حضرت حاجی صاحب چوں کہ شاہ ولی اللہ تحریک سے وابستہ تھے اور حضرت سید احمد شہید رحمہ اللہ کے روحانی

سلسلے سے بھی تھے، اس لیے اس جماعت کے علماء آپ کی امارت میں جہاد کے لئے جمع ہو گئے۔ اس جماعت میں مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا فیض الحسن سہارن پوری، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا محمد منیر، حافظ محمد ضامن اور مولانا محمد یعقوب رحمہم اللہ شامل تھے۔ شاملی اس زمانہ میں مرکزی مقام تھا۔ ضلع سہارنپور سے متعلق تھا۔ قرار پایا کہ اس پر حملہ کیا جائے، چنانچہ چڑھائی ہوئی اور قبضہ کر لیا گیا، جو طاقت پولیس اور فوج کی وہاں رہتی تھی وہ مغلوب ہو گئی۔ حضرت حافظ ضامن صاحب اسی معرکے میں شہید ہو گئے۔ حافظ ضامن صاحب مرحوم کی شہادت کے بعد جو پہلی خبر آئی وہ یوں تھی کہ دہلی پر انگریز کا قبضہ ہو گیا۔ اس سے پہلے گورے فوجی چھپتے پھرتے تھے مگر بعد میں معاملہ بالکل برعکس ہو گیا۔ دہلی کے سقوط کی خبر سے لوگوں کی ہمتیں بالکل پست ہو گئیں اور سب اپنے اپنے وطن کو واپس آ گئے۔ تقدیر تدبیر پر غالب آ گئی، ہندوستانیوں کو اپنے سابقہ اعمال کی سزا ملنی تھی۔ گذشتہ مصائب پاداش کے لئے احکم الحاکمین کے دربار عدالت میں کافی نہ تھے، اس لئے باوجود اس قدر جاں بازیوں کے برٹش شہنشاہیت کو ہندوستان پر اس طرح مسلط کر دیا گیا جس طرح کوڑے لگانے والے بھنگی جلاد کو مجرم پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ علماء میں مولانا احمد اللہ شاہ صاحب دلاور جنگ، مولانا فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین صاحب صدر الصدور دہلی، مولوی عبد القادر صاحب، قاضی فیض اللہ صاحب دہلوی، مولانا فیض احمد صاحب بدایونی، ڈاکٹر مولوی وزیر خان اکبر آبادی ....

الحاصل ان علماء نے آخر وقت تک اپنے فتویٰ کے مطابق عمل کیا' جنرل بخت خان اور اس کی فوج اور مجاہدین نے پوری داد شجاعت دی' مگر آپس کے غداروں نے (جن کے سرغنہ مرزا الٰہی بخش اور مرزا مغل شہزادہ تھے) ہر قسم کی ابتری پھیلادی اور نتیجہ وہی ہوا جو ایسی باتوں کا ہوتا ہے۔ 19 ستمبر 1857ء کو پوری دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا اور انتہائی سفاکی سے دہلی میں قتل عام جاری کر دیا گیا۔

حضرت حاجی صاحب بقصد مکہ معظّمہ روانہ ہوگئے' راستہ میں مختلف مقامات پر جہاں پہلے سے تعلقات تھے' ٹھہرتے جاتے تھے۔ جاسوس پیچھے لگے ہوئے تھے مگر ہر جگہ اللہ تعالیٰ نے ان حضرات کی مدد فرمائی۔ دشمنوں کی انتہائی جد وجہد کے باوجود تینوں حضرات محفوظ رہے' کسی کا بال بیکا نہ ہوا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ وارنٹ کے بعد تین دن تک بتقاضائے احباب واعزہ روپوش رہے' اس کے بعد مکان سے باہر نکل آئے' لوگوں نے اصرار کیا تو فرمایا کہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف تین دن تک غار ثور میں روپوش رہے، وہ سنت پوری ہو گئی، اب روپوش ہونا خلاف سنت ہوگا۔ کسی کی نہ مانی اور قرب وجوار کے موضع میں کبھی نانوتہ میں' کبھی دیوبند میں کبھی املیا میں' کبھی آباد میں' کبھی جنگل میں پھرتے رہے۔ اسی طرح حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ اپنی جگہ گنگوہ سے نہیں ٹلے' بالآخر گرفتار ہوئے۔ گنگوہ

سے سہارن پور اور وہاں سے مظفر نگر لائے گئے۔ سپاہی ننگی تلواروں سے آپ پر پہرہ دیتے رہے۔ آپ کو مظفر نگر جیل بھیج دیا گیا اور شہادتوں کے حصول کے لئے پولیس اور حکومت کوشش کرتی رہی ،تاکہ ثبوت بہم پہنچا کر مقدمہ چلایا جائے۔

اہم بات یہ ہے کہ دہلی کے تاریخی معرکہ اور شاملی کی جنگ کی تاریخ ایک ہی ہے، اسے اتفاق نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ ایک مشترکہ جدوجہد آزادی کی دو کڑیاں ہیں۔ دہلی معرکہ میں انگریز جنرل نکلسن مارا گیا، مگر آخرکار دہلی اور شاملی دونوں جگہ ہندوستانیوں کو شکست ہوئی، اور بہادر شاہ ظفر 17 اکتوبر کو گرفتار کرکے رنگوں بھیج دیئے گئے۔ بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری اور جلاوطنی کے بعد انگریز پوری طرح دہلی پر قابض ہوگیا۔ پھر دہلی پر کیا گزری؟ ایک قیامت تھی جو گورے منہ والے سپاہیوں کی شکل میں دلی کے گلی کوچوں میں اتر گئی۔ ہزاروں سر بدن سے اتر گئے۔ جس کو زندہ دیکھا، مار دیا۔ لاشوں سے راستے پٹ گئے۔ گھر کے گھر بے چراغ ہو گئے۔ جو کبھی پیدل نہیں چلے تھے، وہ بھاگ رہے تھے۔ رئیس اور امراء گداگروں کی طرح ایک ٹکڑا روٹی کے محتاج نظر آنے لگے۔ دلی کا حسن خاک وخون میں تڑپ تڑپ کر ختم ہورہا تھا۔ گلی کوچوں میں لوگ انگریز کے خوف سے تھر تھرا رہے تھے۔ دلی کی عصمت مآب بیبیوں کی عصمت سر بازار لٹ رہی تھی' لوگ در و دیوار سے ٹکرا رہے تھے۔ کتاب ،انگریز کے باغی مسلمان کے مندرجات کے مطابق فتح پور سے جامع مسجد تک پھانسیوں کا

جال بچھا ہوا تھا۔ شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے اور پانچ پانچ یا چھ چھ آدمیوں کو روزانہ سزائے موت دی جاتی تھی۔ وال پول کا بیان ہے کہ تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی، جن میں سے انتیس شاہی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ہزاروں نفوس گولیوں سے اڑا دیے گئے۔ ان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ لیکن جلد ہی انگریزی فوج کے سکھ سپاہیوں نے قتل و غارت میں فرقہ ورانہ رنگ بھر دیااور مسلمان چن چن کر قتل کیے گئے۔

مولف تبصرۃ التواریخ لکھتا ہے کہ: "ستائیس ہزار مسلمان قتل کے گئے اور سات دن تک برابر قتل جاری رہا، زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں سلوا کر گرم تیل کے کڑھاؤ ڈلوانا اور فتح پور کی مسجد سے قلعہ کے دروازے تک درختوں کی شاخوں پر مسلمانوں کی لاشوں کا لٹکانا یہ سب کچھ کیا گیا۔"

1857ء کی جنگِ آزادی کی ہولناکی اتنی بڑھی کہ اس کی مثال نہیں ملتی۔ جنگِ آزادی کے حوالے سے لکھی جانے والی کتابوں کے مطابق چند روز کے اندر صرف دِلّی میں 27 ہزار افراد شہید کیے گئے، پھر یہ قیامت صرف دلی تک محدود نہیں رہی بلکہ پورا ہندوستان ہی دلی بن گیا۔ ایک اندازے کے مطابق پورے ہندوستان میں تقریباً 19 ہزار علماء کو شہید کیا گیا۔ فرنگیوں پر طاقت اور انتقام کا بھوت اس طرح سوار تھا کہ صرف مسلمان ہونا بھی جرم بن گیا تھا۔ انگریزوں کے

فوجی لوگوں کو پکڑتے اور پوچھتے ہندو ہو یا مسلمان؟ جیسے ہی یہ معلوم ہوتا کہ پکڑا جانے والا مسلمان ہے تو اسے قتل کر دیا جاتا۔ جنگِ آزادی نے انگریزوں کی اخلاقیات اور نفسیات کو کتنا پست کر دیا تھا اس کا اندازہ انگریز مصنف باس ورتھ اسمتھ کے اس اقتباس سے بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ باس ورتھ لکھتا ہے: "بعض افسر رومی سرپیٹکے جوش میں اصرار کر رہے تھے کہ دلّی شہر کو جو ہندوستان کا سرمایہ نِ افتخار اور اس کا دارالحکومت تھا، ڈھا کر زمین کے برابر کر دیا جائے اور زمین کو شورزار بنادیا جائے۔ دوسرے اس سے بھی آگے بڑھ کر مذہبی جنون میں اس بات پر زور دے رہے تھے کہ جامع مسجد کو جو دنیا کی شاندار ترین اور نفیس ترین عمارتوں میں سے ایک تھی، کھدوا دیا جائے یا کم از کم اس کے کلس پر صلیب نصب کرکے اسے گرجے میں تبدیل کرایا جائے۔
"

باس ورتھ کے مطابق بعض انگریزوں نے دہلی میں ہل چلوانے کی تجویز دی۔ بڑی تعداد میں مساجد کو بارکوں میں تبدیل کیا گیا۔ وہاں کتے رکھے جاتے اور خنزیر ذبح کیے جاتے۔ یہ مسلمانوں کی مزاحمت اور حکمت عملی تھی کہ وہ اپنا وجود بچانے میں کامیاب رہے، ورنہ انگریزوں نے نسل کشی میں کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔
بہرحال طوفان آتا ہے تو گزر بھی جاتا ہے، یہ طوفان بلاخیز بھی گزر گیا۔ اور

اس طوفان کے گزرنے پر جہاں ہزاروں الم ناک کہانیاں وجود میں آئیں وہیں شہداء کے خون سے کئی مثبت امکانات بھی نظر آنے لگے۔ 1857ء کی اس جنگِ آزادی نے برصغیر کی ملّتِ اسلامیہ کو غلامی کی نفسیات کا اسیر ہونے سے بچالیا اور برصغیر کے مسلمان اس جنگ کے صرف 80 سال بعد اس قابل ہوگئے کہ وہ برصغیر میں ایک آزاد وطن کے قیام کے لیے ایک عظیم الشان تحریک برپا کرسکیں اور پھر اسے حاصل بھی کرسکیں۔

جیسا کہ شروع میں ذکر کیا تھا کہ 1857ء کیجنگ آزادی خصوصاً برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔اور یہی وہ منزل ہے جہاں سے نہ صرف ماضی کے نقوش بھی پڑھے جاسکتے ہیں بلکہ مستقبل کے امکانات کا جائزہ بھی لیا جاسکتا ہے ۔آج جب کہ 1857ء کو ایک سو چھپن سال گزر چکے ہیں، پاکستان میں کم و بیش وہی صورت حال ہے۔ جیسا کہ ہم نے متحدہ ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف تمام مسلح مزاحمتوں کا جائزہ لیا، تواس جائزے سے ایک بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ تمام مزاحمتیں جو جلد یا بدیر شکستوں پر منتج ہوئیں، ان میں فیصلہ کن کردار غداریوں کا رہاہے۔اس بات سے اب انکار ممکن نہیں کہ برطانوی استعمار نے ہندوستان کو ہندوستانیوں کے کاندھوں پر چڑھ کر فتح کیا تھا۔آج بھی جب اتنے عرصے میں بہت کچھ بدل گیا ہے مگر نہیں بدلا تو ملت فروشوں کا غدارانہ کردار نہیں بدلا۔ برطانوی سامراج برصغیر سے نکلنے

کے بعد جو نظام چھوڑ گیا تھا وہ اب بھی خصوصاً پاکستان میں استحصال کی انتہا کر رہا ہے اور یہاں کے مقامی حکمران اسکے گماشتے اور دلال بنے ہوئے ہیں۔ اس نظام کو صرف ایک ہمہ گیر انقلاب کے ذریعے ہی بدلا جاسکتا ہے۔ اس خطے کے خواص و عوام کے لئے 1857ء کی جنگ آزادی کا یہی اصل پیغام ہے۔

زمین کا انتقام

1990ء کا سال تھا جب ہم ساتویں کے طالب علم تھے۔ اندرونِ سندھ ، ٹنڈوآدم میں واقع ہمارے جوہر اسکول کا شمار اُن دنوں شہر کے اچھے اسکولوں میں ہوتا تھا۔ ایک دن سلیم سر نے بتایا کہ ایک ہفتے میں ہمارے اسکول کا انسپیکشن ہونے والا ہے۔ بورڈ سے ٹیم آئے گی اس لیے سب فلاں دن تیار ہو کر آئیں۔ پورے ہفتے اسکول میں انسپیکشن کی تیاری ہوتی رہی۔ باہر کی دیواروں پر کلر کروایا گیا، راستوں میں چونا ڈالا گیا اور عارضی طور پر خوبصورت گملے منگوا کر تمام کلاسوں میں رکھوائے گئے۔ تمام بچوں کے ذمہ بھی کوئی نہ کوئی چیز لگائی گئی کہ وہ گھر سے لا کر کلاس روم کو سجائیں۔ کوئی سینری لایا تو کوئی گھڑی۔اور تو اور رنگین جھنڈیاں اور جھاڑ فانوس تک لٹکائے گئے۔اسکول دلہن کی طرح نہیں تو ڈبلیو گیارہ کی طرح ضرور سج گیا۔ بہرحال انسپیکشن کا دن آ پہنچا، ٹیم آئی، اسے دو تین اسپیشل کلاسوں کا دورہ کروایا گیا، پھر لذت کام و دہن کا دور چلا اور ٹیم واپس چلی گئی۔ اللہ اللہ خیر صلا.... دوسرے ہی دن عارضی گملے ہٹا دیے گئے۔ بچوں کی چیزیں واپس گھر پہنچ گئیں۔ جھاڑ فانوس لپیٹ کر رکھ دیے گئے۔ دو تین دن میں ہی W11 نے پھر سے 1D کا روپ دھار لیا اور دوبارہ سے ہر طرف مٹی اڑنے لگی۔

اس وقت بچے تھے، حیرت ہوئی لیکن پھر مسلسل مشاہدے سے شعور میں یہ بات جم گئی کہ ہمارے معاشرے میں الا ماشاء اللہ اچھے کام بھی اکثر ایک اعلیٰ قدر کے تحت نہیں بلکہ کسی نہ کسی جبر کے تحت ہوتے ہیں۔ یہ جبر کبھی مفاد کا ہوتا ہے تو کبھی معاشرتی جبر کسی اچھے کام پر مجبور کر دیتا ہے۔ اب دیکھ لیں، ہر سال مارچ میں واٹر ڈے منایا جاتا ہے اور اپریل میں ارتھ ڈے، جون میں ماحولیات کا دن بھی آتا ہے اور موسمیات کا عالمی دن بھی الگ سے منایا جاتا ہے.... اتنے سارے دنوں کے منانے کا مقصد صرف یہ ہے کہ ہم اپنے مشترکہ گھر کا کچھ خیال کر لیں.... وہ گھر جو اپنے ہی مکینوں کے ہاتھوں جل رہا ہے.... لیکن ہر ایسے موقع پر سالوں سے یہی دیکھنے میں آتا ہے کہ کچھ لوگ بیانات دے دیتے ہیں، ہم جیسے لوگ کچھ مضامین لکھ دیتے ہیں، دس بیس شجر لگا دیے جاتے ہیں، کچھ ہاؤ ہو' ہو جاتا ہے اور پھر وہی روزوشب.... اسی طرح ہم سارے سال پانی کا ضیاع کرتے ہیں، اسی طرح آلودگی پھیلاتے ہیں۔ اور وہ گورے لوگ ! ....وہ بھی ویب سائٹس بناتے ہیں، لاکھوں پمفلٹ چھاپتے ہیں، کتابوں پر کتابیں، تحقیق پر تحقیق.... گلوبل وارمنگ، پگھلتے گلیشئر، سمندروں کی بلند ہوتی سطح، بدلتے موسم، تباہ کن بارشیں، سمندری طوفان اور مرتے ہوئے جنگلات، کیا کیا رپورٹس سامنے نہیں آتیں....اسی طرح کانفرنسیں، ورکشاپس، سیمینار، دھواں دھار تقریریں....سب ہوتا ہے لیکن نہیں ہوتا تو بڑی بڑی چمنیوں سے نکلتا ہوا دھواں کم نہیں ہوتا۔

نچلے پیمانے پر تو شاید چند سرپھرے ہمارے اس مشترکہ گھر کے لیے کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں، لیکن اونچے پیمانے پر حکومتیں صرف بیان بازی کرتی ہیں۔ماحولیات پر سب سے زیادہ شور ترقی یافتہ ممالک مچاتے ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ماحول کے عالمی بگاڑ کے سب سے بڑے ذمہ دار بھی یہی ممالک ہیں۔ ایٹمی تجربات، ایٹمی توانائی اور پھر اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا ایٹمی فضلہ سب سے زیادہ انہی ممالک میں پیدا ہوتا ہے، جو نہ صرف انسانی صحت کے لئے مہلک ترین ہے بلکہ زمین کے لئے بھی انتہائی نقصان دہ ہے۔ اس تابکار فضلے کو عام طریقے سے ضایع نہیں کیا جا سکتا،اسی لیے انہیں مخصوص کنٹینرز میں بند کرکے کسی دور افتادہ مقام مثلاً کسی بیابان صحرا میں دفن کر دیا جاتا ہے یا پھر سمندر کی تہہ میں دبا دیا جاتا ہے۔ لیکن ہر وقت شدید خطرہ موجود رہتا ہے کہ کہیں تابکار فضلہ کسی حادثے کی وجہ سے کنٹینرز سے باہر آ جائے اور یوں زمین اور اس پر رہنے والی مخلوقات کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچ جائے۔

تابکار فضلہ کے علاوہ کاربن کے اخراج کے ذمہ دار بھی سب سے زیادہ ترقی یافتہ ممالک ہیں۔ماحولیات کے حوالے سے 2009ء میں ہونے والی کوپن ہیگن کانفرنس اور پھر 2010ء میں میکسیکو سٹی میں ہونے والی کانفرنس میں جب یہ نکتہ بار بار اٹھایا گیا کہ ترقی یافتہ ممالک کو کاربن کے اخراج میں تیزی سے کمی

کرنی چاہیے اور اس حوالے سے ایک عالمی معاہدہ ہونا چاہیے تو یہ کانفرنسز اختلافات کا شکار ہو گئیں۔ اس موقع پر چین اور بھارت سمیت کچھ ممالک نے ترقی یافتہ ممالک سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اپنے کارخانوں سے اُن زہریلی گیسوں کے اخراج کو ایک مناسب سطح پہ لائیں، جس سے اوزون کی حفاظتی تہہ کو شدید نقصان پہنچ رہا ہے اور یوں سورج کی ضرر رساں شعاعیں زمین تک پہنچ کر فطری ماحول کو تباہ کر رہی ہیں۔ لیکن ہونا کیا تھا جی، کوئی پیش رفت نہ ہو سکی۔ یوں یہ کانفرنسیں کوئی مضبوط لائحہ عمل طے ہوئے بغیر ختم ہو گئیں۔ اب حال یہ ہے کہ 2010ء میں ہی پاکستان میں شدید سیلاب آیا۔ پھر 2011ء میں سندھ میں سیلاب کے ہاتھوں قیامت ٹوٹی، امریکا میں بھی دو تین سالوں کے وقفے سے کئی بار سمندری طوفان آ چکے ہیں، جس میں کا تازہ ترین سانحہ ابھی مئی میں آنے والا اوکلوہاما طوفان ہے، جس میں 100 سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔ اور تادمِ تحریر انڈیا کے شمالی علاقے بھی تباہ کن سیلاب کی زد میں ہیں، جس میں سینکڑوں ہلاکتیں ہو چکی ہیں اور ابھی بھی ہزاروں لوگ لاپتہ ہیں۔ باقی دنیا کا حال بھی ماحول، موسم اور قدرتی آفات کے اعتبار سے نہایت سنگین ہے، لیکن افسوس کہ کوئی بھی اپنی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ چھوٹے ترقی پذیر ممالک بھی ساری ذمہ داری بڑے ممالک کے سر پر ڈال کر خود کو بری الذمہ قرار دے ڈالتے ہیں، جب کہ مقامی طور پر ان کے ہاں بھی ماحولیات کا حال انتہائی بدتر ہوتا ہے۔

حکومتوں کا رویہ عوام میں بھی باآسانی منتقل ہو جاتا ہے۔ ہم دوسروں کو چھوڑیں، اپنا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ اس خود غرضی کا شکار ہم بھی ہیں۔ ہم روزانہ اپنے گھر کی صفائی کا خیال کرتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ صرف یہ چھوٹی سی چار دیواری ہمارا گھر نہیں بلکہ یہ پورا سیارہ ہمارا گھر ہے، جہاں ہمارے بعد ہماری نسلوں نے زندگی گزارنی ہے۔ یہ زمین ہمارے پاس آنے والی نسلوں کی امانت ہے اور صرف انسانی نسلوں کی نہیں بلکہ اس زمین پر دیگر جانداروں کا بھی اتنا ہی حق ہے، جتنا ہمارا.... لیکن ہمارے کرتوتوں کی وجہ سے دیگر جاندار وں کی نسلیں بھی تیزی سے ختم ہو رہی ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ کل ہماری اور جانوروں کی نسلیں اس پر ایک محفوظ زندگی گزاریں تو کوئی کرے نہ کرے، ہمیں خود اس کو محفوظ بنانے کے لیے اقدامات کرنے ہوں گے۔

اول ہمیں انتہائی ضرورت کے علاوہ سواری کا استعمال ترک کرنا ہو گا، کیوں کہ سواری کا مطلب ہے ایندھن کا استعمال اور نتیجتاً کاربن کا اخراج۔ یاد رکھیں، زیادہ سے زیادہ پیدل چلنا ہمارے دل کے لیے بھی اچھا ہے اور اس نیلے سیارے کے لیے بھی!

دوم.... ہمیں کیمیکلز کا استعمال اپنی زندگی میں کم سے کم پر لانا ہو گا،

مثلاً ہمیں حشرات مچھر، لال بیگ اور چیونٹیاں، کھٹمل مارنے کے لیے مختلف کیمیکلز اور اسپرے کے استعمال سے حتی الامکان بچنا چاہیے۔ اسی طرح اسپرے والے پرفیوم کی بجائے عطر پر اکتفا کرنا چاہیے۔ کیونکہ گھریلو سطح پر استعمال ہونے ان اسپروں کی وجہ سے فلورو کاربن گیسز پیدا ہو کر اوزون کی سطح کو ایسے ہی نقصان پہنچاتی ہیں جیسے کہ بڑی بڑی ملوں کی چمنیوں سے خارج ہونے والی گیسیں.... اس کے علاوہ اگر ہم کسان ہیں تو ہم کیڑے مار ادویات کا استعمال کم سے کم کریں۔ ہم سگریٹ پینا چھوڑ دیں، بالکل نہیں چھوڑ سکتے تو کم کر دیں اور کم سے کم پبلک مقامات پر تو بالکل نہ پیئیں۔

سوم .... ہم سودا سلف لانے کے لیے پلاسٹک شاپر کا استعمال کم از کم اپنی حد تک روک دیں۔ یاد کریں ہمارے بزرگ گھروں میں ایک کپڑے کا تھیلا بنا کر رکھا کرتے تھے۔ ایسے دو چار تھیلے سلوالیں اور انہیں ہی استعمال کریں۔ دودھ دہی کے لیے بھی گھر سے برتن لے کر جائیں۔ یہ عام سی نظر آنے والی پلاسٹک شاپر ماحولیات کے لیے زبردست اور مستقل خطرہ ہے۔ پھر جس طرح کی کم مائیکرون کی تھیلیاں ہمارے ہاں بے دریغ استعمال ہو رہی ہیں، وہ تو انسانی صحت کے لیے بھی انتہائی خطرناک ہیں۔

چہارم.... کچرے کو مناسب انداز سے ٹھکانے لگائیں۔ گھریلو کچرا متعین کچرا

دانوں میں ڈالیے۔ گھر سے باہر ہیں تو ٹافیوں کا ریپر تک جیب میں ڈالیے، ساحل پر تفریح کے لیے گئے ہیں تو وہاں کچرا پھیلانے کی بجائے ایک تھیلے میں کچرا ڈال کر گھر لائیے اور کچرا دان میں ڈالیے۔ کسی کو کچرے میں آگ نہ لگانے دیجیے۔ یہ ایک انتہائی غیر ذمہ دارانہ عمل ہے اور یہ ماحولیاتی آلودگی کا باعث بنتا ہے، کیونکہ عموماً کچرے میں ہزاروں پلاسٹک شاپرز اور پلاسٹک کی اشیاء ہوتی ہیں جن کے جلنے سے فضا میں انتہائی زہریلی گیسیں پھیلتی ہیں جو انسانی صحت کے لئے بھی بے شمار مسائل پیدا کرتی ہیں، جن میں سر فہرست مختلف اقسام کے کینسر ہیں۔جدید تحقیق کے مطابق ایندھن اور کچرا وغیرہ جلنے سے فضا میں سیسے کی مقدار زیادہ ہوجاتی ہے جس کی وجہ سے ذہنی طور پر کمزور بچوں کی پیدائش میں اضافہ کے ساتھ دماغی امراض میں اضافہ ہوتا ہے۔ یہ آلودگی عورتوں اور مردوں میں بانجھ پن بھی پیدا کر سکتی ہے۔ شاید اسی لیے شہروں کی سطح پہ مردوں میں بانجھ پن بڑھ رہا ہے۔

پنجم .... ہوا کے ساتھ ساتھ پانی کو بھی آلودہ ہونے سے بچائیے۔ ملک بھر میں صنعتی فضلہ کسی صفائی کے بغیر دریاوزں کے پانی میں شامل کر دیا جاتا ہے، جس سے نہ صرف دریاؤں کا پانی آلودہ ہوتا ہے، بلکہ یہ فضلہ زمین کی اوپری سطح کو زہریلا کرنے کے ساتھ ساتھ زمین کے نیچے موجود میٹھے پانی کے ذخائر کو بھی آلودہ کر دیتا ہے۔ اس سے آبی حیات کو بھی خطرہ ہوتا ہے اور اس کے ساتھ فصلیں

بھی متاثر ہوتی ہیں۔ ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق مختلف اجناس اور سبزیوں کی کاشت میں استعمال ہونے والے پانی کے نمونوں کے تجزیے سے پتہ چلا ہے کہ اس میں کیڈمیئم، کاپر، کرومیئم، آئرن، زنک، لیڈ اور میگانیز سمیت دیگر زہریلی دھاتیں بڑی مقدار میں موجود ہیں۔ان دھاتوں سے گردوں کے امراض، ہڈیوں کی کمزوری، سرطان، ہیضہ، اسہال، پیٹ کے امراض، وزن کی کمی، دماغی امراض، بانجھ پن اور ہائی بلڈ پریشر جیسے طبّی مسائل پیدا ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے سب سے بڑے شہر اور صنعتی حب کراچی میں تو یہ صورتحال تشویشناک حد تک بگڑ چکی ہے۔ شہر کے مختلف علاقوں سے پانی کے نمونے حاصل کرکے جب ان کا تجزیہ کیا گیا تو ان میں کئی دھاتیں عالمی ادارہ صحت کے مقررہ کردہ معیار سے زائد پائی گئیں۔ ہمارے ہاں ملیر ندی اس کی واضح مثال ہے۔ اور ستم در ستم یہ ہے کہ اسی زہریلے پانی اور زمین میں سبزیاں کاشت کرکے کراچی کی مارکیٹ میں فروخت کی جاتی ہیں، یوں بالواسطہ طور پر یہ زہریلے کیمیکلز زمین کے ساتھ ہمارے جسم میں بھی سرایت کر جاتے ہیں۔ایک حالیہ رپورٹ کے مطابق صرف کراچی شہر میں زیر زمین میٹھے پانی میں زہریلے کیمیکلز کی شرح سات اعشاریہ صفر نو صفر تک پہنچ گئی ہے جو ماضی کے مقابلے میں بلند ترین شرح ہے۔

باتیں تو بہت سی ہیں، لیکن اس تھوڑے کو بہت جانیں اور ان بظاہر چھوٹی چھوٹی ہدایات پر خود عمل کرنا شروع کریں اور دوسروں کو ترغیب دیں، کیوں کہ باتیں

تو بہت ہو گئیں، اب عملی اقدامات کی ضرورت ہے۔ ورنہ یاد رکھیں اگر یہ زمین ہم سے انتقام لینے پر تل گئی تو ہمیں خلاؤں میں کہیں پناہ نہ ملے گی، کیوں کہ اب تک کائنات میں پھیلے کھربوں سیاروں میں سے کوئی زمین جیسا پانی اور ہوا سے مزین گھر دریافت ہوا، نہ ہونے کا امکان ہے۔

مہمانوں پر حملہ

پچھلے اتوار کو نیٹ پر جب یہ خبر پڑھی کہ پاکستان کے شمالی علاقے گلگت بلتستان کے ضلع دیامر میں نانگا پربت بیس کیمپ میں دہشت گردوں نے دس غیر ملکیوں اور ایک پاکستانی سیاح کو فائرنگ کر کے ہلاک کر دیا ہے تو دماغ سن ہو کر رہ گیا۔ یوں تو ملک میں جاری دہشت گردی کی نئی لہر میں ہونے والے سارے واقعات ہی افسوس ناک ہیں، لیکن گلگت کا یہ واقعہ بہت ہی زیادہ قابلِ مذمت ہے۔ یہ بہت ہی برا ہوا، بہت ہی برا.... بیرون ملک سیاح دراصل اپنے ملک کے سفیر ہوتے ہیں اور جس ملک میں جاتے ہیں، وہاں کے مہمان تصور ہوتے ہیں اور مہمانوں و سفیروں کو حالت جنگ میں بھی کوئی ہاتھ نہیں لگاتا۔ سیاح ایسے مہمان ہیں جو آپ کے گھر آتے ہیں تو لاکھوں ڈالر زر مبادلہ اور روزگار کے چھوٹے بڑے سینکڑوں مواقع ساتھ لے کر آتے ہیں اور جاتے ہوئے میزبان کے گھر سے حسین یادیں اور اس کے سوفٹ امیج کو ساتھ لے کر جاتے ہیں۔

پاکستان کا شمار دنیا کے ان چند ممالک میں ہوتا ہے جو ایڈونچر ٹورازم، قدرتی خوبصورتی، مذہبی سیاحت اور تاریخی مقامات سے مالامال ہے۔ ان مقامات میں سے کئی خاص مقامات گلگت بلتستان میں ہیں جو دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ یہاں دنیا کی دوسری بلندترین چوٹی کے ٹو اور دنیا کی نویں بلند ترین اور

افسانوی شہرت یافتہ چوٹی نانگا پربت (جسے کلر ماؤنٹین بھی کہا جاتا ہے، اور جس کے دامن میں دہشت گردی کی یہ واردات ہوئی ہے) سمیت 8ہزار میٹر سے بلند 5 چوٹیاں ہیں، اس کے علاوہ 7ہزار میٹر سے بلند 101 چوٹیاں، 5ہزار ایک سو گلیشیر، چوبیس سو مربع میل پر مشتمل برفانی علاقہ، سینکڑوں قدرتی جھیلیں، ہزاروں سال پرانا تاریخی ورثہ دنیا بھر کے سیاحوں کے لیے نہایت پر کشش ہیں۔ یہاں دنیا کا وہ منفرد ترین مقام ہے جس کا کوئی ثانی نہیں، یعنی یہاں دنیا کے تین عظیم پہاڑی سلسلے ہمالیہ، قراقرم اور ہندو کش ہم آغوش ہوتے ہیں۔ ان سحر انگیز مقامات کی وجہ سے گلگت سیاحوں کی جنت کہلاتا تھا لیکن اس جنت میں پچھلے ایک عشرے سے امن و امان کی حالت نہایت خراب ہے، جس کی سنگینی میں کئی گنا زیادہ اضافہ اس سانحے سے ہوگیا ہے۔

سیاحت کا شعبہ کسی بھی ملک کا بہت اہم شعبہ ہوتا ہے، کیوں کہ یہ نہ صرف زرِ مبادلہ ملک میں آنے کا بڑا ذریعہ ہے بلکہ یہ کسی بھی ملک کے مثبت تاثر کو بیرونی دنیا میں عام کرنے کا ذریعہ بھی ہے۔ سیاح جس ملک میں جاتے ہیں، وہاں کی سماجی، ثقافتی، سیاسی اور معاشرتی اقدار کے بارے میں جان کر پھر دنیا بھر میں ایک طرح سے اُس ملک کے بغیر تنخواہ کے سفیر بن جاتے ہیں۔ اس وقت دنیا بھر میں کئی ایسے ممالک ہیں، جن کی مجموعی ملکی آمدن کا دار و مدار ہی سیاحت پر ہے۔ دنیا بھر یں سیاحت ایک بڑی صنعت بن چکی ہے جس سے

لاکھوں لوگوں کا کاروبار وابستہ ہے۔ شعبہ سیاحت سے وابستہ انہی کثیر الفوائد مقاصد کی وجہ سے وہ ممالک جو خوبصورت قدرتی مناظر اور تاریخی و ثقافتی ورثہ سے مالا مال ہیں، وہاں سیاحوں کو ہر ممکن سہولیات پہنچائی جاتی ہیں، جن میں سب سے بڑھ کر ان کو سکیورٹی فراہم کرنا ہے۔ لیکن ہمارے ہاں امن و امان کی حالت اتنی مخدوش ہے کہ اب ہم اپنے مہمانوں کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ کتنے تعجب اور افسوس کی بات ہے کہ وردی پوش دہشت گرد انتہائی دشوار گزار راستوں سے گزر کر آتے ہیں، اپنے ہدف کو ہٹ کرتے ہیں اور بحفاظت اپنی کمین گاہوں میں روپوش ہو جاتے ہیں اور دنیا کی منظم ترین فوج اور خفیہ ادارے منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں۔

اس دہشت گردی کے بعد حسبِ معمول تحریک طالبان پاکستان نے ذمہ داری قبول کر لی، لیکن ٹی ٹی پی کا ہر دہشت گردی کے واقعے کے بعد ذمہ داری قبول کرنا خود ایک انتہائی پراسرار اور متنازعہ معاملہ ہے۔ اس لیے ہم بالکل کنفرمیشن کے ساتھ کچھ کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ اس ضمن میں دفتر خارجہ اور گورنر گلگت کے بیانات انتہائی اہم ہیں، جس سے شک ہوتا ہے کہ یہ واقعہ اور اس کا پس منظر اتنا سادہ نہیں ، جتنا میڈیا پر بتایا جا رہا ہے۔ دفتر خارجہ نے سانحے کی شدید مذمت کرتے ہوئے کہا کہ اس واقعہ کے ذمہ دار دراصل پاک چین تعلقات خراب کرنا چاہتے ہیں۔ کچھ اسی طرح کی بات گورنر گلگت بلتستان نے بھی

کی، انہوں نے بھی واقعہ میں بیرونی ہاتھ ملوث ہونے کا عندیہ دیا ہے۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ بیرونی ہاتھ ملوث ہے، پھر بھی یہ بات تو یقینی ہے کہ بیرونی دشمنوں نے براہِ راست یہ کارروائی نہیں کی ہے بلکہ اپنے مقامی مہرے استعمال کیے ہیں۔ میڈیا پر ٹی ٹی پی کے حوالے سے بتایا جا رہا ہے کہ ڈرون حملوں کے رد عمل میں اور دنیا کو ڈرون حملوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے انہوں نے کارروائی کی ہے۔ اگر واقعتاً ٹی ٹی پی نے یہ کہا یا جس نے بھی ان کی طرف سے یہ بات گھڑی ہے تو یہ انتہائی بھونڈی دلیل ہے۔ یہ اسلام کے احکامات کے تو بالکل خلاف ہے ہی، پشتونوں اور قبائلی روایات کے بھی بالکل خلاف ہے۔ ہم تو بچپن سے یہی سنتے آ رہے ہیں کہ قبائلی علاقے والے مہمان نوازی میں دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں۔ پھر افغان طالبان (جن کے نام پر پاکستانی گروہ خود کو "طالبان" کہتے ہیں)کے بارے میں غیر ملکی میڈیا بھی معترف ہے کہ وہ دورانِ جنگ بھی اسلامی اخلاقیات کی پوری پابندی کرتے ہیں۔ دیکھیے عین حالتِ جنگ میں ایک برطانوی صحافی خاتون بہروپ بدل کر جاسوسی کرنے کے لیے افغانستان میں داخل ہوتی ہے اور طالبان کے قبضے میں آ جاتی ہے تو صرف دس دن میں طالبان کے اخلاق سے متاثر ہو کر مسلمان ہو جاتی ہے۔ پھر ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ ملا عمر حفظہ اللہ کو اپنا امامِ جہاد کہنے والے اپنے اوپر ظلم کا بدلہ معصوم اور نہتے سیاحوں کو خون میں نہلا کر لیں !!

دہشت گردی کا یہ واقعہ پاکستانی سیاحت کے لیے اس لحاظ سے اور بھی زیادہ سنگین ہے کہ پچھلے ماہ ایک امریکی جریدے کے سروے کے مطابق پاکستان سیاحت کے اعتبار سے دنیا کے نہایت خطرناک ممالک میں سے ایک ہے۔ سیاحت کے حوالے سے اس رپورٹ کی بازگشت پچھلے ماہ عالمی میڈیا پر سنائی دیتی رہی ہے۔ اس رپورٹ میں پاکستان کو جو سیاحت کے زمرے میں عالمی طور پر کم از کم پہلے پانچ ممالک میں جگہ پانے کا استحقاق رکھتا تھا، ہماری نااہلی کی وجہ سے سیاحت کے لیے دنیا کے پہلے پانچ خطرناک ترین ممالک یں پانچویں نمبر پر شمار کیا گیا ہے۔ یہ شرمناک اعزاز مئی 2013ء میں امریکی جریدے فوربز کی اس حوالے سے مرتب کردہ فہرست میں پاکستان کو دیا گیا۔ اس فہرست میں ڈکیتیاں، قتل و غارت، کرپشن، اغواء برائے تاوان، دہشت گردی اور دیگر عناصر کو مد نظر رکھا گیا۔ فہرست میں صومالیہ کو سیاحت کے لیے سب سے خطرناک ملک قرار دیا گیا، دوسرے نمبر پر افغانستان موجود ہے، تیسرے نمبر پر عراق کو رکھا گیا ہے چوتھے نمبر پر افریقی ملک کانگو ہے اور اس کے بعد جنت نظیر پاکستان کا نمبر ہے جہاں دہشت گردی عروج پر ہے۔ میں سوچ رہا ہوں کہ دہشت گردی کی حالیہ واردات کے بعد اب اگر پاکستان کو سیاحت کے لیے خطرناک ترین ممالک میں پہلے نمبر کا "اعزاز دے دیا جائے تو کچھ بعید نہیں۔"

نانگا پربت جسے دنیا بھر کے کوہ پیما کلر ماونٹین یعنی قاتل پہاڑ بھی کہتے

ہیں.... صدیوں سے انسانی جانوں کا خراج لیتا آیا ہے۔ پوری دنیا میں سب سے زیادہ
جس چوٹی کو سر کرنے میں کوہ پیماؤں کی جانیں تلف ہوئی ہیں، وہ نانگا پربت ہی
ہے.... اسی قاتل پہاڑ کے دامن میں ایک بار پھر گیارہ قیمتی جانیں تلف ہوئی ہیں لیکن
اس بار قاتل پہاڑ نہیں، وہ انسان نما درندے ہیں، جو چند سکوں کی خاطر انسانی خون کی
ہولی کھیلتے ہیں....!!

موت بانٹنے کے مراکز

لفظ ہسپتال انگریزی لفظ Hospital سے ماخوذ ہے، جس کا اردو مترادف شفا خانہ ہے، یعنی ایسی جگہ جہاں مریضوں کو علاج کی سہولت مہیا کی جاتی ہے، اور انہیں شفایاب کرنے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔ اسی طرح طبیب کے لیے مسیحا کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے، یعنی وہ شخص جو بیماروں کی دادرسی کرے، ان کے دکھ درد کی دوا کرے اور اپنے دستِ مسیحائی سے بیماروں کو اچھا کرنے کی تگ ودو کرے، لیکن اس وقت بندہ کیا کرے، جب یہی شفاخانے موت کا مرکز بن جائیں، جب مسیحا موت بانٹنے لگ جائیں.... اس وقت آدمی کیا کرے کہ جب وہ ایک مرض کا علاج کروانے ان 'شفا خانوں' میں جائے اور دوسرے امراض اپنے ساتھ لگا آئے۔ جی ہاں یہی کچھ ہو رہا ہے ہمارے ملک کے اکثر سرکاری شفا خانوں میں.... یہ سرکاری ہسپتال شفاخانے کی بجائے امراض کا گڑھ بن چکے ہیں۔ یہاں صرف فرش، بستر، درودیوار اور واش رومز ہی گندگی میں اٹے نہیں ہوتے بلکہ وہ مشینیں جو علاج کے لیے استعمال ہوتی ہیں، جراثیم کی افزائش گاہ کا کام دیتی ہیں۔ یہاں ملنے والی ادویہ اسی فیصد غیر معیاری یا جعلی ہوتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کسی کو اس بات میں مبالغہ محسوس ہو لیکن یہ بات پوری ذمہ داری سے کہی جا رہی ہے۔ خود پچھلی حکومت کی رپورٹ کے مطابق پاکستانی

مارکیٹ میں پچاس فیصد تک جعلی ادویہ فروخت ہو رہی ہیں، تو سرکاری شفاخانوں میں آنے والی مفت ادویہ کا معیار کیسا ہوگا، یہ بخوبی سمجھ میں آتا ہے۔ آپ پچھلے سال لاہور میں عارضہ قلب کا علاج کروانے والے ایک سو سات مریضوں کی ہلاکت کا واقعہ نہیں بھولے ہوں گے جنھوں نے ایک سرکاری ادارے سے سرکاری دوا اس امید پر حاصل کی کہ مفت میں ان کے دل کا علاج ہوگا لیکن وہ دوا ان کے دل کو ہمیشہ کے لیے خاموش کرنے کا سبب بن گئی۔ بتایئے اس سے زیادہ ہولناک مذاق کیا ہوگا؟

دواؤں کے ایشو کو ایک طرف رکھیے تو بھی صفائی کے انتہائی ناقص انتظامات کی وجہ سے سرکاری ہسپتال بجائے شفاخانوں کے امراض گاہ بن چکے ہیں۔ یہاں جراثیم مارے کم جاتے ہیں، پھیلائے زیادہ جاتے ہیں۔ خصوصاً خون کے ذریعے منتقل ہونے والے مہلک امراض کے جراثیم عملے کی ذرا سی لاپروائی سے ایک سے دوسرے مریضوں میں منتقل ہوتے چلے جاتے ہیں، جس کی سب سے بڑی وجہ استعمال شدہ سرنج کا دوبارہ استعمال اور غیر اسٹریلائزڈ (جراثیم سے غیر پاک شدہ) طبّی آلات ہیں۔

آلودہ آلات کے ذریعے مہلک امراض کے جراثیم کی منتقلی کی حالیہ مثال پاکستان کے صوبہ خیبر پختونخواہ میں محکمہ صحت اور سول سیکریٹریٹ پشاور کے افسران

پر مشتمل ٹیم کی ایک انکوائری رپورٹ ہے جس میں نہایت ہولناک انکشاف کیا گیا ہے۔ بتایا گیا ہے کہ پشاور کے سب سے بڑے ہسپتال لیڈی ریڈنگ ہسپتال میں انتظامیہ کی غفلت اور لاپرواہی کے باعث گردوں کے مرض میں مبتلا کئی مریض ہیپاٹائٹس بی یا سی کے مہلک امراض میں بھی نہ صرف مبتلا ہو گئے ہیں بلکہ کئی مریض ان کی وجہ سے موت کے منہ میں بھی جا چکے ہیں۔ اس رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے ڈائلیسس یونٹ میں جراثیم سے آلودہ آلات سے گردوں کی صفائی کے دوران تقریباً پانچ سو مریض ہیپاٹائٹس بی اور سی کے جراثیم کا شکار ہوئے ہیں، جن میں چونتیس مریضوں کے نام اور پتے بھی فراہم کیے گئے ہیں۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ اس کا ذمہ دار ڈائلیسس یونٹ کا اسٹور کیپر ہے جس نے ذرا سا مالی فائدہ حاصل کرنے کے لیے سینکڑوں مریضوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔

انسانی صحت سے یوں ظالمانہ کھلواڑ کرنے والے کسی ایک شہر میں نہیں پورے ملک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اور اس میں کسی حد تک خود مریض بھی ذمہ دار ہیں۔ خون کے ذریعے جراثیم منتقلی کے جن دو طریقوں کا اوپر ذکر کیا گیا، اس میں ایک استعمال شدہ انجکشن کا دوبارہ استعمال بھی ہے۔ خون میں پائے جانے والے جراثیم کی منتقلی کا پہلا واقعہ جو ریکارڈ میں آیا، غیر محفوظ انجکشن کے استعمال سے ہی پیش آیا۔ یہ واقعہ 1917ء کا ہے، جب اس وقت برطانوی سپاہیوں

میں ملیریا کا مرض پھوٹ پڑا اور پتا چلا کہ جن سرنجوں اور سوئیوں سے آتشک
سفلس) کے مریضوں کو انجکشن لگائے جاتے رہے، وہ اب دوسرے مرض کے لیے)
استعمال ہو رہے ہیں۔انجکشن کے ذریعے دوا دینے کا طریقہ اس لیے اختیار کیا گیا تھا تا کہ
بے ہوش مریضوں یا کسی دوسری مجبوری کی وجہ سے منہ کے ذریعے دوا استعمال کرنے
سے معذور افراد کو بروقت دوا دے کر ان کی جان بچائی جاسکے، مگر ہمارے ہاں انجکشن
لگوانا فوری طاقت یا شفا حاصل کرنے کا طریقہ سمجھا جاتا ہے۔لیکن عوام کی اکثریت
نہیں جانتے کہ بہت سے مہلک امراض کا ایک مریض سے دوسرے مریض تک سفر اکثر
یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ یہ مہلک امراض مثلاً ایڈز، ہیپاٹائٹس کی مختلف اقسام اور
خون سے پھیلنے والی دوسری خطرناک بیماریاں آلودہ سرنج اور غیر اسٹریلائزڈ طبّی آلات
کے ذریعے ایک مریض سے دوسرے مریض تک سفر کرتی ہیں۔
ان آلودہ سرنجز کے دوبارہ استعمال میں بھی بالواسطہ طور پر سرکاری ہسپتال ملوث ہیں،
کیوں کہ بہت کم ہسپتالوں میں استعمال شدہ سرنجیں، انجکشن اور طبّی فضلہ تلف کرنے کا
موثر نظام ہے۔لہٰذا زیادہ تر استعمال شدہ سرنجیں، انجکشن اور استعمال شدہ سامان و
مواد یا تو ہسپتال کا صفائی عملہ خود آگے فروخت کر دیتا ہے، یا پھر ہسپتال کا یہ طبّی فضلہ
صحیح طرح تلف کیے بغیر پھینک دینے کی روش کی وجہ سے مفاد پرستوں کا کوئی گروہ خود
اسے جمع کر کے

ری سائیکل اور ری پیک کرکے مارکیٹ میں بیچ دیتا ہے۔

خون سے منتقل ہونے مہلک امراض کے پھیلاوز کا ایک بڑا سبب عطائیت بھی ہے جو پاکستانی معاشرے کا ناسور ہے۔ یہ عطائی اپنے مالی فائدے کے لیے بڑے بڑے دعوے کرکے لوگوں کو بے وقوف بناتے ہیں اور ان کی صحت کا کباڑا کر دیتے ہیں۔ یہ جراثیم سے بھرے آلات لیے ڈاکٹر "چنگٹ شنگ دندان ساز" کے ٹائپ بورڈ لگائے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہوتے ہیں اور لوگوں کے دانتوں میں یہ آلات استعمال کرکے انہیں خون سے منتقل ہونے والے امراض ہیپاٹائٹس اور ایڈز پیسے لے کر تقسیم کرتے ہیں۔ آپ کسی بھی شہر کے عوامی مقامات، بس اسٹاپ، پارک اور ریلوے اسٹیشن وغیرہ دیکھ لیں، آپ کو دیواریں عطائیوں کے اشتہارات سے رنگین ملیں گی، جس میں ہر مہلک مرض کا علاج راتوں رات کرنے کا دعویٰ کیا گیا ہوتا ہے، بڑے بڑے جلی حروف میں ان عطائیوں کے فون نمبرز اور ایڈریسز بھی موجود ہوں گے، لیکن کوئی ادارہ ان پر ہاتھ نہیں ڈالتا۔ جیسا کہ لیڈی ریڈنگ ہسپتال کے ڈائیلسس یونٹ کی رپورٹ میں ہوا، غیر محفوظ سرنجز اور غیر اسٹیرلائزڈ طبّی آلات کے بار بار استعمال سے سب سے خطرہ ہیپاٹائٹس کا ہے۔

خاص طور پر ہیپاٹائٹس بی اور سی کا کیوں کہ ہیپاٹائٹس بی کے وائرس، ایڈز کے وائرس کے مقابلے میں 100 گنا زیادہ موثر طور پر منتقل ہو سکتے ہیں اور ہپاٹائٹس سی کے وائرس ایڈز کے وائرس سے 10 گنا زیادہ موثر

طور پر منتقل ہوتے ہیں۔اور ایک رپورٹ کے مطابق ان دونوں نامراد امراض کے علاج کامالی بوجھ دنیا میں تمام امراض سے زیادہ ہے۔ان امراض سے بچنے کے لیے ہمیں انفرادی طور پر بھی کوشش کرنی چاہیے ۔ کسی بھی باربر شاپ پر جائیں تو نئے بلیڈ پر اصرار کریں کہ یہ آپ کا حق ہے۔ڈینٹل کلینک وغیرہ میں استعمال ہونے والے آلات کے ضمن ہیں بھی خاص احتیاط برتنی چاہیے ۔علاج کروانے سے پہلے اس بات کی یقین دہانی کر لینی چاہیے کہ تمام آلات اچھی طرح سے اسٹیر لائزڈ ہیں کہ نہیں۔انجکشن کا کم سے کم استعمال کریں اور ضرورت پڑنے پر ہمیشہ ایک بار استعمال ہونے والی قابل تلف نئی سرنج استعمال کریں۔اسی طرح کسی بھی ناگہانی صورت حال ہیں آپ کو یا آپ کے عزیز کو خون کی ضرورت ہو تو چھوٹے چھوٹے غیر معروف بلڈ بینک کی بجائے مستند بلڈ بینک جو اسکرین شدہ خون کی ضمانت دیتے ہوں، سے خون لینا چاہیے۔یاد رکھیے یہ چند چھوٹی چھوٹی ہدایات آپ کو مستقبل کی بڑی بڑی پریشانیوں سے بچا سکتی ہیں۔اور ہاں ایک اوراہم ترین ہدایت تو بھول ہی گئے....اگر ہوسکے تو سرکاری ہسپتالوں سے علاج کروانے سے اس وقت تک بچیے جب تک حکومتی مشینری کے تمام افراداور تمام وزراءکے لیے سرکاری ہسپتال سے علاج کروانا لازم نہ قرار دے دیا جائے۔کیوں کہ ہو سکتاہے کہ آپ گردوں کے مرض کے علاج کے لیے ہسپتال جائیں اور واپسی میں کالے یرقان کا تحفہ ساتھ لیتے آئیں۔دیکھیے ناں گردوں کے مرض میں مبتلا مریض اس مرض سے تو بچ جائے لیکن کالے یرقان سے مر جائے تو کتنی ستم ظریفی کی بات ہے !!

جانے کب ہوں گے کم، اس دنیا کے غم

معروف شاعر ریاض الرحمٰن ساغر تو یہ حسرت لیے اس دنیا سے چلے گئے ،اور ایک دن ہم سب بھی اسی حسرت کے ساتھ قبروں میں اتر جائیں گے کیوں کہ آج کی بے مہر دنیا میں خوشیوں کے مواقع کم اور غم زیادہ ہیں۔ سوچنے کی بات تو مگر یہ ہے کہ کیا ہر نئے غم ، ہر نئی بلا، ہر نئی آفت نے صرف مسلمانوں کے گھر دیکھ لیے ہیں۔ ہر روز صبح اپنے جلو میں ایک نئی قیامت لیے طلوع ہوتی ہے، اور یوں لگتا ہے کہ یہ ساری قیامتیں مسلم امہ پر ہی اترتی ہیں۔ کس کس کا دکھڑا رویا جائے، شام ہو یا مصر دونوں ممالک میں درندگی و بہیمیت کے ریکارڈ بنائے جا رہے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ دونوں ممالک کی افواج ظلم و بربریت میں ایک دوسرے سے مقابلے میں ہیں۔ نہتے مرد و خواتین ہی نہیں بلکہ معصوم بچے بھی زندہ جلائے جا رہے ہیں۔آج کل انٹرنیٹ پر ان مظالم کی منہ بولتی ایسی ایسی انسانیت سوز تصویریں اور ویڈیوز آ رہی ہیں کہ پتھر دل آدمی بھی برداشت نہ کرسکے، مگر انسانی حقوق اور جانوروں کے حقوق کے چیمپئن رسمی مذمت کے سوا کچھ نہیں کر رہے۔ شام میں اسدی فوج کے ہاتھوں درندگی کے ہزاروں واقعات میں سے صرف دو خبریں ملاحظہ فرمایئے۔ ایک کا تعلق شام کے نواحی شہر حمص سے ہے جس کا شامی فوج نے پچھلے ایک سال سے محاصرہ کیا ہوا ہے

۔ فوج کی فائرنگ سے روزانہ بیسیوں شہادتیں اپنی جگہ لیکن خبر کے مطابق صرف بھوک سے وہاں روزانہ کئی افراد شہید ہو رہے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ مقامی علماء نے اس اضطراری حالت میں بلی اور دوسرے حرام جانوروں کا گوشت کھانے کی اجازت دے دی ہے ! درندگی کا دوسرا مظہر دو دن پہلے واقع ہوا جس نے یقیناً ابلیس کو بھی شرمندہ کر دیا ہوگا۔ دو دن پہلے فوج نے عام مسلمانوں پر مہلک گیس کا کیمیائی حملہ کیا جس نے آنِ واحد میں ہزاروں عام شہریوں کو شہید اور زخمی کر دیا۔ ان شہید اور زخمی ہونے والوں میں بڑی تعداد معصوم بچوں اور خواتین کی تھی۔ اس واقعہ کی تفصیلات اتنی دردناک تھیں کہ اگر قیامت کا ایک دن متعین نہ ہوتا تو ضرور آسمان پھٹ پڑتا۔ اسلام میں نوحہ اور سینہ کوبی کی اجازت ہوتی تو حق تھا کہ مسلمان اس بہیمیت پر اپنے سینے فگار کر لیتے۔ العربیہ نیوز ایجنسی کی جاری کردہ ایک ویڈیو میں اس زہریلی گیس سے متاثرہ معصوم بچوں کو دکھایا گیا ہے جو بری طرح تڑپ رہے ہیں اور تڑپتے تڑپتے جان دے رہے ہیں۔ اس دلخراش ویڈیو کو دیکھ کر کوئی سخت سے سخت دل شخص بھی اپنے ہوش میں نہیں رہ سکتا۔

مصر میں جنرل سیسی اور اس کی فوج بھی بشارالاسدی فوج سے کسی طرح پیچھے نہیں۔ قاہرہ کے میدان رابعہ العدویہ اور نہضہ اسکوائر میں خون کی ندیاں بہانے کے بعد اب فرعون کی وارث مصری فوج نے فرعون کے نام سے موسوم ساحة

رمسیس (رمسیس اسکوائر) میں بھی ربّ موسیٰ اور اس کے دین کی حقانیت پر ایمان رکھنے والوں کو خون میں نہلانا شروع کر دیا ہے۔ عرب اسرائیل جنگ میں بدترین اور شرم ناک شکست اٹھانے والی فوج نہتے مرد، عورتوں اور بچوں کو بلا تخصیص مار رہی ہے۔ پچھلے ہفتے ایک ایک دن میں ایک سے تین ہزار تک لوگوں کو شہید کیا گیا ہے۔ اخوان کے 38 قیدی زندہ جلائے گئے، 300 سے زائد معصوم بچوں اور عفت مآب خواتین کو خیموں میں زندہ جلادیا گیا۔ یہ وہ مقتول تھے جن کے ہاتھ میں اسلحہ تو کیا ایک پتھر بھی نہیں تھا، انھوں نے مساجد میں پناہ لے رکھی تھی لیکن لگتا ہے کہ سیسی بھی ”پرویزی“ جنون میں مبتلا ہو گیا ہے کہ نہ اسے تباہ ہوتی مساجد نظر آ رہی ہیں نہ قرآن کریم کے جلتے نسخے۔

بیسویں صدی معلوم تاریخ میں خونریزی اور قتل و غارت کی صدی کے نام سے جانی جاتی ہے، جس میں دو عالمی جنگیں انسانیت نے بھگتیں، ان جنگوں میں بلا مبالغہ کروڑوں انسان بلاقصور قتل ہوئے، اسی صدی میں ویت نام کی جنگ میں امریکیوں کے ہاتھوں لاکھوں ویت نامی مارے گئے، اسی صدی میں جاپانیوں پر ایٹم بم برسایا گیا اور لاکھوں جیتے جاگتے انسان یک لخت سوختہ ہو گئے، اسی صدی میں برصغیر کی تقسیم کے وقت لاکھوں انسانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی، اسی صدی میں سوویت یونین کے افغانستان پر حملے کے بعد لاکھوں مسلمان شہید ہوئے، ان تمام خونی واقعات کی وجہ سے بیسویں صدی کو تاریخ کی سب سے خونی صدی کہا

گیا لیکن .... اکیسویں صدی کے صرف تیرہ سالوں میں اچھی طرح واضح ہو گیا ہے کہ آنے والا مورخ رواں صدی کی خونریزی کے سامنے بیسویں صدی کے انتشار اور فساد کو کچھ اہمیت نہ دے گا۔فرق صرف یہ پڑا ہے کہ جنگیں اور انتشار اب مغرب سے مشرق منتقل ہو گیا ہے اور مشرق میں بھی خاص مسلم ممالک میں ....آپ دیکھیے، پاکستان میں روز بروز خراب ہوتے ہوئے حالات ہوں یا تباہ حال افغانستان اور عراق ہوں، تیونس، لیبیا، الجزائر اور یمن کے جلتے در و دیوار ہوں ہو یا برما میں مسلمانوں کا قتل عام اور اب شام و مصر، صرف اسلامی دنیا میں بیسیوں آتش فشاں ہیں جو خون اگل رہے ہیں۔۔برما میں ہزاروں مسلمانوں کا قتل عام ہوا، عالمی ضمیر خاموش رہا، مصر اور شام میں اس وقت فوج کے ہاتھوں نہتے شہریوں پر بدترین درندگی کے مظاہر عام ہیں مگر اقوام متحدہ سمیت کسی عالمی فورم پر اس مسئلے کے حل کے لیے کچھ نہیں کیا جا رہا۔ مغرب کو تو چھوڑیے خود ہماری بے حسی کا یہ عالم ہے کہ یوں لگتا ہے کہ ہم نے ان مظلوموں کو جانوروں سے بھی کسی نچلی سطح پر سمجھ لیا ہے۔ترکی کے علاوہ کسی مسلم ملک نے رسماً بھی اس فرعونیت کی مذمت نہیں کی جو اس وقت مصر و شام میں رقصاں ہے۔ پاکستان میں بھی یہ بے حسی عام ہے۔آپ کسی سے بات کیجیے، آپ کو ان مظلوموں کے لیے کوئی پریشان نظر نہیں آئے گا جب کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور ارشاد کا مفہوم یہ ہے کہ تمام مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں، ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارے جسم کو تکلیف ہوتی ہے، لیکن ہم نے شاید کشمیری

مسلمانوں کو تو مسلمان سمجھ لیا ہے کہ ان کے دکھ میں شریک ہوتے ہیں لیکن باقی مسلم دنیا میں کیا ہو رہا ہے، ہماری بلا سے!

ہمارا میڈیا بھی ظاہری بات ہے وہی دکھائے گا جو عوام کو پسند ہو۔ برطانیہ کے تیسرے ولی عہد کی ولادت تو خیر پرانے آقاؤں کی نمک خواری میں بڑی خبر سہی، لیکن شاہ رخ کی نئی فلم کی کامیابی، حتیٰ کہ ایک امریکی اداکارہ کی پالتو بلی کی موت بھی میڈیا کے نزدیک بڑی خبر بن جاتی ہے۔ بے شک ہمارے میڈیا میں چند آوازیں ہیں جو شام و مصر کے مظلوموں کا نوحہ پڑھ رہی ہیں، لیکن ان کی دبی دبی آوازیں نقار خانے میں طوطی کی آواز سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتیں۔ اس کے برعکس مغرب کے چند انصاف پسند صحافی اس ظلم و بربریت کے خلاف نہایت قوت سے اور تواتر سے آواز اٹھا رہے ہیں اور ان کی آواز پوری دنیا کے عوام میں سنی بھی جا رہی ہے۔ ان میں سب سے نمایاں رابرٹ فسک ہیں جو ایک نامور برطانوی جریدے "دی انڈی پینڈینٹ" کے نمائندے ہیں۔

انہوں نے خود مصر جا کر مصری عوام پر ہونے والے ظلم کا مشاہدہ کیا اور پھر اپنے اخبار کے لیے ایک معرکتہ الآرا مضمون لکھا ہے۔ وہ مصر کی حالیہ بغاوت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ شاید دنیا کی واحد "فوجی بغاوت" ہے جو امریکا کے نزدیک فوجی بغاوت نہیں۔ وہ اپنے اس مضمون میں لکھتے ہیں کہ کیا اب بھی مغرب مسلمانوں سے یہ امید لگائے گا کہ وہ مسلح مزاحمت کے بجائے بیلٹ بکس کے ذریعے تبدیلی

لائیں۔اس نے لکھا ہے کہ القاعدہ کی بنیاد چند سابق ناراض اخوانیوں نے ہی رکھی تھی جنھوں نے ہر حال میں پرامن رہنے کی پالیسی سے مایوس ہو کر القاعدہ بنائی اور پوری دنیا کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ اخوان المسلمون تو مسلمانوں کی وہ عالمی جماعت ہے جس نے کبھی کسی حال ہیں بھی اسلحہ نہیں اٹھایا لیکن اگر جمہوریت کے علمبرداروں نے ان پر جمہوریت کا راستہ بند کر دیا تو پھر کب تک کروڑوں اخوان کارکن خود کو القاعدہ کے راستے پر چلنے سے روک سکیں گے، کب تک؟؟

کیا ریاض الرحمٰن ساغر کے الفاظ میں ہم یہی حسرت لیے اس دنیا سے چلے جائیں گے؟

جانے کب ہوں گے کم اس دنیا کے غم

جینے والوں پے سدا بے جرم وخطا

کیوں توڑے جاتے ہیں ستم

جانے کب ہوں گے کم اس دنیا کے غم

تھری ایڈیٹس نہیں تھری جینئس

پچھلے سال ہندی فلم تھری ایڈیٹس بہت مقبول ہوئی۔ ہم نے صرف اس کی کہانی پڑھی ہے جو بھارتی مصنف چیتن بھگت کے ناول 'فائیو پوائنٹ سم ون' سے ماخوذ تھی۔ کہانی انجینئرنگ کالج کے تین شوخ مگر حساس طلبا کے گرد گھومتی ہے۔ ہمارا آج کا موضوع مگر یہ تین احمق ہرگز نہیں بلکہ اس کے برعکس تین جینئس ہیں جو پاکستان کے دل' شہر زرنگار کراچی سے تعلق رکھتے ہیں اور اپنے اپنے شعبے میں ماہر ڈاکٹر ہیں۔ گزشتہ کئی برس سے ان تینوں حضرات سے ہم الگ الگ حوالوں سے واقفیت رکھتے ہیں، کسی سے کم، کسی سے زیادہ۔ان تینوں ڈاکٹر صاحبان میں ایک قدرِ مشترک تو ہمیں پہلے ہی معلوم تھی، جو آپ تعارف میں پڑھ ہی لیں گے لیکن پچھلے مہینے ہم نے اتفاق سے ان تینوں حضرات کے درمیان جو بظاہر اجنبی اور اپنے اپنے دائروں میں مصروف عمل ہیں،ایک اور قدرِ مشترک دریافت کر لی، جو اس کالم کے لکھنے کا باعث بنی،اس کا ذکر لیکن آخر میں....

ان تین میں سے پہلے صاحب کراچی ہی نہیں بلکہ پاکستان کی معروف شخصیت ہیں۔ ہم نے ان کی تصویر تو پندرہ سال پہلے ہی دیکھ لی تھی،.بردبار سا سوچتا ہوا

چہرہ اور کنپٹیوں پر سفید بال، لیکن حضرت سے بالمشافہ ملاقات ہوئی پچھلے سال ایک پریس کانفرنس میں۔ ہم ان کے چہرے سے زیادہ ان کے نام سے متاثر تھے، جو دراصل برصغیر کی ایک تاریخی عسکری شخصیت کے نام پر ہے اور جو بچپن ہی سے ہماری پسندیدہ شخصیات میں شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے پہلے ہم نے کسی اور کا یہ نام نہیں سنا تھا، اس لیے کچھ مرعوب سے ہو گئے۔ اب آپ پیچ و تاب نہ کھایئے، نام پڑھیے، ان کا نام ہے جناب شیر شاہ سید صاحب جو احباب میں 'ڈیڈی' کے نام سے بھی مشہور ہیں۔ آپ پاکستان کے چند گنے چنے مرد گائنولوجسٹ میں سے ایک ہیں اور اپنی فیلڈ میں طویل ملکی و بین الاقوامی تجربہ رکھتے ہیں۔ آپ سوسائٹی آف آبسٹیٹریشن اینڈ گائنالوجسٹ کے کے جنرل (PMA) صدر ہیں اور طویل عرصے تک پاکستان میڈیکل ایسوسی ایشن سیکریٹری بھی رہے ہیں ۔ خواتین کی صحت خصوصاً ماؤں کی صحت کے حوالے سے آپ کا کئی دہائیوں پر مبنی رضاکارانہ کام تعارف کا محتاج نہیں۔ آپ کی ذاتی توجہ اور محنت کی وجہ سے کئی بین الاقوامی صحی و تعلیمی رفاعی تنظیموں کے تعاون سے خواتین کی صحت اور تعلیم کے مختلف پروگرامز پاکستان ہیں شروع ہوئے۔ اس کے علاوہ آپ اور آپ کے بڑے بھائیوں (ڈاکٹر ٹیپو سلطان، ڈاکٹر سراج الدولہ) واحباب کے ذاتی سرمائے کے تحت ایک بہت بڑا اور اچھا رفاہی کام کوہی گوٹھ وومن ہسپتال کی شکل میں (جو ملیر کراچی میں ہے) وجود میں آیا، جہاں فسٹیولا (یہ ماں بننے کے دوران لاحق ہونے والی ایک پیچیدہ بیماری ہے) کے آپریشن کے ساتھ عورتوں کے ہر قسم کے

امراض کا بالکل مفت علاج ہوتا ہے۔ یہ تو ہوا ڈاکٹر شیر شاہ کی شخصیت کا ایک رخ جو بے شک بے حد تاباں ہے، لیکن ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کا ایک اور رخ بھی ہے، جو خود اپنی جگہ بہت معتبر ہے۔ یہ روشن رخ ایک ادیب کا ہے۔ جی ہاں ڈاکٹر شیر شاہ کا نام میڈیکل کے طلباء کے ساتھ اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے بھی اجنبی نہیں۔ آپ کی شارٹ اسٹوریز پندرہ بیس سالوں سے باقاعدگی سے چھپ رہی ہیں جو اب کتابی شکل میں کئی مجموعوں میں شایع ہو چکی ہیں۔ آپ کی مخصوص فیلڈ اور سوچ کی وجہ سے آپ کی کہانیوں کے موضوعات بھی عموماً خواتین کے مسائل رہے۔ خواتین کی صحت، ان کی تعلیم، ان کے بنیادی انسانی حقوق، گھریلو تشدد، ان کی آبروریزی جیسے موضوعات پر آپ نے نہایت دردانگیز کہانیاں لکھیں، جن کے خوبصورت اسلوب کی وجہ سے صرف عام قاری ہی نہیں بلکہ 'خواص' بھی متاثر ہوئے اور یوں اس میدان میں بھی آپ کو ہر دلعزیزی حاصل ہوئی۔ آپ کی حالیہ کتاب "وہ صورت گر کچھ خوابوں کا" جو آپ کے وقیع والد ابو ظفر مرحوم کے حالاتِ زندگی پر مشتمل حوصلے اور عزم کی ایک غیر معمولی کہانی ہے، ایک نہایت پر اثر کتاب ہے جو بلا مبالغہ فکشن سے زیادہ دلچسپ اور خصوصاً تعلیم کے حوالے سے ذہن و دل کے دریچوں کو وا کر دیتی ہے (اس کتاب کے بارے میں تفصیلی کلام ان شاء اللہ اگلے کالم میں)۔

تین میں سے دوسرے صاحب بھی پاکستان کی معروف شخصیت ہیں۔ آپ کی اسپیشلائزیشن

کا شعبہ مائیکرو بیالوجی ہے اور آپ ڈاؤ ڈائیگنوسٹک اینڈ ریسرچ لیبارٹری کے ڈائریکٹر ہیں۔اس کے علاوہ آپ انفیکشن کنٹرول سوسائٹی پاکستان (ICSP) کے صدر بھی ہیں جو عوام الناس میں متعدی بیماریوں کی روک تھام اور ان سے بچاؤ کی آگہی پیدا کرنے کے لیے پاکستان کے چند نہایت معتبر ناموں میں سے ایک نام ہے۔ہم باقی دونوں ممدوحین کی نسبت اِن سے زیادہ واقف ہیں اور پچھلے چار سالوں سے آپ سے ملاقات کا شرف حاصل کر رہے ہیں۔آپ کا اسم گرامی رفیق خانانی ہے۔ڈاکٹر خانانی صاحب کی اپنی فیلڈ میں کامیابی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں۔آپ ہی وہ پہلے پاکستانی ڈاکٹر ہیں جنھوں نے پاکستان میں ایڈز جیسے غارت گر مرض میں مبتلا پہلا مریض تشخیص کیا۔مختلف جان لیوا جراثیم کے خلاف آپ کی جدوجہد محتاجِ بیان نہیں۔متعدی بیماریوں جنسکے ذریعے پھیلنے والے انفیکشنز)کی STI's(انفیکشنز) مثلاً ایڈز،ہیپاٹائٹس اور) روک تھام اور علاج کے لیے آپ کئی رفاہی پروگرامز کی سرپرستی فرمارہے ہیں۔ان تمام قابل تعریف سرگرمیوں کے ساتھ آپ کی شخصیت کا بھی ایک اور پہلو ہے، جو اپنی جگہ اتنا ہی اہم ہے۔جی ہاں ساری زندگی جراثیموں کے خلاف کام کرنے والے ڈاکٹر صاحب اپنے آپ کو ادبی جرثوموں سے نہیں بچاسکے۔ڈاکٹر شیر شاہ سید صاحب کی طرح آپ بھی میڈیکل کی لائن کے ساتھ ساتھ لکھنے لکھانے سے شغف رکھے ہوئے ہیں۔گو آپ کی لائن فکشن نہیں ہے، لیکن آپ اکثر معروف اخبارات کے سنڈے میگزین میں طب و صحت سے متعلق مضامین لکھتے رہتے ہیں۔اس کے علاوہ آپ کراچی سے ایک ماہنامہ

جہانِ صحت" بھی شایع کرتے ہیں، جو پچھلے تیرہ سالوں سے باقاعدگی سے شایع ہو رہا" ہے۔ آپ اس مشہور ماہنامے کے چیف ایڈیٹر ہیں۔

اب ہم تیسرے ڈاکٹر صاحب کا تعارف کرواتے ہیں۔ اُن کی ہم نے کبھی زیارت نہیں کی، لیکن پچھلے تین سالوں سے وہ باقاعدگی سے روزانہ ہمیں ایک خوبصورت شعر' شاعر کے نام کے ساتھ ایس ایم ایس کرتے ہیں۔ ان سے کئی بار فون پر بھی بات ہوئی ہے اور ہم نے ان کے شفیق لہجے سے اپنے تصور میں بڑی" بزرگانہ "سی تصویر بنا لی ہے، ان کا نام ڈاکٹر اقبال ہاشمانی ہے۔ ڈاکٹر صاحب پچھلے تیس سالوں سے کراچی کے علاقے رام سوامی گارڈن یں کلینک کرتے ہیں، اور علاقے کے مشہور معالجوں میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ بھی پیشہ ڈاکٹری کے ساتھ عشقِ ادب میں گرفتار ہیں۔ آپ کا قلمی میدان پہلے دونوں حضرات سے جدا ہے، گو آپ افسانے بھی لکھتے رہے ہیں، لیکن آپ کا اصل رجحان طنز و مزاح ہے، جو بلاشبہ نہایت مشکل ادبی صنف ہے۔ اس صنف میں پہلے آپ کی دو کتابیں "مجبوریاں" اور "مزید مجبوریاں" کے عنوان سے شایع ہو کر قبول خاص و عام حاصل کر چکی ہیں، اور اب شگفتہ شہ پاروں سے مزین تازہ ترین تصنیف "ڈاکٹر آن لائن" کے نام سے پچھلے مہینے ہی شایع ہوئی ہے۔

یہ ہیں وہ" تھری جینئس" جن کے درمیان ایک قدرِ مشترک تو یہی تھی کہ تینوں

حضرات آلاتِ ڈاکٹری کے ساتھ قلم و قرطاس کو بھی دوست رکھتے ہیں، جب کہ دوسری قدرِ مشترک جو ہمیں پچھلے ماہ معلوم ہوئی، یہ ہے کہ تینوں حضرات نہ صرف ڈاؤ میڈیکل کالج سے سند یافتہ ہیں بلکہ کلاس فیلو بھی ہیں!! 1979ء میں تینوں حضرات ڈاؤ سے فارغ ہوئے اور اب اپنے اپنے دائرہ عمل میں مصروف ہیں۔ اللہ ہمارے تینوں ممدوحین کو خوش رکھے۔

ابھی تو میں جوان ہوں

"انکل ! ذرا سائیڈ پر ہو جائیں ...."

ہم نے 'ذرا' سائیڈ پر ہوتے ہوئے مخاطب کی طرف دیکھا تو خون کھول اٹھا۔ پچاس کے سن کے آس پاس وہ صاحب خود ہمارے 'انکل' بننے کے مستحق تھے۔ بے شک انہوں نے جوان نظر آنے کے لیے ہزار جتن کر رکھے تھے مگر ہر طرح کے رنگ و روغن کے باوجود دیوار کی بوسیدگی اِدھر اُدھر سے جھلکی پڑتی تھی۔ ان کے نیلے رخسار بتا رہے تھے کہ بہت گہرائی میں رگڑ رگڑ کر شیو بنائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ بالوں کا غیر فطری' انتہائی 'سیاہ رنگ اور چہرے پر پھیلی آڑی ترچھی لکیریں.... ہم نے فوراً غالب سے معذرت کی اور زیر لب کہا

یہ بڑھاپا ہے یا معصوم بچے کی ہنسی

جو روکے نہ رکے اور چھپائے نہ چھپے

ہم سنجیدگی سے سوچنے لگے کہ کہیں ہماری جوانی کو چپکے چپکے گھن تو نہیں لگ رہا کہ اکثر بابے بھی ہمیں انکل کہنے لگے ہیں ! مگر پھر یہ کہہ کر اپنے دل کو تسلی دی کہ چونکہ ہم کلین شیو نہیں ہیں، ہم مروجہ فیشن کے مطابق فیشل اور بلیچ بھی نہیں کرواتے اور "نزلے' اور 'دھوپ' کے بد اثرات کی وجہ سے

سچی مچی) ہمارے لاکھوں میں سے پندرہ بیس بال بھی سفید ہو چلے ہیں، اس لیے ہمیں) !! (انکل کے مرتبے پر فائز کر دیا جاتا ہے (شکر ہے کوئی ماموں نہیں بناتا

تھوڑی دیر بعد ہی ہمیں بدلہ لینے کا موقع مل گیا۔ ہمارے سامنے والی سیٹ پر سے ایک صاحب اپنا اسٹاپ آنے پر کھڑے ہوئے تو ہم نے آس پاس کسی بزرگ کو دیکھا، ان صاحب کے علاوہ سب کڑیل جوان تھے۔ پہلے تو ہم نے خود بیٹھنے کا ارادہ کیا، پھر خیال آیا کہ یہ مناسب نہیں ہوگا، صاحب اپنا بڑا پن کتنا بھی چھپائیں، ہیں تو بڑے، اس لیے ان کو ہی سیٹ آفر کرنی چاہیے۔ ہم نے اپنی خدا ترسی میں کچھ شرارت کی بھی ملاوٹ کی اور "....کہا: "انکل ! آپ بیٹھ جائیں

اور ہماری حیرت کی انتہا نہیں رہی کہ اس وقت انہوں نے نہ انکل کہنے پر کچھ برا منایا اور نہ تکلفاً ہی سیٹ پر بیٹھنے سے منع کیا۔ 'شکریہ بھائی' کہا اور بیٹھ گئے۔ واہ یعنی جب چاہیں آپ 'ابھی تو میں جوان ہوں' کے مصداق اپنے سے دس بیس سال چھوٹوں کو انکل کہیں اور جب مخصوص بزرگوں والی سہولیات اور احترام حاصل کرنا ہو تو بڑے بن جائیں۔ خیر یہ ہمارے کراچی کا ایک خاص اسٹائل بن چکا ہے۔ یہاں آپ کو کوئی بھی، کبھی بھی انکل یا 'ماموں' بنا سکتا ہے، البتہ دونوں میں سے کون سا خطاب آپ کو کب دیا جائے گا یہ حالات اور موقع

محل پر منحصر ہوتا ہے۔

عمر گزرنے کے ساتھ بچپن کا جوانی میں اور جوانی کا بڑھاپے میں تبدیل ہونا ایک ابدی حقیقت ہے کہ یہاں صرف ثبات تغیر کو ہی ہے۔ اگر آپ کو خوش قسمتی سے عمر کی پونجی زیادہ ملی ہے تو جوانی ضرور جا کر رہے گی اور بڑھاپا ضرور آ کر رہے گا۔ ہاں البتہ فی زمانہ بے شمار ایسے حیلے ضرور ایجاد ہو چکے ہیں جو آپ کے بڑھاپے کو ذرا موخر کر سکتے ہیں یا کچھ عرصہ چھپا سکتے ہیں۔ کاسمیٹکس کی اربوں ڈالر کی بین الاقوامی صنعت میں بڑھاپے کو روکنے یا چھپانے کے طریقوں کے لیے ایک الگ شعبہ قائم ہے۔ اس مقصد کے لیے کاسمیٹکس بھی ہیں اور دوائیں بھی، جن کے انتہائی ضمنی اثرات کے باوجود دنیا بھر کے فیشن زدہ متمول بڈھے بڈھیاں اپنی عمر بھر کی کمائی ان چیزوں پر خرچ کر کے گزری جوانی کو آواز دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر صرف ایک دوا بوٹوکس کو لے لیجیے جس کا استعمال چہرے کی جھریاں مٹانے کے لیے روز بروز بڑھ رہا ہے۔ یہ دوا دراصل 'بوٹولینم ٹاکسن' نامی زہر ہے جسے دنیا میں دریافت ہونے والا سب سے زہریلا اور مہنگا مادہ قرار دیا گیا ہے۔ ماہرین کے دعوے کے مطابق اس کے دو کلو گرام سے زمین پر انسان کی پوری آبادی ختم ہو سکتی ہے۔ اس زہر کی انتہائی قلیل مقدار کو انجکشن کے ذریعے جھریاں پیدا کرنے والے اعصاب میں داخل کیا جاتا ہے تا کہ یہ اعصاب تباہ ہو جائیں اور جلد جوان اور سبک نظر آئے۔ مگر

یہ طریقہ بے حد خطرناک ہے، اس میں 0.001 کی غلطی بھی بھیانک موت سے دوچار کر سکتی ہے مگر ہائے جوانی.... جوانی کی آس میں ہر خطرہ مول لیا جاتا ہے۔
خیر ہمیں کیا.... بڈھی گھوڑی ہو یا بڈھا گھوڑا، لال لگام لگانے سے نہ ہی لرزتے پیروں میں وہ جان آ سکتی ہے جو کبھی جوانی کے جوش میں زمین پر پٹخ کر مارے جاتے تھے اور نہ ہی آنکھوں کے وہ بجھتے دیے دوبارہ جگمگا سکتے ہیں، جو کبھی نرگس سے تشبیہ دیے جاتے تھے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جوانی میں آپ نے کیا کیا اور بڑھاپے میں آپ کتنے کارآمد ہیں؟ اپنے خاندان کے لیے اور اپنے معاشرے کے لیے!
پھر مغرب یاد آ گیا۔ مشہور ہے کہ وہاں بوڑھوں کے لیے اولڈ ہومز بنائے جاتے ہیں، جہاں وہ اپنے پیاروں کو یاد کرتے ہوئے زندگی کے بچے کھچے لمحات گزار دیتے ہیں، بے شک یہ حقیقت بھی ہے لیکن مغربی معاشرے میں بے شمار بوڑھے ایسے بھی ہیں، جن کا بڑھاپا انتہائی قابلِ رشک ہے اور جو اسی نوے سال کی عمر میں بھی معاشرے اور اپنے خاندان کے لیے نہایت کارآمد ہیں۔ یوں تو کئی مثالیں یہاں دی جا سکتی ہیں لیکن جگہ کی کمی کے باعث صرف ایک مثال کینیڈا کے شہر مسی ساگا کی نوے سالہ میئر ہیزل مکالین کی لیجیے۔ گھر گرہستی سے شہر گرہستی تک ان کی ایک کامیاب کہانی ہے۔
نوے سالہ یہ بزرگ خاتون مسلسل پچھلے بتیس

سال سے شہر مسی ساگا کی میئر ہیں۔ کسی زمانے میں مسی ساگا ٹورنٹو کے نواح میں محض ایک معمولی سا قصبہ تھا۔ اس بوڑھی عورت نے اپنی چالیس سالہ سیاست میں اس قصبے کو کینیڈا کے ٹاپ کے شہروں کے مقابل لا کھڑا کیا۔ مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ماضی قریب میں نوے فیصد ووٹوں سے منتخب ہوتی رہی ہیں۔ اس کے بہت سے حاسدین اس کی موت کا انتظار کرتے کرتے خود قبروں میں اتر گئے، لیکن بڑھیا ہے کہ وہیں کی وہیں ہے۔
اور مزے کی بات تو یہ ہے کہ صرف شہر ہی نہیں بچے اور پوتے بھی سنبھالتی ہے، گھر کا سودا سلف بھی لاتی ہے۔ استغناء کا یہ حال ہے کہ میئر ہونے کے باوجود ایک ڈرائیور بھی رکھنے کو تیار نہیں۔ ابھی چند برس پہلے ڈرائیونگ کرتے ہوئے حادثہ پیش آ گیا تو شہری انتظامیہ نے منتیں ترلے کرکے ایک ڈرائیور رکھوا دیا، ورنہ تو یہ خاتون اپنی کسی بھی ذمہ داری سے دستبردار ہونے کو تیار نہ تھی۔ مزید یہ کہ ایک ترقی یافتہ ملک کے ماڈرن شہر کی میئر ہونے کے باوجود ہیزل بہت سادگی پسند خاتون ہیں۔ ان کا چہرہ جھریوں سے بھرا ہوا ہے (آپ وکی پیڈیا پر ہیزل میکالین کو سرچ کرکے دیکھ لیں) مگر انہوں نے کبھی کاسمیٹک سرجری کے ذریعے انہیں چھپانے کی کوشش نہیں کی۔
دیکھا آپ نے؟ نوے سالہ عمر اور یہ کارکردگی! .... ہمارے ہاں بڑے بڑے تیس مار خاں اس عمر میں منجی پر لیٹے موت کو تک رہے ہوتے ہیں، بلکہ ساٹھ ستر

برس کی عمر میں ہی ان کے ہاتھ پیر کانپنے لگ جاتے ہیں، خدمت خلق تو بہت دور کی بات ہے۔ ان کے برعکس جو کچھ فیشن زدہ ماڈرن بوڑھے ہوتے ہیں ، وہ کریم پوڈر اور سرجری کے ذریعے جوانی کو لوٹانے کی کوشش میں مسخرے تو بن جاتے ہیں لیکن خاندانی اور معاشرتی سطح پر ان کی خدمات کچھ نہیں ہوتیں (خیال رہے یہ اکثریت کی بات ہے ورنہ استثنا تو بہر حال سب جگہ ہوتا ہے)۔ چلیں چھوڑیں چونکہ ہمارے بھی چند بال سفید ہو گئے ہیں (چاہے دھوپ میں ہی سفید ہوئے ہوں) اس لیے عمرِ رفتہ کو آواز دیتے ہوئے حفیظ جالندھری کے الفاظ گنگناتے ہیں، آپ بھی ہمارا ساتھ دیں

ہوا بھی خوش گوار ہے.... گلوں پہ بھی نکھار ہے

ترنمِ ہزار ہے.... بہارِ پُر بہار ہے

کہاں چلا ہے ساقیا.... اِدھر تو لوٹ، اِدھر تو آ

یہ کیا گماں ہے بد گماں.... سمجھ نہ مجھ کو ناتواں

خیالِ زہد ابھی کہاں.... نہیں نہیں ابھی نہیں

ابھی تو میں جوان ہوں!

روشنی کی رفتار سے تیز

پہلے روسی ادب کی ایک چھوٹی سی سائنسی حکایت پڑھ لیجیے۔ایک بار کا ذکر ہے کہ کہیں دور کسی سلطنت میں ایک بڑا ماہرِ فلکیات رہتا تھا۔ نام تھا اس کا اخمت ! کہا جاتا ہے کہ اخمت کے پاس کوئی ایسا سحر تھا کہ وہ آسمان کا کوئی بھی ستارہ صفحہ ہستی سے مٹا سکتا تھا، مگر ظاہر ہے کسی ہنگامی صورت حال میں۔ وقت کے بادشاہ نے جب اس بارے میں سنا تو اس نے حکم دیا کہ اخمت کو اس کے حضور میں پیش کیا جائے۔ اخمت کو دربار میں لایا گیا۔

"کیا تم ہی وہ ہو جس کے بارے میں افواہ مشہور ہے کہ وہ کسی طریقے سے کوئی بھی ستارہ ختم کر سکتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ...." بادشاہ نے آسمان پر چمکتے ہوئے ایک روشن ستارے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس ستارے کو ابھی اور اسی وقت ختم کر دو۔"

" سلطانِ معظم ! یہ محض افواہ نہیں ہے، میں واقعی خدا کے فضل سے ایسا کر سکتا ہوں، مگر.... مگر ظاہر کہ یہ انتہائی اقدام ہو گا، جو میں صرف اسی وقت

کروں گا جب کوئی ایمرجنسی ہو اور انسانوں کو اس کی اشد ضرورت ہو۔" اخمت نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا۔

کیا میری خواہش کسی بڑی ایمرجنسی سے کم ہے؟ ستارے کو اسی وقت گل کردو، ورنہ" تمہاری زندگی کا چراغ گل کر دیا جائے گا۔" کہنے کو اب باقی کیا رہ گیا تھا۔ اخمت نے کچھ چیزیں منگوائیں، کچھ دیر وہ چیزیں استعمال کیں اور پھر بادشاہ سلامت کو اطلاع دی۔

سب دانشوروں سے زیادہ ذہین اور ہمارے رہنما! ستارہ آپ کی خواہش کے مطابق ختم" کر دیا گیا ہے۔" بادشاہ سلامت نے اوپر نگاہ کی تو دیکھا، وہ ستارہ اپنی پہلے کی سی آب و تاب سے موجود تھا۔

ہوں تو تم عبرت ناک موت کے حقدار بدقسمت انسان! اپنے ہر دلعزیز بادشاہ سے" مذاق کرتے ہو.... خدمت گارو!" بادشاہ دھاڑا۔ "جہاں پناہ!" اخمت نے بادشاہ کے قدموں پر گر کر فریاد کی۔" میری بات تو سنیے! مجھے دو لفظوں میں اس کی وضاحت تو "کرنے دیجیے۔

"اب یہ وضاحت تم دوسری دنیا میں جا کر کرنا۔"

اخمت کا سر قلم کر دیا گیا اور اسے نیزے پر سجا کر فصیلِ شہر پر رکھ دیا گیا تا کہ دوسرے اخمتوں کو عبرت حاصل ہو۔ اس واقعہ کو سالوں گزر گئے۔ لوگ

رفتہ رفتہ یہ بات بھول گئے۔ سو سال گزرے پھر دو سو سال اور پھر بیالیس سال، چار دن، دو گھنٹے، سینتیس منٹ اور!

فلکیات کے ماہرین نے آسمان کی طرف دیکھا تو ان پر منکشف ہوا کہ وہ ستارہ وہاں نہیں تھا۔ دراصل اس ستارے کی روشنی کو، جو ایک عرصہ ہوا ختم کر دیا گیا تھا، زمین تک پہنچنے میں تین سو بیالیس سال، چار دن، دو گھنٹے اور سینتیس منٹ لگتے تھے!!

کئی سال پہلے پڑھی یہ سائنسی حکایت ہمیں روزنامہ ایکسپریس پی ڈاکٹر محمد طیب خان سنگھانوی صاحب کا کالم 'جہانِ سائنس میں جدید پیش رفت' پڑھ کر یاد آئی۔ انہوں نے کالم کے شروع ہی میں لکھا ہے کہ کائنات میں روشنی کی رفتار سے زیادہ کسی چیز کی رفتار نہیں یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار۔ اگر یہ بات علی الاطلاق کہی گئی تو ایک مسلمان کی حیثیت سے ہم اسے ہرگز قبول نہیں کر سکتے، کیوں کہ قرآن و حدیث میں بیان کردہ کئی واقعات مثلاً واقعہ معراج اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کا ایک پل میں عرش سے فرش تک آ جانا، ان واقعات سے تو دینی نقطہ نظر سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے امر سے فرشتوں اور جن کو اللہ چاہیں، ایسی رفتار حاصل ہو جاتی ہے کہ جس کا ہمارا محدود ذہن تصور بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن اگر صرف سائنس اور

مادی طور پر بھی یہ بات کہی جائے تو وہ بھی آج سے ڈھائی سال پہلے سرن لیبارٹری کے تجربے میں غلط ثابت ہو چکی ہے۔ دراصل فزکس کا یہ نظریہ کہ کائنات میں سب سے تیز رفتار روشنی ہے، پچھلی صدی کے معرکتہ الآرا نظریے خصوصی نظریہ اضافت اور عمومی نظریہ اضافت جنہیں آئن اسٹائن نے پیش کیا' سے اخذ ہے، جس پر جدید سائنس کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ مگر دو سال پہلے یورپی تحقیقاتی ادارے سرن کے ایک مہنگے ترین تحقیقی تجربے نے جو سوئٹزرلینڈ اور فرانس کی سرحد کے پاس جنیوا کے قریب ایک سرنگ میں کیا گیا، اس بات کو ثابت کر دیا ہے کہ ہگز بوسن پارٹیکل (نو دریافت شدہ کائنات کا سب سے چھوٹا ذرہ) نہ صرف روشنی کی رفتار سے کئی گنا زیادہ تیزی سے حرکت کرتا ہے بلکہ یہی وہ ذرہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے توانائی کے مادے میں تبدیل ہونے کا سبب بنایا ہے۔ یعنی سائنسدانوں کے مطابق اسی ذرہ کی وجہ سے کائنات اور خود ہم مجسم حالت میں نظر آ رہے ہیں کہ یہ سب کو جوڑے ہوئے ہے، ورنہ بس صرف توانائی ہی توانائی ہوتی اور مادہ موجود نہ ہوتا۔ دراصل 64ء سے پہلے تک سائنس دانوں کی اکثریت کا یہی خیال تھا کہ کائنات میں سب کچھ ایک خودکار طریقے سے ہو رہا ہے، نئے ستارے بن رہے ہیں، پرانے فنا ہو رہے ہیں، لیکن 64ء میں ماہر طبیعات ہگز بوسن نے کہا کہ کچھ بھی خود بخود نہیں ہو رہا۔ یہ سب کچھ ایک نادیدہ قوت کر رہی ہے۔ توانائی اس وقت تک مادے کی شکل اختیار نہیں کر سکتی جب تک اسے ایک نادیدہ قوت کی تائید حاصل نہ ہو۔ اس نامعلوم قوت کا نام ہگز کے نام پر

ہگز بوسن پڑ گیا۔ لیکن بعدازاں اسی موضوع پر ایک اور سائنس دان لیون لیڈر من کی کتاب 'گاڈ پارٹیکل' شائع ہونے پر ہگز بوسن کو گاڈ پارٹیکل یا خدائی صفات کا ذرہ کہا جانے لگا نعوذ باللہ۔ ہم بحیثیت مسلمان کہتے ہیں کہ یہ ذرہ فی نفسہ کچھ نہیں، البتہ اس ذرے کو اللہ تعالٰی کا وہ امر کہا جا سکتا ہے جو کائنات کی ہر چیز کو جوڑے ہوئے ہے اور جس کی رفتار خود قرآن حکیم میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ پلک جھپکنے میں پوری کائنات سے گزر جاتا ہے۔ چنانچہ سورہ قمر میں ارشاد باری تعالٰی کا مفہوم ہے: " اور ہمارا حکم ایسا ہے جیسے ایک پلک جھپک جانا" جبکہ آئن اسٹائن کے مطابق مادی شے کے سفر کرنے کی آخری حد روشنی کی رفتار ہے جو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے، جس کے عجز کی ایک ادنٰی مثال شروع میں دی گئی حکایت میں دی گئی کہ یہ کائنات اتنی بڑی ہے کہ ناقابل یقین فاصلوں پر موجود کچھ ستاروں کی روشنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہوئی ہم تک کروڑوں بلکہ اربوں نوری سالوں تک بھی پہنچتی ہے۔ یعنی رات میں ہم کسی ستارے کو دیکھتے ہیں تو دراصل ہم اس کے ماضی کو دیکھ رہے ہوتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ وہ اس لمحے ختم ہو چکا ہو، لیکن اس کا مشاہدہ ہم اس وقت کر ہی نہیں سکتے۔

ہگز پارٹیکل کی دریافت اس صدی کی سب سے بڑی دریافت قرار دی جا رہی ہے۔ سرکردہ سائنس دانوں کے مطابق اس ذرے کی دریافت، انسان کا پہلی بار چاند پر قدم رکھنے یا الیکٹرون کی دریافت سے بھی کہیں زیادہ اہم ہے، اور اسی دریافت

پر اس تھیوری کو پیش کرنے اور پھر ثابت کرنے پر ہی سائنس دان ہگز بوسن جن کے نام پر ہی اس ذرہ کو موسوم کیا گیا ہے' کو طبیعات کا نوبل انعام دیا گیا ہے۔ اس تجربے سے بہرحال یہ ثابت ہوا کہ پچھلی صدی میں جدید سائنس کی بنیاد ٹیڑھی اینٹ پر رکھی گئی تھی۔ الحمدللہ اس تجربے سے ان لوگوں کی، جو ہر معجزے کی عقلی دلیل مانگتے ہیں، ایک خاص پہلو سے تشفی ہو گئی ہو گی۔ یوں تو یہ بات ہی غلط ہے کہ کسی بھی معجزے کو جو صحیح روایت سے ہم تک پہنچا، اسے سائنسی کسوٹی پر پرکھا جائے کیوں کہ محدود عقل اور علم سے ہم خدائی کاموں کی حقیقت اور ان کی حکمت کو سمجھ ہی نہیں سکتے لیکن اس تجربے سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہو گیا کہ کسی سائنسی نظریے پر ایمان لا کر اس کے خلاف ہر چیز کا ردّ کرتے چلے جانا ایک جاہلانہ بات ہے، کیوں کہ بالکل ضروری نہیں کہ وہ نظریہ آفاقی سچائی پر مبنی ہو۔ بالکل ممکن ہے کہ سائنس ہی اسے آنے والے کل میں مسترد کر دے کہ سائنس میں کچھ بھی حرفِ آخر نہیں ہے۔

تعلیم کے موضوع پر ایک علمی وفکری نشست

ہم کام میں مصروف تھے کہ موبائل کی گھنٹی بجی۔ کال ریسیو کی تو دوسری طرف سے نہایت شستہ لہجے میں ہمارا نام کنفرم کیا گیا۔ بات آگے بڑھی تو معلوم ہوا کہ اسلام آباد سے فون کیا جا رہا ہے۔ فون کرنے والے حسن صاحب تھے جو بہت اچھے انداز میں بتانے لگے کہ پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز (PIPS) اور" الف اعلان " کے تعاون سے پاکستان میں تعلیم کی صورتحال کو بہتر بنانے اور ملک میں تعلیمی بحران کے خاتمے کے لئے مذہبی رسائل وجرائد کے مدیران ، کالم نگارز اور اسکالرز کے ساتھ ایک روزہ علمی اور فکری نشست بعنوان" تعلیم کا بنیادی حق : مذہب اور آئین کے تناظر میں " کا اسلام آباد میں انعقاد کیا جا رہا ہے، جس میں شرکت کی آپ کو دعوت دی جا رہی ہے۔ آپ کنفرم کر دیجیے تاکہ سیٹ کا بندوبست کیا جا سکے۔ سن کر بے حد خوشی ہوئی کہ تعلیم جیسے انتہائی اہم اور بنیادی موضوع پر ملکی پیمانے پر غور وفکر کیا جا رہا ہے ،جس پر کسی بھی قوم کی روحانی و مادی ترقی کا انحصار ہوتا ہے۔

حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلمکے مطابق علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے ، گویہ فرضیت احکام شریعت کے جاننے سے متعلق ہے کہ ہر مسلمان کو

گھنٹوں میں ہر موقع اور ہر حال میں اللہ کا وہ حکم معلوم ہو جائے جو اس خاص 24 موقع پر اس کی طرف متوجہ ہے، لیکن فرضِ کفایہ کے طور پر عصری تقاضوں کے مطابق دنیاوی تعلیم بھی بطور مسلمان ایک نہایت اہم ضرورت ہے۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے مطابق علم کے دونوں شعبے علم الہدایہ (دین و شریعت کا علم) اور علم الاشیاء طب، فزکس، کیمیا اور حساب وغیرہ) دونوں ہی خلیفۃ الارض یعنی انسان کے لیے) ضروری تھے۔ خود خالقِ کائنات نے حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاء کے نام سکھا کر اسی بنا پر ان کی فضیلت فرشتوں سے زیادہ رکھی۔ گویا علم ہی حضرتِ انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی دلیل ہے۔ اسی کے ذریعے انسان ایمان و یقین کی دنیا آباد کرتا ہے بھٹکے ہوئے لوگوں کو سیدھا راستہ دکھاتا ہے، بروں کو اچھا بناتا ہے، دشمن کو دوست، بناتا ہے، بے گانوں کو اپنا بناتا ہے اور دنیا میں امن و امان کی فضا پیدا کرتا ہے۔ علم کی فضیلت و عظمت، ترغیب و تاکید مذہب اسلام میں جس بلیغ و دل آویز انداز میں پائی جاتی ہے اس کی نظیر اور کہیں نہیں ملتی، تعلیم و تربیت، درس و تدریس تو گویا اس دین برحق کا جزلاینفک ہے۔ کلام پاک کے تقریباً اٹھتر ہزار الفاظ میں سب سے پہلا لفظ جو پروردگار عالم جل شانہ نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر نازل فرمایا، وہ اِقرا ہے، یعنی پڑھ۔

تقریب کا آغاز محمد عامر رانا، ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس اسٹڈیز نے

اپنے گراں قدر خیالات پیش کرتے ہوئے کیا،انہوں نے اوران کے بعد مشرف زیدی، ڈائریکٹر الف اعلان تعلیمی مہم نے بھی یہ کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ تعلیم کو ہمارے سیاسی نظام کا حصہ بنا دیا جائے اور یہ کیسے ممکن ہے ؟ تعلیم کے معیار ہیں،اور تعلیمی نظام ہیں بہتری کے لئے ہمیں کیا اقدامات کرنے کی ضرورت ہے ؟اس سلسلے ہیں آپ حضرات سے رہنمائی لینا ضروری ہے۔ پروگرام کا مرکزی خیال یہ تھا کہ تعلیم کے حوالے کے بارے میں عوام و خواص میں ضروری آگہی A-سے آئین پاکستان کے آرٹیکل 25 اور شعور پیدا کیا جائے، جس کے تحت حکومت پر یہ لازم ہے کہ وہ 5 سال سے 16 سال کی عمر کے تمام بچوں کو مفت اور لازمی تعلیم فراہم کرے گی۔ پروگرام ہیں تعلیم کے مختلف پہلوؤں کو دو مرکزی موضوعات کے تحت زیر بحث لایا گیا۔ پہلی نشست جس کا موضوع تھا، ©ت تعلیم کا فروغ: آئینی تقاضے اور ہماری ذمہ داریاں" سے گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر نور احمد شاہتاز، ڈائریکٹر شیخ زید اسلامک سینٹر کراچی یونیورسٹی ومدیر الثقافۃ الاسلامیہ نے کہا کہ لوگوں کی اندر یہ شعور پیدا کیا جائے اور اس بات کو اجاگر کیا جائے کہ تعلیم کا مسئلہ بہت اہم مسئلہ ہے اور جو مفت تعلیم کی بات ہو رہی ہے اس کے لیے مستقل بنیاد پر آواز اٹھائی جائے۔ دینی صحافت کے فورم سے اور دینی حلقوں کی جانب سے، میڈیا کے ذریعے اور بالخصوص سیاستدان بھی اگر اس آواز میں شامل ہو جائیں تو بہت جلد ممکن ہے کہ ملک ہیں تعلیمی اصلاحات نافذ ہو جائیں۔ مقررین نے اس نشست میں گفتگو کرتے ہوئے تعلیمی پالیسی کے حوالے سے

صوبائی حکومتوں کے کردار کو غیر تسلی بخش قرار دیا اور مثال کے طور پر صرف ایک صوبہ پنجاب کے اسکولوں کا نقشہ پیش کرتے ہوئے بتاے اکہ اس وقت بھی صوبہ میں 80,000 سے زائد اسکول بغیر اساتذہ کے چل رہے ہیں۔ انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ میٹرک کی سطح تک تعلیمی نظام یکساں ہونا چاہیے۔ طارق محمود صاحب نے کہا کہ ملک میں طبقاتی نظام تعلیم کا خاتمہ کیا جائے، انگریزی ذریعہ تعلیم کو ختم کرکے اردو ذریعہ تعلیم بنایا جائے، قومی تعلیمی پالیسی مرتب کرنے کے لئے ایک اعلیٰ سطحی تعلیمی کمیشن بنایا جائے اور تعلیمی نظام سے وابستہ افراد پر چیک اینڈ بیلنس رکھا جائے۔

تقریب کی دوسری نشست کا عنوان "تعلیم کی اہمیت اور استاد کا مقام و کردار: دینی تعلیمات کی روشنی میں" تھا۔ مقررین نے مذہبی تعلیمات کی روشنی میں تعلیم کی اہمیت وضرورت اور استاد کے مقام و کردار پر اظہار خیال کیا کہ ایک استاد کو طلباء کی اس نہج پر تربیت کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ یہ جان سکیں کہ اپنی تعلیم کے ذریعے وہ معاشرے کی کیسے خدمت کر سکتے ہیں۔ نائب مدیر ماہنامہ الشریعہ نے اپنی تقریر میں اس بات پر زور دیا کہ اسلامک ذرائع ابلاغ اور مذہبی حلقوں کی طرف سے ایک تحریک شروع کرنے کی ضرورت ہے جو معاشرے میں انفرادی سطح پر تعلیم کے حصول کا شعور دلائے۔ انھوں نے تعلیم کے اہم مقاصد کے لئے اجتماعی مباحث اور مکالمہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ سیمینار کی آخری نشست میں مذکورہ نشستوں کے حوالے سے اور مجموعی تعلیمی نظام کی

بہتری کے لئے تجاویز و سفارشات بھی مرتب کی گئیں۔

یہ سیمینار تو ہو گیا لیکن اللہ کرے یہ صرف نشستند، گفتند، برخاستند تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر کچھ اس پر عملی کام بھی ہو سکے۔ یاد رہے کہ آئین کے تحت ہی نومبر 2012ء میں قومی اسمبلی سے ایک A-پاکستان کے اسی آرٹیکل 25 متفقہ بل منظور کیا گیا تھا جو گویا آرٹیکل کی یک سطری تحریر کی تفصیلی اور عملی شکل تھی۔ اس قانون کی رو سے بچوں کو اسکول نہ بھجوانے والے والدین کو پچیس ہزار جرمانہ اور تین ماہ قید بھی ہو سکتی ہے، اسی طرح بچوں کو ملازم رکھنے والے کو پچاس ہزار جرمانہ اور چھ ماہ تک قید کی سزا ہو سکتی ہے۔ مگر آج سال سے زیادہ ہو گیا، اس قانون کا عملی طور پر کہیں اجراء سننے میں نہیں آیا۔ ٹی وی پروگراموں میں گندے گھی اور مضرِ صحت کیچپ بنانے والوں کا تو پیچھا کیا جا رہا ہے اور روز ٹی وی پر عدالت سجائی جاتی ہے لیکن ان تمام جرائم کی بنیاد یعنی جاہلیت کے خاتمے کے لیے کوئی سنجیدہ پروگرام منعقد نہیں کیا جاتا، شاید اس لیے کہ ایسے سنجیدہ نوعیت کے پروگرامز ہمارے میڈیا کے ایجنڈے میں ہی شامل نہیں!

ہمارے نزدیک بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم اس وقت تک ایک پروپیگنڈے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی جب تک ہمارے ملک میں رائج دہرا نظامِ تعلیم مسلط ہے۔ اس وقت تعلیمی نظام کا سب سے بڑا مسئلہ اسکا کثیر رخی ہونا ہے۔ مدرسہ،

اردو میڈیم، انگلش میڈیم، آکسفورڈ، کیمبرج.... اور نتیجہ صفر! 9نومبر2009ء کو اعلان کردہ تعلیمی پالیسی یں بھی یہ طے کیا گیا تھا کہ ملک میں نہ صرف یکساں نظام تعلیم رائج کیا جائے گا بلکہ تعلیمی شعبے پر جی ڈی پی کا 7 فیصد خرچ کیا جائے گا مگر زمینی حقیقت یہ ہے کہ ہمارا تعلیمی شعبہ زوال کی ایک ایسی افسوسناک کہانی بن کر رہ گیا ہے جس میں سرکاری تعلیمی ادارے سیاسی تقرریوں اور بدعنوانیوں کے باعث اپنی افادیت کھو چکے ہیں۔اس کالم کے زریعے ہمارا حکومت سے مطالبہ ہے کہ اس کثیر رخی نظامِ تعلیم کو ختم کرکے سارے ملک میں ایک ایسے نظام تعلیم کا نفاذ قائم کریں، جو مفت بھی ہو، لازمی لیول تک جانے اور اعلیٰ ترین ڈگریوں تک A اور O بھی اور جو تمام طلباء کو بلاامتیاز پہنچنے کی سہولت فراہم کرے۔

آپ کے پانچ لاکھ نکلے ہیں

ابھی گھر سے قدم نکالا ہی تھا کہ بیگم کی آواز نے قدم جکڑ لیے۔"سنیے...."
"اف.... یہ عورتیں! گھنٹوں ان کی باتیں سنتے رہو، مگر گھر سے نکلتے نکلتے بھی انہیں ضرور کچھ یاد آ جاتا ہے۔"ہم زیر لب بڑبڑاتے واپس ہوئے۔ دیکھا تو ان کا موبائل گنگنا رہا تھا جسے وہ ہماری طرف بڑھا رہی تھیں اور ایسا تب ہوتا تھا جب کسی اجنبی نمبر سے کال آتی تھی۔ کیوں کہ اجنبی نمبر سے کال وصول کرنا ان کے لیے ایک بار بڑا پریشان کن مسئلہ ہو گیا تھا۔ بہر حال کال ریسیو کی تو دوسری طرف ایک صاحب تھے جو بڑے خوشگوار لہجے میں ہمارا نام کنفرم کر رہے تھے۔

"آپ محمد فیصل شہزاد صاحب بات کر رہے ہیں؟"

"جی....آپ کون؟" ہم نے جواب دیا۔

"فیصل صاحب! ہم زونگ سے بات کر رہے ہیں، زونگ انعامی قرعہ اندازی میں آپ کا پانچ لاکھ کا انعام نکلا ہے۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو، انعام وصول کرنے کے لیے آپ کو ہمارے اسی نمبر پر کال بیک کرنی ہو گی، آپ کو طریقہ تفصیل سے سمجھا دیا جائے گا۔"

یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب فراڈ ہے،ایک لمحے کے لیے تو دل کی دھڑکن تیز ہو ہی گئی۔آدمی بھی کتنا کمزور ہے اور بیٹھے بٹھائے ایک بڑی رقم کی نوید سننا خصوصاً اس شخص کے لیے تو بے حد خوشگوار احساس ہے جو دسمبر 2013ء کے پاکستان میں رہتا ہو، جہاں ٹماٹروں کی اوقات انار سے بڑھ گئی ہے اور آلو میاں سیب سے مہنگے ہو گئے ہیں۔ہم چند لمحے خاموش رہے،اس کی وجہ حیرت تھی کہ بے شک اس طرح کے میسج اور فون اب پرانا طریقہ ٔ واردات ہو گیا ہے لیکن اس شخص نے ہمارا نام کنفرم کیا تھا، جو واقعی بڑی اچنبھے کی بات تھی، اس لیے کہ صارفین سے متعلقہ معلومات تو کمپنی کے خفیہ ریکارڈ میں رہتا ہے جہاں تک ہر کس و نا کس کی رسائی نہیں ہوتی پھر اس فراڈیے کو کس طرح نام مل گیا؟وہ صاحب سمجھے کہ ہم اتنا بڑی خوشخبری سن کر ہوش کھو بیٹھے ہیں، اس لیے چہکتے ہوئے بولے:" سوچیے نہیں فیصل صاحب! جلدی سے ہمیں دوبارہ کال کیجیے، تاکہ آپ کو طریقہ بتایا جا سکے۔"

ہم نے سوچا کہ انعام نکلنے کی خبر ہمیں سنا رہا ہے مگر خوش خود ایسا ہو رہا ہے جیسے اس کی لاٹری نکلی ہو۔ ہم نے بڑے ادب سے کہا:"حضرت! ہمیں وہ انعام نہیں چاہیے، ہماری طرف سے وہ آپ رکھ لیجیے۔"

اب خاموش ہونے کی باری اس کی تھی۔ اگلے لمحے ہی کال منقطع ہو چکی تھی۔ بیگم

" نے 'انعام' کا لفظ سنا تو ان کے کان کھڑے ہو گئے۔" کیسا انعام؟ کس کا نکلا انعام؟
ہم نے بتایا کہ کم بخت کوئی دھوکے باز تھا، ہم نے اپنا انعام اسے دے دیا تو شاید اتنی سخاوت کا سن کر ہی بے ہوش ہو گیا اور فون کٹ گیا۔ کہنے لگیں: "کیا پتا واقعی کوئی انعام نکلا ہو ورنہ.... ورنہ وہ آپ کا نام کیوں لیتے؟"
جاگتے میں خواب مت دیکھا کرو نیک بخت! یہاں کوئی کسی کو اپنا بخار نہیں دیتا، جیب" میں چند سو روپے یار لوگوں سے برداشت نہیں ہوتے تو لاکھوں روپے ایسے ہی کون دے دے گا اور پھر یہ بھی تو دیکھو کہ ایک عام زونگ نمبر سے فون آیا تھا، اگر کمپنی سے ہوتا تو نمبر کے بجائے zong لکھا ہوا آتا۔ یہ سارے دھوکے باز ہیں، صبح سے شام تک لوگوں کو دھوکے دیتے ہیں اور دو چار بد قسمت بدھو ان کے ہتھے چڑھ بھی جاتے ہیں۔"
لیکن پھر آپ کا نام...." ان کی سوئی اسی پر اٹکی ہوئی تھی۔"
ہاں اس پر تو ہمیں بھی حیرت ہے، لیکن یہ ناممکن نہیں.... پچھلے دنوں خبر پڑھی تھی" کہ بڑے بڑے بینکوں کے ملازمین اپنے کھاتے داروں کی ذاتی معلومات بیچتے ہیں تو اسی طرح کسی نے یہ کام بھی کر لیا ہو گا، ویسے یہ ہے بڑی پریشان کن بات، زونگ والوں کو شکایت کرنی پڑے گی، اس لیے کہ ان کی بھی

ساکھ کا معاملہ ہے کہ ان کے نام سے ، انہی کے ایک نمبر سے لوگوں کا نام پوچھ کر دھوکا دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔"

عام لوگوں کو بغیر کسی محنت کے بیٹھے بٹھائے لاکھوں روپے کی کوئی لاٹری یا انعام کا مل جانا یورپ یا امریکا میں تو سنا ہے لیکن ہمارے ہاں صرف انعامی بانڈز ہی کے ذریعے لوگوں کے انعام نکلتے ہیں، باقی سب دھوکا ہے۔اور ان انعامی بانڈز میں بھی تمام فقہی مکاتب اور تمام مسالک کے نزدیک جوااور سود دونوں کا گناہ ہے۔ بہرحال آج سائنس و ٹیکنالوجی کی بدولت جس تیزی سے دنیا تبدیل ہو رہی ہے اور ذرائع مواصلات و کمیونیکشن میں ترقی ہو رہی ہے، اسی تناسب سے دھوکا دہی کے پرانے طریقوں کی جگہ تیزی سے نئے طریقے وجود میں آ رہے ہیں۔ اب نہ جیب کترے ہیں اور نہ ہی راہ چلتے ٹھگ، اب تو موبائل اور انٹرنیٹ ٹھگوں کے گروہ پیدا ہو گئے ہیں جو اس صفائی سے آپ کے جذبات سے کھیلتے ہوئے آپ کی جیب کاٹتے ہیں کہ ' الو ' بننے کا آخرتک احساس نہیں ہوتا۔ پچھلے چند ماہ میں ایسے چار پانچ واقعات ہمارے سننے اور دیکھنے میں آ گئے۔ لائنز ایریا کراچی میں ہمارے ہم زلف کے پڑوسیوں کے لٹنے کا قصہ تو ابھی پچھلے ماہ ہی کا ہے جب انہیں اسی طرح موبائل سے کال آئی اور غریب میاں بیوی اس دھوکے میں آ گئے۔ انہیں ایک نمبر پر کال کرنے کو کہا گیا اور پھر قصہ مختصر دونوں چار ہزار روپے سے محروم ہو گئے، جن میں سے پندرہ سو قرض لیا

گیا تھا۔ ایک اور وکھرا قصہ پچھلے ہفتے کا ہی ہے جب ہمارے دفتر کے ایک ساتھی کے آیا جس میں انہیں نام سے مخاطب کرتے ہوئے بتایا گیا تھا sms موبائل پر ایک میں آپ کا پچاس ہزار برطانوی پونڈز کا pepdra کمپیپسی کی انٹرنیشنل قرعہ اندازی انعام نکلا ہے۔ انعام حاصل کرنے کے لیے نیچے دیے گئے ای میل ایڈریس پر یہ نمبر لکھ لکھا pepdra@live.co.uk کر ایک جوابی میل کیجیے۔ نیچے ایک کوڈ نمبر اور ای میل ہوا تھا۔ فراڈ کا اندازہ ہونے کے باوجود چونکہ طریقہ نہ کار نیا تھا، پھر نام سے بھی مخاطب کیا گیا تھا، اس لیے پچاس ہزار پونڈ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگے۔ کیلکولیٹ کیا تو کروڑوں کا عدد دیکھ کر رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ کانپتے ہاتھوں سے ای میل کیا تو فوراً ہی ایک جوابی ای میل آ گئی جس میں نہایت متاثر کن انگریزی میں طویل مگر ایسے شاطرانہ انداز میں ہدایات دی گئی تھیں کہ جعل سازی کا مطلق شبہ نہ ہو۔ ہمیں دکھایا تو انہیں مفت کا مشورہ دیا کہ ہدایات پر بالکل عمل نہیں کرنا اور گوگل پر سرچ بھی کر لو، کیوں کہ اتنی بڑی ملٹی نیشنل کمپنی دنیا بھر میں موبائل قرعہ اندازی کے ذریعے اتنی بڑی رقم بانٹتی پھرے تو ضرور نیٹ پر بھی تفصیلات ہوں گی اور اگر دھوکا ہو گا جو کہ یقینا ہے تو وہ بھی سامنے آ جائے گا۔ وہی ہوا، گوگل پر سرچ کرنے کے بعد اگلے ہی لمحے سارا کچا چٹھا سامنے آ گیا۔ سینکڑوں پاکستانی نوجوانوں کو بالکل یہی پیغام ملا تھا جس کا ذکر انھوں نے نیٹ پر کیا تھا۔ دھوکا بالکل ظاہر تھا، کمپنی کو اچانک پاکستانیوں

سے ایسی کیا ہمدردی ہو گئی کہ پچاس ہزار برطانوی پونڈ سینکڑوں کی تعداد میں کراچی سے مردان تک لوگوں کو بانٹنے لگی۔ہم نے سوچا کہ واقعی جب تک اس دنیا میں حرص و حماقت باقی ہے اور جب تک احمقوں کے سر پر بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے راتوں رات دولت مند بننے کا بھوت سوار رہے گا، عیار اور شاطر کبھی بھوکے نہیں مر سکتے۔اب حکومت سے تو درخواست ہے کہ سائبر جرائم کی روک تھام کے لیے مناسب اقدامات کرے اور زونگ اور پیپسی جیسی بڑی کمپنیوں کو بھی چاہیے کہ جو ٹھگ ان کا نام لے کر لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں، ان کا سراغ لگائیں کہ یہ ان کی ساکھ کا معاملہ ہے۔

اچھا نصیحت نامہ ختم، اب ہمارا مطالبہ ہے کہ کم از کم ہمیں وہ پانچ لاکھ تو دے ہی دیے جائیں، جن کی نوید ہمیں سنائی گئی تھی، ہمیں ٹماٹر اور آلو لے کر اسٹاک کرنے ہیں، اس سے پہلے کہ یہ کم ظرف سبزیاں بالکل ہی اپنی اوقات بھول جائیں اور سونے چاندی کے بھاؤ تک آ جائیں!!

کیا پاکستان دورِ جدید کا اٹلانٹس بننے جا رہا ہے؟

مشہور فلسفی اور تاریخ داں افلاطون نے اپنی شہرہ آفاق کتاب 'History' میں ایک گمشدہ شہر 'اٹلانٹس' کے بارے میں لکھا، جس کی وجہ سے آج تک ماہرین آثاریات تحقیق میں مصروف ہیں۔ افلاطون نے لکھا کہ یہ گمشدہ شہر بحر اوقیانوس میں واقع بہاماز کے علاقے میں واقع ایک بہت بڑے جزیرے پر آباد تھا۔ اس جزیرے پر ایک عظیم الشان تہذیب قائم تھی اور یہاں کے لوگ انتہائی ترقی یافتہ تھے۔ بلکہ افلاطون اور اس نظریے پر کام کرنے والے ماہرین آثاریات کے مطابق انہوں نے سائنس و ٹیکنالوجی کے کچھ میدانوں میں ایسی ترقی اور کچھ ایسا عروج حاصل کر لیا تھا جس کا آج بھی سائنس دان خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ انہوں نے ناقابلِ یقین وزن کی چٹانوں کے ذریعے انتہائی اونچی اور نفیس عمارتیں بنا لی تھیں۔ انہوں نے شیشوں سے توانائی حاصل کرنے کا طریقہ بنا لیا تھا۔ ان کے مال بردار تجارتی بحری جہاز ساری دنیا میں جاتے تھے اور ان کا شہر سونے چاندی اور دوسری قیمتی اشیاء سے بھرے ہوئے تھے۔ پھر اچانک ان کے عروج کو زوال نے آ لیا اور ایسا سالوں اور مہینوں میں نہیں بلکہ دن کے ایک حصے میں ہو گیا۔ ان کی حیران کن ترقی اور عروج نے ہی ان کو کھا لیا اور وہ افسانوی شہر یوں غائب ہو گیا کہ آج تک سینکڑوں مہم جو تحقیق دانوں نے اس کی

باقیات کھوجنے میں اپنی زندگیاں صرف کر دیں مگر کوئی واضح نشان نہ مل سکا۔ ہوا یہ تھا کہ انہوں نے کرسٹلز کی توانائی سے سمندر میں سوئے ہوئے آتش فشاؤں کو چھیڑ دیا تھا، یوں آتش فشاں پھٹ پڑے جس سے شدید زلزلے اور اس کے نتیجے میں انتہائی شدید سونامی طوفان نے جنم لیا جس نے پورے جزیرے کو غرقاب کر دیا۔ بے شک یہ ایک روایت ہے لیکن افلاطون کے مقام اور اس کی علمیت کے پیش نظر دو ہزار سالوں میں کسی نے بھی اس روایت کو یکسر نہیں جھٹلایا، پھر گاہے گاہے اس روایت کے حق میں کئی ایسے ثبوت بھی ملتے رہے جس سے اس نظریے کو نئی زندگی ملتی رہی۔ بہرحال افلاطون کی کتاب کے بعد آج تک اس افسانوی شہر کو ادیبوں نے اپنے ناولوں میں زندہ رکھا اور ہالی ووڈ کی کئی مشہور سائنس فکشن فلمیں بھی 'اٹلانٹس' پر بنیں اور کامیاب ہوئیں۔

اٹلانٹس سٹی حقیقت میں تھا یا یہ افلاطون کے تخیل کا کرشمہ ہے، یہ الگ بات ہے لیکن اس الف لیلوی شہر کے قصے میں ایک سبق بہرحال پنہاں ہے اور وہ ہے انسان کا اپنے ہی ہاتھوں اپنی تباہی کا سامان کرنا۔ اٹلانٹین قوم کی تباہی میں تو بہرحال قدرت کا ایک قانون کارفرما تھا کہ ہر عروج کے بعد زوال ہے، اور اس کی مثالیں تاریخ میں بے شمار ہیں۔ اٹلانٹین کی بے پناہ ترقیبھی ان کے زوال کا باعث بن گئی تھی لیکن ملکِ عزیز پاکستان کا معاملہ عجیب تر ہے۔ ہم نے عروج تو کیا دیکھنا تھا، اس کے ہجے بھی صحیح سے نہیں آتے لیکن کسی قابل

ہوئے بغیر خاکم بدہن یوں لگ رہا ہے کہ الٹی گنتی شروع ہو گئی ہے۔ یہ ملک خود اپنے ہی باسیوں کے ہاتھوں تباہ ہوتا جا رہا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ اٹلانٹین دن کے ایک حصے میں اچانک برباد ہوئے اور ہم دھیرے دھیرے کسی گلیشیر کی طرح پگھل رہے ہیں۔ ہمارے نیچے سے زمین آہستہ آہستہ کھسک رہی ہے۔ ایک کے بعد ایک سانحہ۔ 47ء کے بعد صرف تیئس سال کے بعد 71ء میں لاکھوں مسلمانوں کی قربانیوں کے پھل اس ملک کو دو لخت کر دیا گیا اور گویا دو قومی نظریے کو بنگال کے میدانوں میں شکست دے دی گئی، ایسی شرمناک شکست کہ نوے ہزار فوجی دشمن کی قید میں چلے گئے۔ لیکن ہم پھر بھی 'ہم زندہ قوم ہیں' کے گیت گاتے رہے۔ ہم 65ء کی جنگ کے ولولہ انگیز ترانے اپنے بچوں کو یاد کراتے رہے لیکن انہیں کبھی 71ء کے شرمناک المیے سے روشناس نہیں کرایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بچے آج جب بڑے ہو کر مختلف شعبوں میں گئے ہیں تو اپنی ذہن سازی کے مطابق صرف بڑی بڑی بڑھکیں مارتے ہیں اور عمل تو دور کی بات ہے، کسی بڑے خطرے کو محسوس کرنے کی بھی گویا اہلیت ہی نہیں رکھتے۔ ہمارے خلاف دشمنوں کی ہمہ گیر جارحیت اپنا دائرہ وسیع کرتی جا رہی ہے اور ہم نان ایشوز میں الجھے ہوئے ہیں۔ خود مختاری کس چڑیا کا نام ہے، ہم بھول چکے ہیں۔ خود مختار قوم کیا ہوتی ہے، مارشل جزائر اس کی بہترین مثال ہے۔ مارشل جزائر 1991ء میں امریکی تسلط سے آزاد ہوا۔ یہ جزائر پر مشتمل ملک دنیا کے ان ممالک میں شامل ہے جن کے پاس کوئی فوج نہیں مگر اس غیور قوم نے آزادی کے فوراً بعد امریکا پر اپنے علاقے

میں جوہری آلودگی پھیلانے کے الزام میں (یہ جوہری تجربات امریکا نے پچاس کی دہائی میں کیے تھے) دو بلین ڈالرز کا ہرجانہ طلب کیا اور پھر 183 ملین ڈالرز وصول بھی کیے، یوں یہ چھوٹا سا ملک امریکا سے ہرجانہ وصول کرنے والا دنیا کا پہلا ملک بن گیا۔ اور بھی دنیا میں کئی ایسے ممالک ہیں جن کے پاس نہ تو ایٹم بم ہیں، نہ بہترین میزائل، ان کے پاس نہ ہی پاکستانی فوج جیسی صلاحیتیں رکھنے والی فوج ہے لیکن ایک چیز ان کے پاس ایسی ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی ایک انچ زمین کی پائمالی پر اور اپنی عزت نفس پر ذرا سی آنچ آنے پر وقت کے سپرپاور کو بھی آنکھیں دکھادیتے ہیں اور وہ چیز ہے غیرت! بے شک غیرت ہی ایسی چیز ہے جو کسی فرد یا قوم کو دنیا میں عزت دے سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اب کوئی یہ کہے کہ میں خود بڑھکیں مارنے جارہا ہوں اور 'زمینی حقائق' سے منہ پھیر کر قوم کو امریکا سے ٹکر لینے کے لیے تیار کررہا ہوں۔ ایسا نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ عرض کررہا ہوں کہ آج ملک کو درپیش تمام مسائل کا حل ایک دو ٹوک انکار" میں ہے۔ امریکا کو انکار۔ مشرف کی طرح ایک کال پر لبیک کہنے والا طرز عمل" ہمیں چھوڑ کر تمام سیاسی جماعتوں کو پوری سنجیدگی سے ایک مضبوط لائحہ عمل اور ایک جامع منصوبہ بندی بنانی پڑے گی اور امریکا کے معاملے میں ایک دو ٹوک رویہ اپنانا ہوگا۔ ہمارے شہری علاقے ہوں، نیم قبائلی علاقے ہوں یا قبائلی۔ سب ہمارا ہے، اور اس کے ایک ایک انچ

کے حوالے سے ہمیں نہایت حساسیت کا پیغام امریکا کو دینا ہو گا ورنہ یہ جنگ آہستہ آہستہ اپنا دائرہ وسیع کرتے کرتے لاہور اور کراچی تک بھی آ سکتی ہے۔اور اگر کچھ دانشور آپ کو یہ فرماتے نظر آئیں کہ امریکا کو واضح انکار ہمیں پتھر کے دور میں پہنچا دے گا، تو یقین جانیے ایسا کچھ نہیں ہو گا۔ہماری پارلیمنٹ آج ساری دنیا کو یہ پیغام پہنچا دے کہ نہ تو ہم آج کے بعد کسی کے بھی معاملے میں تھانے دار بنیں گے اور نہ ہی کسی کو اپنے معاملات میں تھانے دار بننے دیں گے تو یقین کیجیے پوری دنیا میں پاکستان کی خود مختاری اور عزت نفس کے حوالے سے ایک بے حد مثبت پیغام پہنچے گا اور یقینا ہم عالمی طور پر اپنے آپ کو تنہا نہیں پائیں گے۔آپ نے دیکھا نہیں کہ ابھی کچھ دن پہلے کیسے چین جیسے طاقتور ملک اور برازیل اور وینزویلا جیسے امریکا کے پڑوسیوں نے امریکی ڈرون حملوں پر کیسی تنقید کی تھی۔ ایسی تنقید کی جرات تو کبھی ہمیں اور یمن کو بھی نصیب نہیں ہوئی جو خود براہِ راست ڈرون کے ڈسے ہوئے ہیں۔تو اے میرے ملک کے حکمرانو! ایک بار غیرت مندانہ فیصلہ کر لو، یقینا پاکستان کی تاریخ میں تمہارا نام سنہرے حرف میں لکھا جائے گا ورنہ اللہ نہ کرے وہ وقت دور نہیں نظر آتا جب یہ ملک بنگال کی طرح، بلوچستان، وزیرستان اور خیبر پختون خواہ میں بٹ کر اٹلانٹس کی طرح معدوم ہو جائے گا۔

پیپتے کے پتے.... تحقیق کی ضرورت

"آپ کی بلڈ رپورٹ میں کچھ مسئلہ ہے۔ ہیموگلوبین بھی کم ہے اور پلیٹ لیٹس بھی کم آئے ہیں، کیا آپ کو پچھلے دنوں میں کوئی انفیکشن ہوا تھا؟" گائنی ڈاکٹر نے اہلیہ سے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا اور تشویش سے پوچھا:

"کوئی مسئلہ تو نہیں ڈاکٹر صاحبہ!"

"نہیں ابھی ہمارے پاس وقت ہے، لیکن پلیٹ لیٹس میں کمی سمجھ میں نہیں آ رہی، آپ ایک ٹیسٹ آغا خان لیب سے کروالیں تاکہ کنفرم ہو جائے، پھر دیکھتے ہیں۔"

گائنی ڈاکٹر کے سنجیدہ لہجے نے اہلیہ محترمہ کو ڈرا دیا۔ وہ معائنہ روم سے باہر آئیں تو چہرہ پیلا ہو رہا تھا۔ ہم جو اتنی دیر سے بچے سنبھال رہے تھے، انہیں دیکھ کر ڈر گئے۔ "کیا ہوا؟"

انہوں نے نسوانی جبلت کے تحت بڑے مبالغہ آمیز انداز میں کہا: "خون میں بہوووت کمی بتائی ہے اور پلیٹ لیٹس بھی بہوووت ہی کم ہیں!" ہم اس بہوووت

سے بخوبی آگاہ تھے لیکن اپنی عادت سے بھی مجبور تھے، فوراً پریشان ہو گئے۔

اب بیگم عادت کے مطابق ساری ٹینشن ہمیں دے کر خود گویا بے غم ہو گئی تھیں۔ ملا کی دوڑ جیسے مسجد تک، اسی طرح ہماری دوڑ ایسے معاملات میں مشورے کے لیے پروفیسر ہاشمی صاحب کی طرف ہوتی ہے جو لیاقت نیشنل میڈیکل کالج میں مائیکرو بیالوجی کے سینئر پروفیسر بھی ہیں اور ہماری رائے میں کئی آن پریکٹس ڈاکٹرز سے زیادہ معلومات رکھتے ہیں اور بہت اچھا مشورہ بھی مفت میں دے دیتے ہیں۔

انہوں نے بلڈ رپورٹ دیکھی تو کہا: "نہیں میں نہیں سمجھتا کہ کوئی گھبراہٹ کی بات ہے۔ پلیٹ لیٹس کمی کی طرف مائل ہیں لیکن بہت زیادہ کم نہیں۔ اچھی خوراک سے ان شاء اللہ مسئلہ حل ہو جائے گا، ہو سکتا ہے کہ فولک ایسڈ کی کمی ہو۔ آپ ایسا کریں کہ پپیتے کا پتا لیں اور خوب اچھی طرح صاف کرکے اس کا عرق نچوڑ لیں اور تھوڑا سا پلائیں، اس سے ان شاء اللہ پلیٹ لیٹس بڑھ کر نارمل ہو جائیں گے۔"

ہم حیرت سے ان کا بردبار چہرہ تکتے رہ گئے۔ پچھلے دو تین سالوں میں جب سے پاکستان میں ڈینگی نامی بلا کا ظہور ہوا ہے، ہم کئی بار احباب سے سن بھی

چکے ہیں اورایک دو جگہ اس پر پڑھ بھی چکے ہیں کہ ڈینگی کے مریضوں میں چوں کہ خون میں پلیٹ لیٹس کی تعداد بہت تیزی سے کم ہوتی ہے ، یہاں تک کہ مرض کی زیادہ شدت میں جب خون میں پلیٹ لیٹس بہت کم رہ جاتے ہیں توجریانِ خون بھی ہونے لگتا ہے، تو ایسی ایمرجنسی میں پپیتے کے پتے کا عرق بہترین ہے، جس سے پلیٹ لیٹس میں تیزی سے اضافہ ہوتا ہے۔ہم نے ہمیشہ اس بات کو ایک چلتی ہوئی بات سمجھا تھا۔ عوام میں عموماً ایسی باتیں مشہور ہو ہی جاتی ہیں۔ اس ٹوٹکے پر ہم نے کبھی کسی ڈاکٹر تو کیا کسی حکیم کا مضمون بھی نہیں پڑھا تھا، اس لیے کبھی اسے سنجیدہ نہیں لیا لیکن اب اس "عوامی" نسخے کا ہاشمی صاحب جیسے معروضی شخص مشورہ دے رہے ہیں ، تو یہ واقعی حیرت کی بات تھی۔

انھوں نے ہماری حیرت بھانپتے ہوئے کہا۔ "حیرت کی بات نہیں، یہ واقعی اس مقصد کے لیے بہت سود مند ہے۔"

آپ کیسے کہہ رہے ہیں، مطلب آپ نے کہیں پڑھا ہے یا کوئی مشاہدہ وغیرہ ہوا ہے؟""

ہم نے پوچھا تو انھوں نے تائید میں سر ہلایا۔

کوئی انٹرنیشنل تحقیق تو اس ضمن میں نہیں دیکھی لیکن خود میرے والد محترم کو پچھلے" تین سال سے یہ عارضہ ہے کہ ان کے پلیٹ لیٹس کم ہو جاتے ہیں، یہاں

تک کہ کئی بار انہیں ہسپتال ایڈمٹ بھی کروانا پڑا۔ یہ چیز سنی تو سوچا، تجربہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، پپیتہ ایک بے شمار فائدے رکھنے والا پھل ہے، اس کے پتے کے تھوڑے سے عرق سے اگر فائدہ نہیں ہو گا تو نقصان بھی نہیں ہوگا، بس یہی سوچ کر استعمال کروایا اور نتیجہ انتہائی حیرت انگیز نکلا۔ والد محترم کو دن میں ایک سے دو چمچ یہ عرق پلانے کے بعد بغیر کسی اور علاج کے پلیٹ لیٹس میں تیزی سے اضافہ ہوا اور یہ بات لیب ٹیسٹ سے ثابت ہوئی۔ اب تین سال سے ہم ایسی ایمرجنسی میں یہ نسخہ استعمال کرواتے ہیں اور ہمیشہ فائدہ ہوتا ہے۔"

ان کی بات سن کر ہمیں حیرت ہوئی۔ "اوہ یہ تو بہت آسان ٹوٹکا ہے۔ بہت سستا، قدرتی اور پھر ایک عام ملنے والی چیز ہے.... لیکن جناب! اس حوالے سے تو سائنسی بنیادوں پر تحقیق ہونی چاہیے۔ رضاکاروں کے مختلف گروپوں پر جو جنس اور عمر کے اعتبار سے تقسیم ہوں، اس عرق کا تجربہ ہونا چاہیے اور پھر نتائج کو کسی عالمی معیاری ہیلتھ میگزین میں شایع کروانا چاہیے تاکہ نہ صرف اس پر مزید تحقیق ہو کر دنیا بھر کے لوگ فائدہ اٹھا سکیں، بلکہ پاکستان کی نیک نامی میں بھی اضافہ ہو۔"

آپ کے جذبات قابل قدر ہیں، ایسا بالکل ہونا چاہیے لیکن بات وہی ہے کہ کرے"

کون؟ ہمارے ہاں پہلے تو کچھ خاص تحقیقی ادارے نہیں ہیں، اور جو ہیں، وہ نہ جانے کیا کر رہے ہیں، ان کا کام کسی میدان میں نظر نہیں آتا۔"

ہم پروفیسر صاحب کے پاس سے چلے آئے اور پھر نہ صرف بیگم صاحبہ، بلکہ اگلے چند مہینوں میں یکے بعد دیگرے دو بھائیوں کو بھی پلیٹ لیٹس کم ہونے کی شکایت میں یہ عرق تھوڑی مقدار میں استعمال کروایا تو نتائج حسب منشا نکلے۔ سوچا کہ پروفیسر صاحب کی تصدیق اور اپنے تجربے کو قارئین سے بھی شیئر کریں۔ بس یہی سوچ کر کالم لکھ دیا.... باقی شفا دینے والا تو صرف اللہ ہے!

انسانوں کی اکثریت فطری طور پر ماضی پسند واقع ہوئی ہے.... خصوصاً جب ہاتھ پیروں میں رعشہ آ جائے، نظر چندھیانے لگے اور آدمی کو بھائی یا چچا سے بابا جی کہہ کر پکارا جانے لگے تو گزرا زمانہ شدت سے یاد آنے لگتا ہے، خصوصیت سے شباب کا زمانہ، جب جوانی کا خمار کسی پل چین نہیں لینے دیتا، جب رگوں میں خون نہیں بجلی دوڑتی محسوس ہوتی ہے، اور حوصلوں کا یہ حال ہوتا ہے کہ آسمان کے ستارے سچ مچ اپنی دسترس میں محسوس ہوتے ہیں.... آپ نے بھی مشاہدہ کیا ہوگا.... آپ کے گھر میں کوئی بزرگ دادا، دادی.... نانا، نانی یا چلیں اماں جان یا ابا حضور ہی کو لے لیجیے، آپ جب کبھی ان کے پاس بیٹھیں، آپ نوٹ کریں گے کہ بات کوئی بھی چل رہی ہو، وہ اس کا سرا پکڑ کر ماضی میں لے جائیں گے.... ماضی.... پیارا ماضی.... وہ سنہرا وقت جب بقول اُن کے سب لوگ خوشیوں کے ہنڈولے پر جھولتے تھے.... جب آٹا، دالیں اور چاول ٹکے سیر ملا کرتے تھے.... جب محبت تھی، دیدوں میں مروت تھی اور پڑوسیوں میں ماں جایوں جیسی چاہتیں تھیں اور جب جب.... یہ بہت سارے 'جب' بیان کرتے ہوئے ان کے دمکتے پر جوش چہروں کو دیکھا کیجیے.... وہاں انوکھے رنگ جھلملاتے آپ کو نظر آئیں گے.... وقتِ پیری شباب کی باتیں کرتے ہوئے ان کی جھریوں بھرے

پپوٹوں سے جھانکتی زمانہ شناس آنکھیں خواب ناک ہو جائیں گی....اس وقت ان کی نگاہیں ماضی میں جھانک رہی ہوتی ہیں، گویا ان کا بچپن اور جوانی مجسم ان کے سامنے آ گئے ہوں....آواز میں چمک، لہجے میں لچک.... خوشی اور حسرت کا ملا جلا امتزاج ! ہائے واقعی یہ ماضی بھی عجیب ہے.... ہر ایک کو اپنا 'دور' ہی اچھا لگتا ہے.... لیکن آپ ذرا غور کیجیے کہ بے شک ہمارے بزرگوں کا دور آج کے اعتبار سے مثالی تھا.... لیکن کیا اس وقت خونریزی نہیں ہوتی تھی؟.... کیا جنگ عظیم اول دوم ماضی کی جنگیں نہیں؟.... کیا تقسیم کے وقت کی سفاکیت اور درندگی ہمارے بزرگوں کا ماضی نہیں؟.... اگر چیزیں سستی تھیں تو آمدنی بھی تو کم تھی ! .... ہمارا یہ مطلب نہیں کہ 'گزرا ہوا کل' اور ہمارا 'آج' اقدار اور امن و امان کے حوالے سے برابر ہیں.... نہیں ' آج دنیا زیادہ بری ہو گئی ہے.... دنیا والے زیادہ ظالم اور مادہ پرست ہو گئے ہیں، لیکن یہ کوئی انہونی نہیں تکوینی بات ہے.... ہمارے بزرگوں کا دور اور اُن کے بزرگوں کا دور بھی تو برابر نہیں ہوں گے.... اُن کے بزرگ ان کے سامنے اپنے 'دور' کو یاد کر کے سرد آہیں بھرتے ہوں گے....ایسا تو شروع سے ہے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے .... صحابہ فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے فوراً بعد ہم نے تغیر محسوس کیا.... ہماری وہ حالت نہیں رہی، جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تھی.... پھر جیسے جیسے دنیا حضور صلی اللہ علیہ

وسلم کے مبارک عہد سے دور ہوتی گئی، ویسے ویسے ہر شعبہ انحطاط کا شکار ہوتا چلا گیا.... نہ پہلے کے سے نفوس رہے، نہ ان کے سے کردار و عمل.... بہر حال ہم موضوع سے بھٹک گئے، بات ہو رہی تھی کہ انسان جبلی طور پر ماضی پسند ہوتا ہے....اور ہم تو شروع ہی سے کچھ بنیاد پرست اور قدامت پسند واقع ہوئے ہیں....ابھی باباجی بننے کا مرحلہ بہت دور ہے لیکن اکثر 'گزرا' وقت بہت یاد آتا ہے.... کاموں کا ہجوم جب سر پر سوار ہوتا ہے، فکروں اور پریشانیوں کے اژدھام میں جب دل گھبرا جاتا ہے تو ایسے میں بے اختیار اپنے بچپن اور لڑکپن کا پیارا دور نگاہوں میں گھوم جاتا ہے، جب کوئی فکر نہ تھی.... اپنے شہر کی گلیاں.... اپنا اسکول، اساتذہ اور دوست یاد آتے چلے جاتے ہیں....اور دل ہمک ہمک کر اس چاند کی خواہش کرتا ہے جو آسمان کی وسعتوں میں نہیں بلکہ صرف چار گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے....جی کرتا ہے کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کچھ دن کے لیے اپنے شہر کا رخ کیا جائے.... لیکن کتنی ذمہ داریاں ہیں، جو قدم جکڑلیتی ہیں.... دفتر کا کام....گھر کا انتظام.... بیگم اور بچے.... لیکن اس بار جب ہم ایک تھکا دینے والی مصروفیت سے کچھ فارغ ہوئے اور ایک پیغام موصول ہوا کہ بچپن کے دوست سب اکٹھے ہو رہے ہیں.... اسکول کا چکر لگانے کا بھی پروگرام ہے تو ہم نے ساری رسیاں توڑیں اور دو دن کا پروگرام بنا ہی لیا.... سوچا بچوں کو بھی لے جائیں اور ٹرین سے جایا جائے تاکہ اس سے پہلے کہ خدانخواستہ پاکستان میں ٹرینیں بند ہی ہو

جائیں، ان کا شوق پورا ہو جائے.... لیکن افسوس یہ ممکن نہ ہو سکا.... بہر حال ہم نے خود ہی اندرونِ سندھ 'ٹنڈو آدم' کی راہ لی.... چار گھنٹے میں بس نے ہمیں پہنچا دیا! اگلے دو دن ہم عادت سے مجبور ہو کر اپنا اور اپنے شہر کا تجزیہ کرتے رہے.... سچی بات یہ ہے کہ جہاں دوستوں سے مل کر انمول خوشی نصیب ہوئی.... ماضی کے پر لطف قصے، شرارتیں، قہقہے اور مسکراہٹوں نے دل و دماغ کو فریش کر دیا.... وہیں ایک پہلو سے دل اداس بھی ہو گیا.... ہمارے ننھے سے پیارے شہر میں بھی 'بڑے' شہر وں والے سارے 'نخرے' آ گئے تھے۔ وہی پراپرٹی کی باتیں.... وہی اونچی اونچی عمارتیں، جن کی آسمان کو چھوتی قیمتوں کا بڑے شہروں سے فخریہ موازنہ کرتے چھلکتے لب اور چمکتی آنکھیں.... وہی نفسا نفسی اور بدامنی.... اسکول کا حال دیکھ کر تو دل بہت برا ہوا.... ایک کھنڈر سامنے تھا.... تجاوزات کی وجہ سے سڑکیں گلیاں بن گئی تھیں اور گلیاں ابلتے جوہڑ.... ہمیں لگا، جو سوچا تھا غلط تھا، کیسا بچپن، کیسا لڑکپن!.... سب ان عمارتوں کے جنگل میں گم ہو گیا.... ہم جس خوبصورت ماضی کو کھوجنے آئے تھے.... وہ تو جدیدیت میں کہیں تحلیل ہو گیا.... بس خوشی و غم کے ملے جلے جذبات لیے ہم لوٹ کر اپنے کراچی آئے.... اب تو بس یہی اپنا شہر ہے!.... شہر غریباں.... ایشیا کا گیٹ وے.... شہر زر نگار.... عروس البلاد اور روشنیوں کا

شہر ....جو اب 'لاشوں کا شہر بن گیا ہے ! جس دن ہم آئے اسی دن لیاری میں گینگ وار میں ایک دن میں خواتین اور بچوں سمیت بارہ نفوس جاں بحق ہو گئے.... معلوم ہوا کہ لیاری کے ڈیڑھ لاکھ مکیں نقل مکانی پر مجبور ہو گئے ہیں....نہ جانے کب لیاری والوں کے درد کا درماں کیا جائے گا؟ کب ان کی جان و مال، عزت و آبرو کی حفاظت کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل تیار کیا جائے گا؟ اللہ سب کی جان و مال ، عزت آبرو اور ایمان کی حفاظت فرمائے اور ہم سب کو اپنی اقدار اور روایات کی حفاظت کرنے کی بھی توفیق عطا فرمائے!

بہادری کیا ہے؟

آج کل ہماری طبیعتیں کچھ اس قسم کی بن گئیں ہیں کہ ہم تدبیر اور منصوبہ بندی سے کام نہیں کرتے۔زیادہ تر لوگ تو کچھ کرتے ہی نہیں ،زندگی کا کوئی مقصد سامنے نہیں ہوتا۔ظاہر ہے دو وقت کی روٹی کمانا، کھانا پینا اور سو جانا تو کوئی زندگی نہیں ۔یہ معمولات تو حیوان بھی انجام دیتے ہیں۔پھر ان میں اور انسان میں فرق ہی کیا ہوا۔انسان تو وہی ہے جو زندگی کے مقصد کو پہچانے اور اس کے لیے کوشش کرے۔الحمدللہ بہت سے گھرانوں میں بہت سے مسلمان مرد اور خواتین میں اس مقصد کا احساس موجود ہے مگر ایک کمی بہت زیادہ محسوس ہوتی ہے وہ یہ کہ ہمارے کاموں میں جوش زیادہ ہوتا ہے ، ہوش کم۔ہم تدبیر اور منصوبہ بندی کو شجاعت اور بہادری کے خلاف سمجھتے ہیں ۔خالی پیلی جوش کو اصل ہمت اور بہادری سمجھتے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کبھی کسی پر برس پڑے۔ کبھی ناراض ہو گئے، دو چار جلی کٹی سنادیں، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس ماحول میں جو دینی کام ہونے کا امکان تھا وہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔اگر ایسے میں کوئی مصلحت بینی کا مشورہ دیتا ہے تو ہمارا جواب ہوتا ہے کہ واہ جی ہم کوئی بزدل تھوڑا ہی ہیں جو کسی کا لحاظ کریں۔

میرا خیال ہے ہمیں شیر کی مثال سے سبق لینا چاہیے۔شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔بہادری میں اس کی مثال دی جاتی ہے۔مگر کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ وہ اندھادھند کسی پر حملہ کردے۔شکار سے پہلے وہ شکار کو تاکتا ہے اور ٹھیک ٹھاک منصوبہ بندی کے ساتھ شکار کرتا ہے۔یہی اصل بہادری ہے کہ حالات کے تقاضے اور ضرورت کے ساتھ اپنے وسائل طاقت اور موقع محل کو دیکھ بھال کر کوئی اقدام کیا جائے۔خالی جوش کا تو صرف نقصان ہوتا ہے۔اگر جوش دکھانا ہی بہادری ہے تو سب سے زیادہ جوش خود کشی کرنے والوں پر طاری ہوتا ہے،اسی جوش میں وہ اپنی جان لے لیتے ہیں۔مگر اسے کوئی بھی بہادری نہیں کہتا۔اسے سب بزدلی اور حماقت مانتے ہیں۔شریعت نے بھی اس سے منع کیا ہے کہ یہ اللہ کی دی ہوئی نعمتِ حیات کی ناقدری ہے۔اگر وہی شخص خود کشی کی بجائے اپنی ذمہ داری کو سمجھ کر اللہ پر بھروسہ کرکے تدبیر کے ساتھ کوشش میں لگا رہتا تو چاہے اچھا فوراً نہ ملتا مگر اس کا کردار ضرور قابل تعریف ہوتا۔

شریعت ہم سے ایسا ہی کردار چاہتی ہے۔جس میں پختگی ہو،استقامت ہو،اللہ پر توکل ہو،تدبیر ، احتیاط اور منصوبہ بندی ہو۔مشورہ اور سوچ بچار ہو۔کام دین کا ہو یا دنیا کا،جو اس انداز میں درجہ بدرجہ آگے بڑھتا ہے وہ مضبوط بنیادیں رکھتا ہے اور سالہا سال تک پھل دیتا ہے۔دارالعلوم دیوبند کی مثال سامنے ہے۔اکابر نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد بہت غور و فکر کرکے بڑی منصوبہ بندی کے

ساتھ یہ ادارہ بنایا۔ رفتہ رفتہ یہ ادارہ برگ و بار لایا۔ آج ڈیڑھ صدی بعد دنیا کا شاید ہی کوئی کونہ ہو جہاں دیوبند کے فیض یافتگان دین کی آبیاری نہ کر رہے ہوں۔

مگر ان باتوں کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ آپ بزدلی اور کم ہمتی اختیار کریں۔ مصلحت بینی کا اس قدر شکار ہو جائیں کہ شریعت کے دائرے سے ہی باہر قدم رکھ دیں۔ نماز اس لیے ترک کر دیں کہ سردی ہے۔ روزہ اس لیے چھوڑ دیں کہ گرمی ہے۔ ہرگز نہیں۔ مقصد تو یہ ہے کہ دین پر پختگی اور اللہ کے احکام پر عمل وقتی جوش و جذبے سے نہیں، مضبوط قوتِ ارادی کے ساتھ ہو۔ دین کی اشاعت و حفاظت کا کام مستقل بنیادوں پر تدریج کے ساتھ ہو۔ ہم یہ نہ سوچیں کہ ہمارا امتحان بس چند دنوں یا چند گھنٹوں کا ہے۔ نہیں بلکہ یہ عمر بھر کا امتحان ہے۔ باطل سے مقابلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے اور چلتا رہے گا۔ جب ہم سفر کی انتہاء پر نگاہ رکھیں گے تو پھر دیر تک چلنا آسان ہوگا۔ سفر ہمارے خیال میں چند گھنٹے کا ہو تو ہم ایک آدھ گھنٹے بعد ہی آرام کی ضرورت محسوس کریں گے۔ جن کا سفر طویل ہوتا ہے وہ ہمیشہ منصوبہ بندی کے ساتھ چلتے ہیں۔ سواری کو تیار کرتے ہیں۔ سیٹیں بک کراتے ہیں۔ راستے کی چھوٹی موٹی تکالیف کی پروا نہیں کرتے۔ جلدی جلدی آرام کے لیے نہیں بیٹھ جاتے۔ یہ زندگی اور ہماری دینی و دنیوی ذمہ داریاں ایک سفر ہی تو ہیں۔ اس کو پورے استقلال اور تدبیر سے قطع کریں۔ اللہ ہماری مدد فرمائے۔

ایک گھنٹہ ہونے کو آیا تھا لیکن اُن کے گھر کا کوئی سراغ مل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ دو ہفتے پہلے جب ایک پرانے سالخوردہ ادبی رسالے میں اُن کے بارے میں یہ پڑھا کہ پاکستان ہجرت کے بعد وہ ناظم آباد نمبر ۴ کے ایک مکان میں رہائش پذیر ہوئے تھے تو انوکھی مسرت کا احساس ہوا۔ یعنی جس سحر کار کے سحر میں ہم پچھلے پندرہ سال سے گرفتار تھے ، وہ تو ہمارے گھر کے آس پاس ہی کسی گھر میں رہتے رہے ہیں ! معلوم ہوا تھا کہ 1987ء میں ان کے انتقال پر ناظم آباد نمبر ۴ کی ایک چھوٹی سی ذیلی سڑک ان کے نام سے موسوم کی گئی تھی، لیکن لوگ جانتے ہی نہیں تھے کہ ان کا گھر کون سا تھا، اور اب ہے بھی کہ نہیں ! گھر تو دور کی بات ، اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ ان کے نام تک سے بھی واقف نہ تھے کہ یہ شخص کون تھا جن کے نام سے ان کے گھر کی سڑک موسوم ہے ! کسی کا بھی کیا قصور، 1987ء میں جب ان کا انتقال ہوااور یہیں آس پاس کسی مکان سے ان کا جنازہ اٹھا (پاپوش کا قبرستان ان کا مدفن بنا) تواس وقت ہم خود فقط نو سال کے تھے اور ٹارزن اور عمرو عیار کے جادوئی قصوں سے دل بہلاتے تھے۔اتنے عرصے میں پوری ایک نسل جوان ہو کر ادھیڑ عمری کی طرف بڑھ گئی اور کیسی نسل؟ پاپ میوزک اور موبائل کی نسل !.... جنھیں فنونِ لطیفہ

میں صرف اداکاروں اور گلوکاروں کی پہچان ہو، ادب کے شناوروں کو بھلا وہ کیا جانیں گے ! خیر ان گلیوں میں ہم اس گھر کو کھوجتے رہے جہاں اردو ادب میں اپنی طرز کے ایک منفرد اور صاحبِ اسلوب افسانہ نگار برسوں اپنے افسانوں، ناولٹوں اور ناولوں سے ادب کے دامن کو مالا مال کرتے رہے۔ پھر وہی ہوا جو ہوتا ہے یعنی جب تھک کر جب ہم نے کسی اور دن پر اس کام کو موقوف کرنے کو سوچا تو مقصود مل گیا۔ جی ہاں سامنے والے گھر پر کی نیم پلیٹ پر نظر پڑی تو 'بیت القدسی' لکھا نظر آیا۔ بیت القدسی سے ہمارا ذہن قدسیہ بیگم کی طرف منتقل ہوا جنھیں 'وہ' پیار سے قدسی بیگم کہا کرتے تھے۔ ساتھ ہی لکھا تھا' شاہد حسن صدیقی' یہ ان کے بڑے بیٹے کا نام تھا۔ اتفاق سے اس گھر کے پڑوس میں ہمارے ایک کرم فرما سلیم قریشی بھائی تھے، ان سے مل کر ہمیں یقین ہو گیا کہ یہی ' ان' کا گھر تھا۔

یہ پچھلے ہفتے کی بات ہے جب ہم نے ایکسپریس میں ایک کالم تامل زبان کے افسانہ نگار ٹی جے کانتن' اور بنگالی زبان کے افسانہ نگار 'ابوالفضل' کے نام سے لکھا تو اردو ادب' کے ہمارے پسندیدہ ترین ادیب جناب ابوالفضل صدیقی مرحوم کا بھی سرسری تذکرہ آ گیا تھا اور ہم نے ارادہ ظاہر کیا تھا کہ اگلے کالم میں ان کا مفصل تذکرہ کریں گے۔ جی ہاں یہ ابوالفضل صدیقی صاحب اردو زبان کے وہ ممتاز، منفرد اور صاحبِ اسلوب افسانہ نگار ہیں، جن کے ذکر کے بغیر بقول

ڈاکٹر جمیل جالبی تاریخِ ادب مکمل نہیں ہو سکتی! ابوالفضل صدیقی نے بڑی فعال، بھرپور، غم والم، نشیب وفراز، اقبال وزوال سے پُر ایک سچی حقیقی زندگی گزاری۔

انھوں نے زندگی کے تمام رخ اور انداز دیکھے، ہر ہر طرح اور طور سے اسے برتا اور بڑی بالغ نظری سے ان سے سبق حاصل کیا۔ ان کا مشاہدہ گہرا تھا اور قدرت نے انہیں دلِ درد مند اور ذہن رسا عطا کیا تھا۔

وہ 5 ستمبر 1908ء کو بدایوں کے مضافات میں واقع ایک بستی 'عارف پور نوادہ' میں ابوالحسن صدیقی کے گھر پیدا ہوئے۔ یہ بستی آپ ہی کے ایک بزرگ عارف صدیقی کی آباد کی ہوئی تھی۔ آپ کا خاندان 1857ء کی جنگ آزادی میں مجاہدین کی مدد کرنے کے پاداش میں معتوبینِ حکومت میں رہ چکا تھا۔ آپ کے دادا چوہدری احمد حسن علاقے کے معزز زمیندار ہونے کے ساتھ شاعر بھی تھے اور 'علیل' تخلص کرتے تھے، اس کے علاوہ قانون پر اچھی دسترس رکھنے کی وجہ سے حکومت کی طرف سے اعزازی عدالتی عہدے 'منصفی' پر بھی فائز تھے۔ چوہدری احمد حسن کے چھوٹے بیٹے اور ابوالفضل کے والد محترم ابوالحسن صدیقی بھی علی گڑھ کے اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، معروف وکیل اور شاعر وادیب بھی تھے۔ اس وقت کے مستند ادبی رسائل میں ان کی نگارشات شایع ہوتی تھیں۔ اس خاندان کے علم و شائستگی کا اتنا چرچا تھا کہ زمینداری کا روایتی رعب داب ان کی حویلی کے دروازے پر ہی کھڑا رہتا تھا، زمینداروں کے مظالم کی جگہ شاعرانہ حساسیت نے لے لی تھی، یہی وجہ تھی کہ ان کے مزارع اپنے مالکوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ابوالفضل صدیقی

کے ہنر تو بعد میں کھلنے والے تھے لیکن پیدا ہوتے ہی ان کے ظاہری حسن پر نگاہیں مرکوز ہو گئیں۔ وہ حسن و جمال کا مرقع تھے۔ کچھ بڑے ہوئے تو قدرت نے ان کی خوبیاں پرت در پرت کھولنا شروع کیں۔ وہ نہایت شرارتی تھے اور شرارت تو ذہانت سے پھوٹتی ہے، ساتھ بے حد بہادر بھی تھے! لیکن کوئی بچہ لاڈلا ہو، ذہین ہو اور بہادر بھی ہو تو اسے بگڑتے دیر نہیں لگتی لیکن ان کے والد ابوالحسن صدیقی جانتے تھے کہ ان صفات کو کس طرح نکھار کر سود مند بنانا ہے۔ انہیں جس طرح خود تعلیم کا شوق تھا، اپنے بیٹے ابوالفضل کی تعلیم کے لیے بھی انھوں نے ایسی ہی منصوبہ بندی کی۔ انھوں نے بدایوں میں ابوالفضل کو ایک مشن اسکول میں داخل کروادیا۔ مشن اسکول میں دو سال گزارنے کے بعد وہ سینٹ جارجز کالج مسوری میں داخلہ لینے میں کامیاب ہو گئے جو اس وقت ہندوستانیوں کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔ بہرحال وہاں سے سینئر کیمبرج کرکے واپس آئے تو اپنی زمینداری سنبھالی۔ اسی دوران ان کے بعض ایسے ہنر کھلے کہ لوگ حیران رہ گئے۔ انھوں نے زراعت اور خصوصاً آموں پر نت نئے تجربات کیے اور بعد میں انہی تجربات نے اردو ادب کو ایک نئی جہت سے مالا مال کیا۔ آموں سے عشق کے علاوہ انہیں جانوروں اور خصوصاً گھوڑوں سے دیوانگی کی حد تک تعلق تھا۔ وہ صرف گھڑ سواری تک محدود نہ رہے بلکہ انھوں ے گھوڑوں کے عیوب و محاسن سے متعلق اتنی نایاب اور مفصل معلومات حاصل کرلیں کہ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا بن گئے۔ انھوں نے جو کام بھی کیا، اسے انتہا تک پہنچا کر چھوڑا۔ شکار

کا شوق ہوا تو نشانہ بازی میں ایسا کمال حاصل کیا کہ دور دور تک ان کی بندوق نوازی کی دھوم مچ گئی۔

شکار، زراعت، باغات اور جانوروں کا باریک بینی سے مشاہدہ.... غرض جنگل اور دیہات سے متعلق ان کا سارا علم کتابِ فطرت سے براہِ راست اکتساب کا نتیجہ تھا جو پھر ان کے لازوال افسانوں میں جھلکا اور ایک زمانے کو اپنا معترف بنا لیا۔ ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 1945ء میں شایع ہوا۔ انہی دنوں برصغیر میں نفرت کا جوالا مکھی پھوٹ پڑا۔ ابوالفضل اور ان کا خاندان چونکہ مسلم لیگی مشہور تھا، گھرانہ بھی مسلم روایت پسند تھا، پھر ان کی حویلی اطراف کے دیہاتوں میں پھوٹ پڑنے والے خونی فسادات سے متاثر ہونے والے مسلمانوں کی پناہ گاہ بن گیا تو گویا بہانہ ہاتھ آ گیا۔ سازشی سازشوں کے جال بننے لگے، لیکن ابوالفضل اتنے حوصلہ مند اور ذکی تھے کہ نہایت حکمت و بصیرت سے ان سازشوں کے تار و پود بکھیرتے رہے۔ لیکن جب پاکستان بن گیا تو بظاہر سیکولر مگر بباطن مسلمانوں سے سخت نفرت کرنے والی ہندو حکومت نے تنسیخ زمینداری کا قانون نافذ کر دیا کیوں کہ تمام بڑے بڑے زمیندار مسلمان تھے اور انہیں معاشی طور پر بدحال کرنے کا یہی آسان اور قانونی طریقہ تھا۔ ابوالفضل صدیقی کا جی اتنا برا ہوا کہ بالآخر 1954ء میں پاکستان ہجرت کر آئے اور کراچی میں جیکب لائنز کے ایک دو کمروں کے کوارٹر میں رہنے لگے۔ کہاں ایکڑوں پر پھیلی

ہوئی حویلی اور نوکروں کی قطاریں اور کہاں یہ دو کمرے! کوئی اور ہوتا تو ماضی کی یادیں اوڑھ کر لیٹا رہتا لیکن انہوں نے نہ صرف پامردی سے حالات کا مقابلہ کیا بلکہ ساتھ ساتھ قلم سے افسوں بھی پھونکتے رہے۔ ایک کے بعد ایک ان کی لازوال کہانیاں آتی گئیں۔ ان کے موضوع بہت منفرد تھے۔ دیہات، وہاں کے تمام طبقات، کسان، کھیت، مزدور، مہاجن، جاگیرداروں اور ان کے کارندوں، دیہاتیوں کے مسائل اور ان کی نفسیات.... پھر جنگل، نباتات، جانوروں، چرند پرند، درند، ان کی عادات وخصائل، جبلت اور انسان سے ان کے باہمی رشتوں کو جس طرح انہوں نے لکھا، وہ بلاشبہ اردو ادب کے سرمائے میں اپنی نوعیت کا ایک منفرد ذخیرہ ہے۔

ان کی جس کہانی سے ہم ان کے نام آشنا ہوئے، وہ 'چڑھتا سورج' تھی۔ یہ کہانی بلاشبہ دنیا کی عظیم کہانیوں کے مقابل پیش کی جا سکتی ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار ایک گھوڑا ہے۔ اس کہانی میں انہوں نے گھوڑے کو بطور استعارہ کرتے ہوئے ہندوستان کی تحریک آزادی اور عوامی قوتوں کی فتح کو مستقبل کا استعارہ بنا دیا ہے۔ اس کہانی کی بُنت میں انہوں نے سماجی بیداری اور استحصالی قوتوں کی نشان دہی اتنی چابکدستی سے کی ہے کہ قاری ایک لمحے کے لیے بھی بور نہیں ہوتا۔ اس میں انہوں نے گھوڑوں کی اقسام، اس کی خصوصیات اور اس کی پرداخت دکھانے میں اتنی ہنرمندی سے کام لیا ہے کہ اس موضوع پر

اردو افسانے میں اس کے مقابل اور کوئی تحریر نہیں پیش کی جا سکتی۔ کہانی کا کلائمکس اتنا پراثر ہے کہ کوئی بھی حساس دل اسے روانی سے نہیں پڑھ سکتا۔ ہمیں آج بھی یاد ہے کہ جب ہم اس موڑ پر پہنچے جب میاں بچّہ (گھوڑے کا نام) اپنی مخصوص ہنہناہٹ کے ساتھ مقابلے کے لیے آتا ہے اور جب دوڑ شروع ہوتی ہے تو ہمیں بار بار رک کر اپنے دل کو سنبھالنا پڑا۔ گھوڑے کے ساتھ ہمارے دل کی دھڑکن بھی تیز ہوتی جا رہی تھی، پھر ایک موقع تو ایسا آیا کہ بے اختیار آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہی تو اچھے ادب کی شناخت ہے۔ اچھی کہانی اپنے اسلوب اور تاثر سے ہی پہچانی جاتی ہے۔ کتنا گہرا تاثر ہے، کیسا تیکھا اسلوب ہے، بات کہنے کا کیا ڈھنگ ہے، کتنا اندر جا کے لکھا گیا ہے، کیسی کیسی نازک باتیں محسوس کی گئی ہیں۔ ایک خوبصورت جملہ جو قاری کی رگِ جاں میں ترازو ہو جائے، لکھنے کے لیے فکری اور تخلیقی کرب سے گزرنا پڑتا ہے! ان کی ایک اور کہانی خونی' پڑھیے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار بھی ایک جانور، ایک وحشی اور خونی جانور'' ہاتھی ہے۔ یہ کہانی محض تخیل نہیں بلکہ ریاست رام پور کے جنگلوں کے ایک سچے واقعہ سے ماخوذ ہے، جسے صدیقی صاحب کے قلم نے ہمیشہ کے لیے زندہ جاوید کر دیا۔ 'خونی' میں انہوں نے وحشی ہاتھی کی بے پناہ قوت اور جبلت کا اور ساتھ ہی ایک ہتھنی سے محبت کا جو دلفریب نقشہ کھینچا ہے، اس سے جہاں قاری بیک وقت نفرت اور ہمدردی کے متضاد جذبات کے درمیان گھرا رہتا ہے، وہیں پڑھتے ہوئے جنگل اپنی پوری ہیبت ناکی کے ساتھ اس قاری کے تصور میں

آ جاتا ہے جس نے کبھی جنگل نہیں دیکھا۔ کئی بار دہشت سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور سطر سطر دلچسپی بڑھتی چلی جاتی ہے۔اس افسانے کو پڑھتے ہوئے بے اختیار صدیقی صاحب کے پیش رو سید رفیق حسین یاد آ جاتے ہیں، یا پھر اسی کی دہائی کے قاضی عبدالستار اور سید محمد اشرف جن کے موضوعات بھی عموماً جنگل اور جانور ہوا کرتے تھے۔افسانہ ' گلاب خاص' اور پھر اسی موضوع پر نقوش صدارتی ایوارڈ یافتہ ناولٹ ' گل زمین کی تلاش میں' بھی ان کی وہ کہانیاں ہیں جن پر بلا مبالغہ اردو ادب دنیا کی کسی بھی دوسری زبان کے ادب پر فخر کر سکتا ہے۔ان دونوں تخلیقات میں انہوں نے اپنی اعلیٰ ترین جمالیاتی حسیات کا شاندار مظاہرہ کیا ہے۔اس میں ایک طرف انہوں نے نچلے طبقات کی محنت پر اوپر والے طبقات کے استحصال کا ذکر اپنے مخصوص انداز میں کیا ہے تو وہیں آم کی کاشت اور اس کے باغات اور برصغیر میں باغات کی تہذیبی جہت کو ابھارتے ہوئے مالیوں کے طبقے اور ان کے تخلیقی جوہر کو نمایاں کیا ہے۔

کس کس تحریر کا ذکر کیا جائے۔ترنگ، میراث، دفینہ، بھیا دیوج، بھورا چلیے، انصاف، الارض اللہ اور نیل گائے.... سب موضوع، اسلوب اور دلچسپی کے اعتبار سے ایک سے ایک، اور جہاں تک زبان وبیان کی بات ہے، ابوالفضل صدیقی مرحوم کی نثر کا سلسلہ نسب دبستانِ اودھ کا سلسلہ زریں ہے۔افسوس صد افسوس ہم نے اتنے بڑے ادیب کو بھلا دیا، انہیں وہ مقام نہیں دیا جس کے وہ حقدار تھے۔

اللہ جزائے خیر دے کراچی کے ان حضرات کو جنھوں نے ان کے انتقال سے کچھ مہینے پہلے ان کی پچاس سالہ ادبی خدمات کے اعتراف میں نیپا آڈیٹوریم کراچی میں ایک جلسہ منعقد کرکے کیا۔ ہندوستان سے جگن ناتھ آزاد نے جلسے کی صدارت کی تھی۔ ڈاکٹر اسلم فرخی نے ان کا افسانہ 'مامتا کا ٹکراؤ' پڑھ کر سنایا۔ صدیقی صاحب کے قدر دان اور دوست ڈاکٹر جمیل جالبی، شمیم احمد، مختار زمن، مشرف احمد اور بھتیجے نذر الحسن صدیقی نے ان کے فن اور شخصیت پر مقالے پڑھے۔ گل پوشی کی گئی اور انجمن کی جانب سے 'نشانِ سپاس' پیش کیا گیا۔ میں سوچتا ہوں کہ وہ دن صدیقی صاحب کے لیے کتنا خاص ہو گا! بے شک وہ ایک بڑے ادیب ہی نہیں بلکہ ایک بڑے انسان بھی تھے، جنھوں نے مسلم لیگ اور پاکستان کی محبت کی وجہ سے بلا مبالغہ اس وقت کی کروڑوں کی جائیداد سے ہاتھ دھوئے اور پاکستان میں نئے سرے سے زندگی شروع کی۔ وہ بہترین شکاری بھی تھے، بہترین زمیندار بھی اور ادیب تو بڑے تھے ہی۔

کوئی تین ہفتے پہلے جب میں اردو بازار گیا جے کانتن اور صدیقی صاحب کے افسانوں کا مجموعہ ڈھونڈنے تو ایک بڑا دھچکا لگا.... جیسا کہ پچھلے کالم میں عرض کیا کہ جے کانتن تو چلیے ہندوستان کا تامل زبان کا ادیب، کوئی نہیں جانتا لیکن آٹھ دس بڑی دکانداروں نے جب ابوالفضل صدیقی کا نام پہچاننے سے بھی انکار کر دیا تو دلی رنج ہوا۔ آخر ایک دکاندار نے نہ صرف پہچانا بلکہ

ان کے پاس حضرت کے ایک دو مجموعے ' شہرزاد ' کے شایع کردہ ملے۔ اس دن معلوم ہوا کہ کچھ نئے لکھاریوں یا پرانوں میں مشہور چند ناموں کے علاوہ کتنے ہمارے ادیب ہیں، جن کو نئی نسل جانتی بھی نہیں ہے! ہمارے ایک اور پسندیدہ لکھاری قاضی عبدالستار صاحب تو زیادہ پرانی بات نہیں ہوئی، ان کے افسانوں کے مجموعے بھی نہیں ملے۔ بس یہی رنج اس کالم کے لکھنے کا محرک بنا۔ یہی خیال آتا ہے کہ آج ہمارے اردو کے نام لیوا بھیڑ چال کا شکار ہیں، کچھ خوش قسمت ادیب جو مقبول ہو گئے، مقبول ہو گئے.... بس اب انہی کا کام اور انہی کی باتیں ہیں، بے شک وہ بھی بہت بڑے ادیب ہیں، لیکن یہ بھی تو دیکھیے کہ یہاں کیسے کیسے جگمگاتے جوہر تھے جو خود تو مٹی اوڑھ کر سو رہے لیکن ان کا کام بھی ابھی تک گمنامی میں ہے۔ ان کے کام پر کوئی تحقیق نہیں کرتا....آخر میں ان نوجوانوں سے جو موبائل اور انٹرنیٹ کے زمانے میں بھی کتابوں سے رشتہ قائم رکھے ہوئے ہیں، یہ درخواست ہے کہ کبھی وقت نکال کر جناب ابوالفضل صدیقی رحمہ اللہ کو بھی پڑھیے، یقیناً آپ ان کے لیے دعائے مغفرت کے لیے خود کو مجبور پائیں گے!

ان کے والد محترم ابوالحسن صدیقی نے اپنے قابل بیٹے کے متعلق یہ شعر کہا تھا

محو ہے فطرت میں وہ، فطرت بھی اس میں محو ہے
رازِ فطرت کے سمجھنے میں اسے کب سہو ہے

وہ ساری زندگی فطرت کو افسانوں میں پینٹ کرتے رہے، اب بھی شاید وہ دوسری دنیا
میں فطرت میں محو ہوں!

اس ڈائن سے تو ہماری بلی اچھی

ہمارے فلیٹ کے داخلی دروازے کا ڈیزائین کچھ ایسا ہے کہ بلیاں آرام سے اندر آ سکتی ہیں۔ کسی طرح یہ بات ایک بھوری بلی کو بھی معلوم ہو گئی۔ وہ آتی اور گیلری میں موجود اسٹور کی کھڑکی سے اندر چلی جاتی۔ جب کئی ہفتوں کے بعد کسی کام سے ہم اسٹور میں گئے تو جنگلی کبوتروں کے پروں کے ڈھیر اور خون کے دھبے دیکھ کر چونک گئے۔ یعنی محترمہ نے ہمارے اسٹور کو بیک وقت بیڈ روم اور ڈائننگ روم کا درجہ دے رکھا تھا۔ اب اسے ہماری کاہلی کہیے یا کام کی مصروفیت کہ بیگم کے کئی بار کہنے پر بھی ہم دروازے پر باریک جالی نہ لگوا سکے۔ دن گزرتے رہے اور بیگم ہمیں اور ہم موصوفہ بلی کو کھری کھری سنانے کے سوا کچھ نہ کر سکے۔ آخر ایک چھٹی کے دن جب بیگم نے پیچھا ہی لے لیا تو ہم نے بھی کمر کس لی اور جالی لگانے سے پہلے اسٹور کی صفائی کی ٹھانی۔ آستینیں چڑھائے ابھی ہم نے اسٹور کا دروازہ کھولا ہی تھا کہ معصوم سی 'میاؤں میاؤں' کی آوازیں کانوں میں پڑیں۔ فوراً سے پیشتر ہم سمجھ گئے کہ بلی موصوفہ نے بیڈ اور ڈائننگ کے ساتھ اب ہمارے اسٹور کو میٹرنٹی ہوم کا درجہ بھی دے دیا ہے! ہم شش و پنج میں پڑ گئے کہ کیا کریں؟ یکایک اندر کا بچہ جاگ اٹھا اور دل میں اشتیاق اٹھا کہ بلی تو ہو گی نہیں، بچوں کا تماشا ہی دیکھ لیں۔ آواز سے جگہ کا تعین کر کے پرانی کرسی جو ہٹائی تو

انوکھا منظر سامنے تھا۔ بچوں کے ساتھ زچہ بھی موجود تھیں اور فیڈ کروا رہی تھیں۔ وہ جو ذرا سی آہٹ پر بھاگ جاتی تھی، ہمیں دیکھ کر چونکی تو ہوئی مگر اپنی جگہ سے ہلی بھی نہیں، بلکہ ننھے بچوں کو سینے سے چمٹائے عجب انداز میں ہمیں گھورنے لگی۔ ان نگاہوں میں کیا نہیں تھا، خشونت، غصہ، دھمکی!!.... جیسے کہہ رہی ہو، کہ ایک قدم بھی بڑھایا تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ ہمارے منہ سے ہش نکلا، تو اس نے فوراً اپنا پنجہ اٹھا لیا، بے اختیار ہمارا دل کانپ گیا۔ ہم پچھلے قدموں باہر نکل آئے۔ بیگم کی استفسارانہ نگاہوں پر انہیں بتایا تو انہوں نے بے اختیار سر پکڑ لیا۔ پھر کہنے لگیں۔ " اب اسے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، وہ ماں بن گئی ہے، اسے نکالنا مناسب نہیں، اس کے بچے خطرے میں پڑ جائیں گے، آپ کو پتا ہے کہ بلا بلونگڑوں کی تلاش میں ہوتا ہے، وہ کھا جائے گا نہیں!؟" انہوں نے انکشاف کے سے انداز میں کہا۔ پھر اگلے کئی دن عجیب مناظر دیکھنے کو ملے۔ وہ بلی صاحبہ جن سے ہماری بیگم سب سے زیادہ خار کھاتی تھیں، اب اسے باقاعدگی سے دودھ دیا جارہا تھا کہ بلی ان کی نظر میں والدہ محترمہ کے درجے پر جو فائز ہو گئی تھی۔

آیئے اب ایک دوسرا منظر نامہ دیکھتے ہیں.... خونی منظر نامہ.... ایک دل دہلا دینے والا واقعہ، جس کی وجہ سے پچھلے ہفتے سے اب تک دل و دماغ نارمل نہیں ہوسکے ہیں!

پچھلے ہفتے تمام اخبارات میں یہ لرزہ خیز خبر چھپی کہ لاہور میں ایک ماں نے نہایت سفاکی کے ساتھ اپنے دو پھول جیسے بچوں 2 سال کی بیٹی مناہل کو پانی میں ڈبو کر اور 8 ماہ کے یوسف کو گلا گھونٹ کر قتل کر دیا ہے۔ یہ ایسا بھیانک جرم ہے کہ لکھنا بھی آسان نہیں ہے۔ جب لکھتے ہوئے تصور میں ایک خاکہ سا بنتا ہے کہ ایک 'ماں' جی ہاں ایک ماں جو دنیا کا سب سے خوبصورت رشتہ ہے، اپنی بچی کو پانی میں ڈبو رہی ہے تو ہاتھ کانپنے لگتے ہیں اور جب ماں اپنے 8 ماہ کے بیٹے کا گلا گھونٹ رہی ہو تو دنیا کی ہر شے پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ ابھی کل ہی کی تو بات ہے کہ جب ہماری چھ ماہ کی پیاری بیٹی خنساء کے گلے میں دلیا اٹک گیا تھا تو ہم میاں بیوی کیسا تڑپ اٹھے تھے، لیکن بسمہ کیسی ماں تھی.... ماں تھی بھی کہ نہیں!

اور عذرِ گناہ دیکھیے کہ قاتلہ کے مطابق بھوک کی وجہ سے اس نے یہ دنیا کا سب سے بڑا جرم کیا ہے! .... کیا اس بات پر یقین کیا جا سکتا ہے؟.... تھر میں کتنے بچے بھوک سے مر گئے.... وہاں ہندو والدین اپنے جگر گوشوں کو سینے سے لگائے در در کی ٹھوکریں کھاتے رہے لیکن یہ کسی نے نہیں کیا کہ اپنے ہاتھوں سے انہیں مار دیں۔ ارے ایسی حالت میں تو بھیک مانگنے کی رب بھی اجازت دیتا ہے.... وہ بھیک مانگتی، برتن مانجھ لیتی، خود نہیں پال سکتی تھی.

تو ایدھی ہوم دے آتی ، بلکہ ایک ماں کو اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے خود کو بھی بیچنا پڑے تو کوئی جرم نہیں.... مگر یہ سب ڈھکوسلا تھا اپنی سفاکی پر پردہ ڈالنے کا.... چینلز نے خوب اچھی طرح اس کا بھانڈا پھوڑا.... جوہر ٹاؤن کا علاقہ، ایک کروڑ روپے مالیت کی کوٹھی، جس کا کرایہ پچاس ہزار روپے ماہوار آسکتا تھا، پورچ میں کھڑی کئی لاکھ کی کار، قیمتی کپڑوں سے بھری وارڈوب اور ملزمہ کے بیان کے بالکل برعکس پڑوسیوں کے بیانات، پھر یہ غربت اور بھوک کا رونا چہ معنی دارد؟ دو دن بعد خبر آئی کہ اصل وجہ میاں بیوی کا جھگڑا تھا.... ملزمہ بسمہ کا ناکارہ شوہر کوئی کام نہیں کرتا تھا، سارا خرچ سسرال والے اٹھاتے تھے، جب انہوں نے خرچ دینا بند کر دیا تو اس نے اس کا بدلہ اپنے ہی بچوں کو مار کر لے لیا! ایک دن کے بعد پھر ملزمہ نے بیان بدل دیا کہ دراصل اس کا شوہر اسے غیر اخلاقی حرکات پر مجبور کرتا تھا۔ انتہائی عجیب عذر، یعنی اگر کسی عورت میں اتنی غیرت ہے تو وہ شوہر پر دو حرف بھیج کر چلی جائے، مارنا ہی ہے تو اس بے غیرت شوہر کو مارے یا خود کو ہی ختم کر لے مگر معصوم بچوں کا کیا قصور ہوا؟ ہم خواتین کا احترام کرتے ہیں.... ایک عورت کئی حوالوں سے مردوں کے لیے انتہائی عزت و احترام کا باعث ہے لیکن معاف کیجیے گا میرے نزدیک اِس عورت سے کئی زیادہ احترام کے قابل وہ بزدل سی بھوری بلی ہے جو اپنے بچوں کی

حفاظت کے لیے مگر مرنے مارنے پر اتر آتی ہے....اِس عورت کو ہم ڈائن تو کہہ سکتے ہیں عورت نہیں۔ پولیس کے مطابق جب قتل ہوا تو شوہر اسی کمرے میں موجود تھا، یعنی دونوں بدبخت اس قبیح جرم میں برابر کے شریک تھے۔
پچھلے دنوں جب یہ رپورٹ عالمی میڈیا کے حوالے سے پڑھی کہ امریکا میں ایک سال میں سینکڑوں بچے اپنے والدین کے ہاتھوں قتل ہو جاتے ہیں اور قتل کیے جانے کا محرک صرف یہ بتایا گیا کہ یہ بچے اپنے والدین کے خیال میں ان کی عیش کوشی میں رکاوٹ بنتے تھے! تو کتنی حیرت ہوئی تھی لیکن اب یہ لاہور کا واقعہ سن کر تو گویا دنیا ہی اندھیر ہو گئی.... اور اتنا ہی نہیں جب اس موضوع پر گوگل پر مزید سرچ کیا تو ہمارے تو ہوش اڑ گئے۔ جی ہاں گزشتہ ایک سال میں ملک عزیز میں کم و بیش 32 کم سن بچے جن کی عمر چھ ماہ سے بارہ سال تک تھی، اپنے ہی ماں باپ کے ہاتھوں قتل ہو چکے ہیں۔ صرف تین عبرت انگیز واقعات ملاحظہ فرمایئے۔ جولائی کے شروع میں ذرائع ابلاغ پر یہ دل دوز خبر نشر ہوئی کہ ایبٹ آباد میں شوہر سے جھگڑے کے بعد بیوی نے اپنے تین بچوں کو زہر دے دیا۔ اُدھر گگو منڈی کے ایک گاؤں کے حنیف نے اپنے چار بچوں اور بیوی کو نشہ آور مشروب پلا کر چھری سے گلا کاٹ دیا۔ ککمنگ کے رہائشی سفیر نے اپنی بیوی شیریں، 7 سالہ بیٹے سمیر اور 12 سالہ بچی سویرا کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ نفرت کی انتہا دیکھیے کہ سفاک باپ نے سمیر کے پیٹ میں آٹھ گولیاں

! ماریں ! .... اف کیا قیامت کا سماں ہے، آسمان ٹوٹ پڑے ہم پر تو کم ہے

کیا نوجوانوں کو مثبت جنسی رہنمائی دی جانی چاہیے؟(۱

یہ دو قسطوں پر مضمون ایک انتہائی ضروری موضوع پر صحیح نیت سے لکھا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کسی دوست کو موضوع کی ضرورت کی بنا پر لکھے گئے کسی جملے یا لفظ پر اعتراض ہو لیکن اپنی سی پوری کوشش کی گئی ہے کہ شائستگی سے اپنی بات سمجھا دی جائے !

کامیاب اور خوش و خرم زندگی گزارنے کے لیے انسان کا تن درست اور صحت مند ہونا نہایت ضروری ہے۔ ذہن اور جسم صحت مند ہوں تو انسان زندگی کے ہر مرحلے میں کامیابی سے آگے بڑھ سکتا ہے۔ جنس، انسان کی صحت اور زندگی کا نہایت اہم حصہ ہے اور کسی بھی انسان کی ذہنی اور جسمانی صحت میں اس کی جنسی صحت بنیادی کردار ادا کرتی ہے، مگر ہمارے معاشرے میں بعض غیر ضروری پابندیوں اور سماجی رویوں کی وجہ سے، جنس کے حوالے سے ایسی ضروری باتوں سے بھی گریز کیا جاتا ہے جن سے نہ دین اسلام میں منع کیا گیا ہے اور جو صحت مند معاشرے کی تشکیل میں اہم ہوتی ہیں۔
کیا نوجوان لڑکوں کو مثبت جنسی تعلیم اور رہنمائی دی جانی چاہیے؟ یہ سوال

کبھی نہ کبھی آپ کے ذہن کے کسی گوشے میں ضرور ابھرا ہوگا، چونکہ بلوغت تک پہنچنے میں جن منازل و تجربات نیز یقین و بے یقینی کی جن کیفیات سے آپ گزرے ہوں گے، انھوں نے یہ سوچنے پر ضرور مجبور کیا ہوگا کہ آخر جب ہر طرح کی متعلقہ تعلیم ہمیں دی گئی اور زندگی کے ہر نشیب و فراز سے آگاہ کیا گیا تو آخر اس اہم ترین معاملے میں ہمارے والدین، اساتذہ اور دیگر بزرگوں نے کیوں خاموشی اختیار کی؟ یا آپ نے کبھی اس ذیل میں از خود یا کسی دوسرے کے ذریعے جنسی اعضا اور وظیفہ جنسی کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ حالاں کہ عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اور بچپن سے لڑکپن میں داخل ہوتے وقت یہ سوالات آپ نے ضرور کیے ہوں گے کہ آپ کی آواز دو رنگی یعنی کبھی باریک اور کبھی بھاری کیوں ہو رہی ہے ؟ یا گردن میں ایک نوکدار ہڈی کیوں ابھر رہی ہے؟ یا چہرے پر ایک دم رواں کیوں اگنے لگا؟ یا قد تیزی کے ساتھ کیوں بڑھنے لگا؟ یا نیند کی حالت میں احتلام کا ہونا وغیرہ وغیرہ.... یہ تبدیلیاں جو دراصل بلوغت کی نشانی ہیں، آپ نے ان کے بارے میں کبھی بھی اپنے بزرگوں سے پوچھنے کی جرات نہیں کی ہوگی (حیرت کی بات ہے کہ یہ الجھن صرف بچوں کو پیش آتی ہے، کیوں کہ بچیوں کو ان کی مائیں عموماً سب کچھ سمجھا دیتی ہیں، اسی وجہ سے ہم نے نوجوان لڑکوں کو مثبت تعلیم دینے کی بات کہی ہے کیوں کہ بچیوں کو ایسی کوئی پریشانی عموماً نہیں ہوتی)۔

دراصل ہمارے ماحول اور معاشرے میں جنس کو علی الاطلاق شجر ممنوعہ سمجھ لیا گیا ہے کہ جو بھی اسے سمجھنے کی کوشش کرے گا وہ گویا سخت برا کام کرے گا۔ایک طرف جنس کے بارے میں بچپن ہی سے آپ کے ذہن میں یہ بیٹھا ہوا ہے کہ یہ ایک گندی اور گناہ کا چیز ہے اور اس سے بچ کر چلنا چاہیے تو دوسری طرف فطری طور پر جب جسم میں تبدیلیاں آتی ہیں اور جنسی خواہشات سر اٹھاتی ہیں تو ان سے خود کو بچانا ممکن نہیں رہ جاتا۔ ایسے موقع پر قریب البلوغ سیدھے سادے بچے تو خود کو گندا اور برا سمجھنے لگتے ہیں اور تیز طرار قسم کے بچے غلط ذریعوں سے معلومات حاصل کرکے بہت کچھ غلط کر بیٹھتے ہیں۔آج سے پچاس سو سال پہلے تک تو یہ رویہ ٹھیک بھی تھا، کہ جب بہت چھوٹی عمر میں بچوں کی شادیاں کر دی جاتی تھیں، یقین کیجیے صرف چودہ پندرہ سال میں ہمارے نانا مرحوم کی شادی پندرہ سال کی عمر میں ہوئی جب نانی اماں بارہ سال کی) تھیں)۔ تو اس وقت نوجوان کو پریشان ہونے کا وقت ہی نہیں ملتا تھا، شادی سے پہلے خاندان کا کوئی بزرگ یا کچھ بڑا کزن جو خود شادی شدہ ہوتا، ضروری معلومات فراہم کر دیتا، یوں کسی قسم کی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ لیکن آج صورتِ حال یہ ہے کہ شادی کا یہ حال ہے کہ پینتیس چالیس سال کے لڑکے کنوارے گھوم رہے ہیں، ایسے ماحول میں ایک طرف لڑکوں کو صحیح رہنمائی کرنے والا اور برا بھلا بتانے والا کوئی نہیں ہوتا اور دوسری طرف جنسی قوتوں کو بیدار کرنے اور ایک دوسرے کے لیے جنسی کشش پیدا کرنے کے لوازمات اور ماحول ہماری مغرب کی

پروردہ سوسائٹی خوب فراہم کرتی ہے! نوے فیصد ادب، شاعری، مصوری، فلمیں، ٹی وی، اشتہارات اور مخلوط ماحول یہ سب مردوں اور عورتوں کے بے محابا جنسی تعلق کی طرف اشارہ کررہے ہوتے ہیں!!

آپ بازار سے کوئی مشین یا کسی طرح کا آلہ خرید کر لاتے ہیں، اس کا ڈبہ کھولتے ہی سب سے پہلے آپ وہ چھوٹی سی کتاب تلاش کرتے ہیں، جس میں اس کے بارے میں بنیادی معلومات ہوتی ہیں کہ وہ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس سے کیا کام لیے جاسکتے ہیں اور اسے کیسے استعمال کرنا چاہیے اور کس طرح اس کا استعمال خطرناک اور نقصان دہ ہوسکتا ہے؟ مگر جنس کے بارے میں کبھی بھی یہ خیال پیدا نہیں ہوتا کہ ہم صحیح اور مکمل رہنمائی حاصل کریں تاکہ ہمیں اس کی اچھائی اور برائی کی حدود کا اندازہ ہوجائے۔

حالاں کہ اعضا میں تبدیلی اور احساسات کی جولانی اگر صحیح جنسی معلومات کے حصول کے بعد ہو تو بلوغت شاید کسی نوجوان کے لیے کوئی حیرت اور تعجب کی بات نہ ہو۔

مثبت طریقے سے معلومات نہ دینے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ بچے، جب بچپن سے سنِ بلوغت میں داخل ہورہے ہوتے ہیں اور اس وقت ان کے جسم اور ذہن میں جو اہم تبدیلیاں، خصوصاً جنس کے حوالے سے آرہی ہوتی ہیں، ان کے بارے میں انھیں صحیح معلومات اور رہنمائی کہیں سے دستیاب نہیں ہوتیں۔ یہ لاعلمی ان کے لیے سخت الجھن، پریشانی اور بعض اوقات خوف کا باعث بن ہوتی ہے۔ اس اہم دور میں نوجوانوں کی

صحیح رہنمائی نہ کی جائے تو وہ ذہنی اور جسمانی بیماریوں کا شکار بھی ہو سکتے ہیں۔ اور پھر وہ غلط لوگوں اور ذریعوں سے، نامکمل اور گم راہ کن معلومات سے اپنے لیے غیر ضروری پریشانیاں پیدا کرلیتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک رپورٹ کے مطابق چند سالوں پہلے تک میڈیکل وہ انفیکشنز جو جنس کے ذریعے منتقل ہوتے ہیں) تک نہیں پڑھائے (STI's اداروں میں جاتے تھے کہ بھلا ان موضوعات پر کس طرح سے گفتگو کی جاسکتی ہے ؟ مگر یہاں بھی حیرت کی بات یہ تھی کہ طالبات کو زنانہ جنسی امراض پوری تفصیل کے ساتھ پڑھائے جاتے تھے !

جنس اگر واقعی اس قدر گندی چیز ہوتی تو کلام پاک میں اس کا تذکرہ جابجا کیوں آتا؟

کلام پاک میں اکثر مقامات پر عورت و مرد کے تعلقات کے ساتھ ساتھ نطفے کے

استقرار اور اس کے بڑھنے کے مدارج کو بڑے عالمانہ اور سائنٹیفک انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ زمانہ حمل اور دودھ پلانے کی مدت متعین کی گئی ہے، نیز احادیث مبارکہ میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ کس طرح یہ عمل جائز ہے بلکہ صدقے کا درجہ رکھتا ہے اور کن کن طریقوں سے اس کا ارتکاب غلط اور گناہ ہے۔

دراصل یہ انسانی سوچ اور اس کی ذہنی تربیت کی بات ہے کہ وہ کس بات کو کس انداز میں لے رہا ہے، ورنہ جنسی عمل فی نفسہ کوئی غلط بات یا گناہ تو

نہیں، غلط یا گناہ کی بات تو اس کا ناجائز استعمال ہے، لیکن اس طرح تو ہر عمل کا جائز اور ناجائز محل ہے، تو پھر ان کے بارے میں بھی نہیں بتانا چاہیے تھا! سوچنے کی بات ہے کہ نکاح تقریباً تمام انبیاء کی سنت ہے اور تمام نبیوں کے سردار پیارے نبی کی بھی پیاری سنت ہے تو وہ کام جسے انبیاء کرام اور بزرگانِ دین نے بھی سرانجام دیا، وہ کیسے ایسا غلط ہو سکتا ہے کہ زندگی کے ایک اہم باب کے بارے تمام ضروری ہدایات سے ہی عامل کو محروم رکھا جائے۔ یاد رکھیے کہ جنس، وظیفہ زوجیت اور تولیدی عمل پورا ایک علم ہے جس پر حکماء، فلاسفہ اور سائنس دانوں نے کام کیا۔ جنسی عمل اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تکوینی حکم ہے جس کی وجہ سے یہ دنیا آگے بڑھ رہی ہے.... اور بالکل اسی طرح یہی جنسی عمل ایک گناہ، ایک گندگی اور ایک گالی ہے جو بہت سی بیماریوں اور برائیوں کا باعث بنتا ہے.... مگر اس عبادت و گناہ کے درمیان اس وقت ہی حدِ فاصل کھینچی جا سکتی ہے جب آپ کو اس کے بارے میں پورا پورا علم ہو۔ آپ لوگوں میں سے بہت سے ایسے لوگ اس بات سے حیران ہوں گے کہ ہمارے دینی مدارس میں صورت حال اس حوالے سے بہترین ہے۔ یہاں تمام ضروری مسائل پڑھائے جاتے ہیں۔ اس موضوع پر بھی اساتذہ کرام بہترین طریقے اور پیرائے سے پوری بات اس طرح سمجھاتے ہیں کہ شائستگی کا دامن بھی نہیں چھوٹتا اور مقصد بھی پورا ہو جاتا ہے۔

عموماً ہوتا یہ ہے کہ بلوغت کے وقت جب جنسی تبدیلیاں پیدا ہوتی ہیں اور ان سے بچہ حیران و پریشاں ہوتا ہے تو بالعموم وہ اپنے قدرے بڑے دوستوں سے اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہتا ہے، جو ڈینگیں مار کر اسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ خود بھی بے چارے صحیح بات نہیں جانتے۔ بہر حال اس طرح دوستوں سے بے تکلفی سے بات فطری شرم وحیا بھی ختم کر دیتی ہے جو پھر بعض اوقات بچوں کو انتہائی بے ہودگی تک پہنچا دیتی ہے۔اور اگر کوئی دوست سے نہ پوچھے تو ادنی گھٹیا لٹریچر جو ہر جگہ موجود ہے، اس سے رہنمائی لینا چاہتا ہے، جو کچے ذہنوں کے لیے اور بھی زیادہ خطرناک ہے۔

بعض نوجوان یقیناً معالجین سے بھی رجوع کرتے ہیں مگر آگے ان کی قسمت ہے کہ وہ کسی پڑھے لکھے معالج کے پاس پہنچ رہے ہیں یا اشتہاری جنسی مراکز کے 70 سالہ سنیاسی باوا کے ہتھے چڑھ رہے ہیں۔ مثال کے طور پر کوئی نوجوان بد خوابی (احتلام) سے حیران و پریشاں ہو کر کسی تعلیم یافتہ معالج کے پاس علاج کے لیے پہنچے گا تو وہ اسے سمجھا دے گا کہ گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں، یہ ایک فطری عمل ہے جو کہ اس عمر میں شروع ہوتا ہے اور ایک ماہ میں تین چار بار یا مخصوص عوامل کی وجہ سے اس سے زیادہ ہو جانا بھی کوئی بیماری نہیں ہے اور آپ کو کسی طرح کے علاج کی ضرورت نہیں ہے، مگر انتائی لالچی بابے اپنی زہریلی ادویات بیچنے کے لیے اسے تمام امراض اور کم زوریوں کی جڑ گردانیں گے اور

مادہ منویہ کے ایک قطرے کی قوت کو 500 قطرے خون کے برابر ثابت کریں گے اور یہ ذہن نشین کرادیں گے کہ اگر ایسا ہوتا رہا اور اس کا مکمل علاج نہ کرایا گیا تو نا صرف تمام ذہنی و جسمانی صلاحیتیں اور قوتیں جواب دے جائیں گی بلکہ آگے چل کر شادی شدہ زندگی بھی ناکام ہو جائے گی۔ ہر دو صورتوں میں جو نتائج برآمد ہوں گے، انہیں آپ بہ خوبی سمجھ سکتے ہیں۔ (جاری ہے

(کیا نوجوانوں کو مثبت جنسی رہنمائی دی جانی چاہیے؟ (دوسری اور آخری قسط

دوا خانوں اور مطبوں میں جو مریض جنسی علاج کے لیے آتے ہیں، یقین کیجیے کہ ان میں سے نوے فیصد ذہنی و نفسیاتی مریض ہوتے ہیں۔ انھیں اگر جنسی شکایات ہوتی بھی ہیں تو وہ بہت عام اور سیدھی سادھی سی ہوتی ہیں جن کا آسانی کے ساتھ علاج ممکن ہے۔ مگر خود ان کی معلومات ان امراض کے بارے میں اس قدر خطرناک و خوف ناک ہوتی ہیں اور وہ ان سے اس حد تک ذہنی دباؤ میں ہوتے ہیں کہ اس ذہنی کیفیت اور ان کی غلط فہمیوں کو رفع کرنا انتہائی مشکل ہو جاتا ہے، اور دراصل معالجین کے لیے اصل چیلنج انہی کیفیات اور غلط فہمیوں کو مریض کے ذہن سے کھرچنا ہوتا ہے۔ کیوں کہ عموماً مردانہ کمزوری یا نامردی کے پچانوے فیصد کیسز میں علامات ایسی غلط سوچوں کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ سیدھی سی بات ہے کہ انسانی دماغ جو پورے جسم کے تمام نظاموں کو کنٹرول کرتا ہے، اس میں جب ہم بار بار یہ بات بٹھا لیں گے کہ میں نامرد ہوں، میں کمزور ہوں، میں کسی قابل نہیں تو وہ ایسا ہی رد عمل دے گا، اور جنسی عمل میں تو دماغ کا حصہ ویسے بھی نوے فیصد اور بقیہ جسم کا عمل دخل صرف دس فیصد ہوتا ہے۔ لیکن مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ جب ایسے مریضوں کو صاف صاف یہ بتایا جائے کہ انہیں کوئی جسمانی مسئلہ نہیں صرف نفسیاتی مسئلہ ہے تو وہ

مطمئن نہیں ہوتے اس لیے معالجین حکمت کے تحت ایسے مریضوں کو ضرورت نہ ہوتے ہوئے بھی ہلکی پھلکی ادویہ تجویز کرتے ہیں تاکہ ان کی تشفی ہو جائے کہ علاج ہو رہا ہے، ورنہ خطرہ یہ ہوتا ہے کہ وہ غیر مطمئن ہو کر کسی اشتہاری جنسی معالج کے چنگل میں نہ آ جائیں اور عمر بھر کے لیے واقعی مریض بن جائیں۔ ایسے مریضوں کو محض دماغ و اعصاب کو طاقت دینے اور نظامِ ہضم کو درست کرنے والی ادویہ تجویز کر دی جاتی ہیں تاکہ ان کی قوتِ ارادہ اور قوتِ فیصلہ مضبوط ہو سکے۔

ہمارے یہاں، خصوصاً اردو زبان میں ایسے صحت مند جنسی لٹریچر کی بہت کمی ہے جبکہ دوسری زبانوں میں اس طرح کا جو مواد ملتا ہے وہ ہماری تہذیب اور معاشرت سے پوری طرح میل نہیں کھاتا۔ اس کا اندازہ اس واقعے سے لگایئے کہ اب سے چند سال پہلے پاکستان کے ایک حکیم صاحب کو لندن سے ایک خاتون کا خط ملا جن کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا اور ایک بیٹا اور بیٹی بلوغت کے قریب پہنچ رہے تھے۔ انھوں نے اپنے خط میں لکھا کہ 'جب میری بیٹی بالغ ہونے لگی تو میں نے اسے جنسی اہمیت کی ضروری باتیں بتلائیں جو کہ ایک ماں اپنی بچی کو بتلاتی ہے اور اب جب کہ میرا بچہ جوان ہو رہا ہے تو مجھے خیال آیا کہ اس عمر میں بیٹوں کو ضرور ان کے والد جنسی تعلیم دیتے ہوں گے، مگر بیٹے کے ساتھ مجبوری یہ ہے کہ ان کے والد انتقال کر چکے ہیں۔ اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا

کہ میں اس خلا کو کس طرح سے پر کروں، اس لیے آپ کو خط لکھ رہی ہوں کہ اگر آپ کی نظر میں کوئی ایسا لٹریچر ہو جو بچے کو ضروری باتوں سے آگاہ کر سکے تو براہِ نوازش مجھے مطلع کیجیے۔ برطانیہ میں جو اس طرح کا لٹریچر دستیاب ہے وہ ہمارے ماحول اور تہذیب کے تقاضوں پر پورا نہیں اترتا۔

جنسی تعلیم کی کمی ہمارے مشاہدے کے مطابق لڑکیوں کے مقابلے میں لڑکوں کا بڑا مسئلہ ہے۔ کیوں کہ جیسا کہ پہلے عرض کیا کہ لڑکیوں کو بھی ان کی مائیں، حیض اور باقی چیزوں کے بارے میں بتا دیتی ہیں۔ عین شادی سے چند دن پہلے وہ ازدوجی تعلقات کے بارے میں بھی اشارتاً کچھ کہہ دیتی ہیں مگر کچھ گھرانوں میں بلاوجہ کی سختی کی وجہ سے مائیں بھی خصوصاً شادی سے پہلے لڑکیوں کو ضروری بات بتانے سے ہچکچاتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ شادی کے بعد وہ شوہر کو اپنا مونس ہمدرد اور رفیق سمجھنے کے بجائے اس سے خوف زدہ رہتی ہیں اور اس کی حیثیت ان کی نظر میں ایک شہوانی بھیڑیئے سے مختلف نہیں ہوتی۔ ابھی چند ماہ پیش تر ایک شادی ہوئی۔ لڑکے کی عمر ۲۲ سال تھی اور لڑکی کی ۸۱ سال۔ ہوا یہ کہ لڑکی کو ازدواجی زندگی کے بارے میں کچھ نہیں بتلایا گیا صرف رخصتی کے وقت گھر کی کسی بزرگ خاتون نے اتنا کہہ دیا کہ 'وظیفہ زوجیت ایک بہت تکلیف دہ عمل ہے، تمہیں صبر و برداشت سے کام لینا ہوگا۔' ان کی اس نامکمل تعلیم کا یہ نتیجہ نکلا کہ وہ لڑکی سخت خوف زدہ ہو گئی۔ تین ماہ

گزرنے کے بعد اس کے شوہر نے بتایا کہ وہ جب بھی قربت کا ارادہ کرتا ہے، خوف کی وجہ سے اس کی بیوی پر دورے جیسی تشنجی کیفیت طاری ہو جاتی ہے، جس کی وجہ سے وہ بے کیفی اور جھنجھلاہٹ کی زندگی بسر کر رہا ہے۔ یہ سب نامکمل جنسی تعلیم کا نتیجہ ہے۔

تحقیق یہ بتاتی ہے کہ جنسی معاملات سے بالکل علیحدہ رہنا یا اسے اخلاق سے گری ہوئی چیز، گندگی یا گالی سمجھنا بھی جنسی کمزوری پیدا کر دیتا ہے۔ چوں کہ جنس کے بارے میں انسان کے خیالات جنسی اعضا اور ہارمونز کے بننے پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ انسانی جسم کی یہ خصوصیت ہے کہ جن اعضا سے کام نہ لیا جائے یا کم لیا جائے وہ کمزور ہو جاتے ہیں۔ اب اگر آپ کا ذہن بچپن سے ہی نظام اور اعضا کی نفی کر رہا ہو اور اسے برا اور گناہ سمجھ رہا ہو، وہ کیسے جسم کے اندر پروان چڑھ کر مضبوط اور توانا ہو سکتے ہیں ؟ ایسے لوگ شادی کے بعد بہت حیران و پریشان ہوتے ہیں کہ اس قدر پاکباز زندگی بسر کرنے کے بعد بھی انھیں جنسی مسائل کا سامنا کیوں کرنا پڑ رہا ہے۔

یاد رکھیے کہ جنسی آزادی اور مثبت جنسی رہنمائی میں بڑا فرق ہے۔ جنسی آزادی نے ایڈز اور سنگین جنسی جرائم دنیا کو دیئے ہیں جب کہ جنسی تعلیم، (STI's) جنسی امراض تناسلی اعضا کے صحیح طریقے، صحیح وقت پر استعمال اور ان کی،

ضرورت واہمیت کی جانب توجہ دلاتی ہے تاکہ انسان اپنی شہوت کو قابو میں رکھ سکے۔
اس طرح سے جسم میں پیدا ہونے والی جنسی تبدیلیاں اور جنسی کشش جب رونما ہوگی تو آپ کا ذہن اس کے لیے پہلے سے تیار ہوگا جس کی وجہ سے ڈگر سے ہٹنے کے امکانات کم ہوجائیں گے۔
یہ معلوم کرنا کہ کس عمر میں جنسی رہنمائی حاصل کرنا چاہیے، بہت مشکل سوال نہیں ہے۔اس حوالے سے بھی ہمارے ہاں دو انتہائیں ہیں، ایک انتہا تو یہ ہے جو ابھی عرض کی کہ بالکل ہی شجر ممنوعہ بنا دیا جائے (چاہے کیبل، نیٹ اور لٹریچر سے بچہ خود ہی استفادہ' کرے تو کوئی بات نہیں) .... اور دوسری بڑی انتہا یہ ہے کہ مغرب کی' پیروی میں پرائمری کے بچوں کو جنسی تعلیم دینے کی بات کی جائے! یاد رکھیے کہ جب بھی جنسی اعضا میں تبدیلیاں شروع ہوں اور جنسی خواہشات پیدا ہونے لگیں، وہی وقت سب سے مناسب ہے۔ اس کے لیے جو بھی سوالات ذہن میں اٹھیں، انھیں بہت اچھے الفاظ اور پیرائے میں والد یا استاد یا خاندان کے کسی ایسے قریبی بزرگ سے دریافت کرلینا چاہیے یا اپنے خاندانی معالج سے بھی پوچھا جاسکتا ہے۔
ابھی میں نے ملک عزیز میں دو انتہاؤں کی بات کی، یہ دونوں طرف کی انتہا پسندی آگے بھی بڑھتی ہے۔مثلاً ایک نظریہ یہ ہے کہ غیر فطری جنسی اعمال خاص

طور پر 'مشت زنی' کی زیادہ اہمیت نہیں بلکہ کچھ لوگ تو اسے جنسی ہیجان کم کرنے کا ایک اچھا طریقہ بتلا کر گویا ایک طرح سے ہمت افزائی فرماتے ہیں۔جب کہ اس کے مد مقابل کچھ لوگ مشت زنی کو اتنا خطرناک بتاتے ہیں کہ جو لڑکا اگر ناسمجھی میں مشت زنی میں مبتلا ہو گیا، وہ گویا اب نامرد ہی ہو گیا ہے اور جب تک وہ ان کے زہریلے کشتوں اور طلاؤں کا استعمال نہیں کرے گا اور ہزاروں روپے نہیں پھونک دے گا، شادی کے قابل نہیں ہو سکتا۔ یہ دونوں انتہائیں درست نہیں۔ اعتدال کی بات یہ ہے کہ یہ عمل بہر حال اچھا فعل تو ہر گز نہیں کیوں کہ ہر وہ طریقہ جو فطرت کے خلاف ہو، اس کی تائید نہیں کی جا سکتی۔ جسم سے خارج ہونے والی رطوبت اگر اپنی طبعی مقدار سے زیادہ خارج ہونے لگے تب بھی صحت پر ان کے مضر اثرات پڑنا لازمی ہے۔ اگر کوئی شخص ضرورت سے زیادہ تھوکنے لگے یا اسے پیشاب جو کہ ایک فضلہ ہے، زیادہ آنے لگے تو اس کے بھی مضر اثرات صحت پر پڑنا لازم ہے۔ مگر سنیاسی بابوں اور اتائی معالجین کا یہ کہنا کہ یہ انتہائی خطرناک ہے، گمراہ کن بات ہے۔ بے شک یہ کوئی صحت مندانہ عادت نہیں ہے لیکن صرف اس عمل کو چھوڑ دینا ہی کافی ہے۔ کسی قسم کی دوا یا خصوصی غذا کی کوئی ضرورت نہیں، بالکل نہیں۔

جنسی معاملات میں جو غلط فہمیاں ہمارے معاشرے میں عام ہیں اور انھیں مرض نہ ہوتے ہوئے بھی مرض سمجھ کر معالجین کے پاس جایا جاتا ہے اور خود کو کم زور

اور بیمار تصور کیا جاتا ہے، ان میں سے چند یہ ہیں :

احتلام :

یعنی نیند کی حالت میں خواب آ کر یا بغیر خواب کے مادہ منویہ کا خارج ہو جانا۔ یہ اگر ماہ میں پانچ چھ بار ہو رہا ہے تو ایک طبعی صورتِ حال ہے نہ اس سے پریشان ہونے کی ضرورت ہے اور نہ علاج کی۔ اگر اس سے زیادہ ہوں تو بہت سیدھے سادے علاج بلکہ صرف ماہر معالج سے مشورے سے ہی کمی آ جاتی ہے۔

جریان مذی یا ودی :

یعنی پیشاب سے پہلے یا بعد میں چند لیس دار قطروں کا خارج ہو جانا یا جنسی خیالات کے وقت شفاف لیس دار قطروں کا خارج ہونا۔ یہ بھی کوئی بیماری نہیں ہے بلکہ ایک طبعی صورت حال ہے اس سے نہ صحت پر اثر پڑتا ہے اور نہ جنسی طاقت پر۔ یہ لیس دار قطرے تو جنسی عمل کی ضرورت ہیں، اس لیے خیالات کی وجہ سے یا جوانی میں شہوت کی زیادتی سے خارج ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر اس میں بہت زیادتی ہو جائے تو ناپاکی کا احساس بہرحال پریشان ضرور کر دیتا ہے، مگر اس میں بھی معمولی علاج سے آرام آ جاتا ہے۔

خصیوں (ٹیسٹی کلز) کا نیچے لٹکنا یا سکڑ جانا :

اسے عام طور پر بیماری سمجھا جاتا ہے جب کہ یہ قدرتی طور پر درجہ حرارت کو درست رکھنے کے لیے ہوتا ہے تاکہ اسپرمز کو کم یا زیادہ درجہ حرارت سے نقصان نہ پہنچے۔
:سائز میں کمی یا اس میں کمی محسوس ہونا یا اس پر ابھری ہوئی رگوں کا نظر آنا

لوگ اس سے عام طور پر بہت خوف زدہ ہو جاتے ہیں، حالاں کہ اِن میں سے کوئی بھی مرض نہیں ہے اور نہ ہی اس سے وظیفہ جنسی ادا کرنے میں کوئی فرق پڑتا ہے اور نہ استقرار حمل میں۔ ذرا سا ٹیڑھ پن بالکل نارمل بلکہ جدید تحقیق کے مطابق ایک قدرتی ضروری چیز ہے۔ رگوں کا ابھرا ہوا ہونا بھی کوئی اچنبھے یا فکر کی بات نہیں۔ اور جہاں تک سائز کا مسئلہ ہے تو حجاب مانع ہے ورنہ ہم تفصیل سے جدید تحقیقات سے اس طرح ثابت کرتے کہ ان شاء اللہ ہر نوجوان کو تشفی ہو جاتی۔ آپ کو پڑھ کر حیرت ہو گی کہ یہ سائز کا مسئلہ ایک عالمی مسئلہ ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق پوری دنیا میں مردوں کو جنسی مسائل میں سب سے زیادہ فکر اور تشویش اسی حوالے سے پائی جاتی ہے جب کہ مخلص ڈاکٹرز اور طبیب یہ بتاتے ہیں کہ وظیفہ جنسی اور استقرار حمل کے لیے تو صرف دو سے تین انچ بھی کافی ہے اور پوری دنیا کے مختلف ممالک اور نسلوں میں سائز کا اوسط نکالا گیا تو 4.50 سے 5.20 انچ آیا۔ مگر اس چیز کو ایک ہوّا بناتے ہوئے پوری دنیا

میں مفاد پرست لوگ کروڑوں ڈالر کا بزنس کر رہے ہیں اور زہریلے اسٹرائیڈز بیچ رہے ہیں۔ یہ سب وہم ہے جو مخرب اخلاق لٹریچر اور خراب فلموں سے نوجوانوں کے ذہن میں بیٹھ جاتا ہے۔ یاد رکھیے گندے لٹریچر میں بے حد مبالغہ کیا جاتا ہے اور ایسی فلموں میں بھی کیمرے وغیرہ سے دھوکا دیا جاتا ہے جس سے ہمارے نوجوان اپنے آپ کو دیکھتے ہوئے احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں!!

یہ اور اس طرح کی بہت سی چیزیں جو مرض کے نہ ہوتے ہوئے بھی مرض سمجھی جاتی ہیں اور ان کا ہفتوں اور مہینوں علاج کرایا جاتا ہے اگر ان کے بارے میں صحیح معلومات بروقت ہو جائیں تو خواہ مخواہ ذہن پریشان نہ ہو اور مال کے نقصان سے بھی محفوظ رہا جائے۔

!اے ضعفاء کے ربّ

ذہن و دل ماؤف ہیں.... کیا لکھا جائے؟.... نوحے، ماتم، مرثیے؟!.... مگر یہ ہماری روایت نہیں.... ہماری روایت تو سرفروشی ہے.... سر پر کفن باندھ کر ظالموں سے ٹکرا جانا ہے.... ایک مظلوم مسلمان کی مدد کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دینا ہے.... لیکن یہ پرانے وقتوں کے قصے ہوئے.... اب تو ہمیں تیر و تفنگ سب بھول گئے.... بس آنسو بہاتے ہوئے اپنے شہداء کے لاشے اٹھاتے ہیں.... قلم تھامے مرثیے تحریر کرتے ہیں.... یا زیادہ سے زیادہ جاہل عورتوں کی طرح نوحے کرتے ہوئے دشمنوں کو کوستے ہیں!!

اب تو یوں لگتا ہے کہ دنیا بھر کی بلاؤں اور آفتوں نے صرف مسلمانوں کے گھر دیکھ لیے ہیں۔ ہر روز صبح اپنے جلو میں ایک نئی قیامت لیے طلوع ہوتی ہے، اور یہ ساری قیامتیں مسلم امہ پر ہی اترتی ہیں۔ کس کس کا دکھڑا رویا جائے؟ مشرقِ وسطیٰ کے داغ داغ سینے پر پہلے عراق، مصر، شام اور اب فلسطین کا تازہ المیہ تو حساس دلوں کو خون کے آنسو رلا رہا ہے۔ صیہونیوں نے عین رمضان کے مہینے میں غزہ کے نہتے شہریوں پر آگ و خون کی بارش کر دی اور دنیا حسبِ معمول تماشا دیکھتی رہی.... چند روایتی بیانات اور بس! اور ویسے بھی جب فٹبال کا عالمی سحر انگیز میلہ سجا ہو، کھیل کے میدان میں ہار جیت پر تماشائی جان سے

گزر رہے ہوں تو بھلا کون اِدھر ادھر وقت خراب کرے؟ ایسے میں اگر کہیں کوئی طالع آزما مظلوم مسلمانوں کو ہی فٹبال بنا کر جوتی کی نوک پر رکھ رہا ہو، ان کا شکار کھیل رہا ہو، تو ان کی بلا سے .... مسلمان ان کے نزدیک انسان ہیں بھی کہاں؟ بلکہ شاید جانور کے برابر بھی نہیں! ورنہ کتے، بلی، بندروں کے حقوق کے لیے تو آج کا 'مہذب' انسان آنسو بھی بہاتا ہے اور لاکھوں ڈالر خرچ کرکے ملٹی نیشنل این جی اوز بھی بناتا ہے، لیکن مسلمان، برما کا ہو یا افغانستان کا، عراق شام کا ہو یا پھر فلسطین کا، ان کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بھیڑ بکریوں کی طرح ان کو ذبح کر دیں، زندہ جلا دیں یا بموں سے ان کے جسموں کے ٹکڑے کر دیں، کوئی رونے والا نہیں ہے۔ اور یہ تو غیر ہیں، خود کروڑوں مسلمان اپنے مظلوم بھائیوں پر ظلم و ستم کی انتہا پر سنگدلانہ خاموشی اختیار کیے اپنے روزمرہ معمولات زندگی میں گم ہیں۔ ذرا تھوڑی دیر کے لیے تصور تو کیجیے کہ ہمارے معصوم بچوں، بوڑھوں اور خواتین کو گھر بیٹھے راکٹ مار کر زندہ جلا دیا جائے تو سوچیے ہم پر کیا گزرے گی؟ یہی ہو رہا ہے اس وقت غزہ میں .... جہاں خون آشام اسرائیل نے صرف پندرہ دنوں میں درندگی اور بہیمیت کا اپنا سابقہ ریکارڈ خود ہی توڑ دیا ہے.... تادمِ تحریر غزہ کے بدنصیب خطے میں 1500 فلسطینی شہید اور ہزاروں شدید زخمی ہو چکے.... آج کل اخبارات اور انٹرنیٹ پر ان مظالم کی منہ بولتی ایسی ایسی انسانیت سوز تصویریں اور ویڈیوز آ رہی ہیں کہ پتھر دل آدمی بھی ہوش و حواس قائم نہ رکھ

سکے.... معصوم بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے بدن.... سربریدہ لاشیں.... روتی چلاتی مائیں.... لیکن شاید یہ مناظر ہمارے لیے کوئی نئی بات نہیں رہے.... پچھلے چھ برسوں میں یہ اہلِ غزہ پر تیسری بار آتش و آہن کی بارش ہوئی ہے.... پہلے بھی ہم نے سب کچھ دیکھا، اور سکون سے جیتے رہے.... ابھی بھی زیادہ سے زیادہ کیا ہوگا.... خون آشام اسرائیل جب تک جی چاہے گا، اُن کے لہو سے اپنی پیاس بجھائے گا.... اور پھر چند مہینوں یا برسوں کا وقفہ دے گا تاکہ اگلی نسل پھر اس کو اپنے خون کا خراج دینے کے لیے تیار ہو جائے....

یہ سب کچھ اپنی جگہ، فلسطین کے آس پاس 26 عرب ریاستوں کے بے حس حکمرانوں کا مخنث پن بھی اپنی جگہ، یہ بھی تسلیم کہ اہلِ غزہ ظالم صیہونیوں کے مقابلے میں تعداد میں تھوڑے اور اسلحہ و جنگی ٹیکنالوجی میں کئی دہائیاں پیچھے ہیں.... مگر اُن کی بہادری، ہمت اور بے جگری کی بہر حال داد دیجیے کہ اگر سینکڑوں نہتے مسلمان شہید ہو کر اللہ میاں کے پاس اعلیٰ درجات پا چکے.... تو اِن نہتے مسلمانوں نے بھی محض ایمان کی طاقت پر ساٹھ ستر صیہونی جہنم واصل کر ہی دیے.... اگر سینکڑوں مظلوم مسلمان شدید زخمی ہیں جن کو چاروں طرف موجود اسلامی ممالک اپنی سرحدوں میں داخل بھی نہیں ہونے دے رہے تو.... فلسطینی نوجوانوں نے بھی کئی ناپاک صیہونی فوجیوں کو زندگی بھر کے لیے معذور کر دیا ہے.... اگر مسلمان مائیں رو رہی ہیں تو ان ماؤں کے لاڈلوں نے

یہودیوں کی عورتوں کو بھی مکہ کی مشرک عورتوں کی طرح سر پر مٹی ڈالنے پر مجبور کر دیا ہے.... ہاں مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا ہے.... شاباش ہے .... مگر رونا تو خود اپنے اوپر اور ساری مسلم امہ پر ہے.... پیارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو فرما رہے کہ مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں.... ایک عضو کو تکلیف ہو تو سارا جسم تکلیف میں ہوتا ہے.... مگر اس حدیث کی روشنی میں ہمیں دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں!.... وہی بریانی تکے.... وہی نفیس پوشاک....وہی ہنسی مذاق.... ہاں جب ضمیر زیادہ ہی کچوکے مارتا ہے تو.... فیس بک پر کسی شہید فلسطینی بچے کی تصویر شیئر کر دیتے ہیں.... کوئی ایک دردانگیز کالم لکھ لیتے ہیں.... یہودیوں کو گالیاں دے لیتے ہیں اور بس!....کیا یہ مومنوں کے کام ہیں؟.... اگر ایسے ہی ہم عاجز ہیں.... کچھ نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنی غیرت تو رکھتے کہ ان کی چیزوں کا بائیکاٹ ہی کر دیتے.... لیکن ہمارا تو کھانا ہضم نہیں ہوتا اگر پیپسی نہ پئیں.... پیٹ نہیں بھرتا اگر 'کے ایف سی' کے برگر سے شوق نہ کریں.... اس لحاظ سے ہم سے اچھے تو وہ یورپی عوام ہیں.... جنھوں نے نہ صرف مسلمانوں کے شانہ بشانہ احتجاج میں حصہ لیا بلکہ اسرائیلی مصنوعات کا بائیکاٹ بھی کیا!

یہ سب جو لکھا یہ اس قوم کے نوجوانوں کے لیے ہے.... جنھیں اب بھی کرکٹ اور اداکاروں سے فرصت نہیں ہے۔ خواتین تو شرعاً اس کی مکلّف ہی نہیں....ہاں وہ

خواتین جو یہ پڑھ رہی ہیں، وہ جو کر سکتی ہیں، وہ تو کریں .... ان کی مصنوعات کا بائیکاٹ کریں.... روزانہ دو رکعت صلوۃ الحاجت پڑھ کر اپنے مسلمان بھائی بہنوں کے لیے رو رو کر دعائیں کیجیے.... اسی طرح ان ظالم کافروں کے لیے جن کے نصیب میں ہدایت نہیں، تباہ.برباد ہونے کی جو بددعائیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت ہیں.... ان کا معمول بنایئے.... ان شاء اللہ خواتین عنداللہ جوابدہی سے بچ جائیں گی.... تو ہاتھ اٹھایئے

اَللّٰھُمَّ مُنزِلَ الکِتَابِ، سَرِیعَ الحِسَابِ،

اِھزِمِ الاَحزَابِ،اَللّٰھُمَّ اھزِمھُم وَزَلزِلھُم

اے اللہ کتاب کو نازل کرنے والے، جلد حساب لینے والے، لشکروں کو شکست دے دے، اے اللہ انہیں شکست دے اور انہیں ہلا کر رکھ دے۔ [مسلم]

اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَجعَلُکَ فِی نُحُورِھِم وَنَعُوذُبِکَ مِن شُرُورِھِم۔

اے اللہ! ہم تجھے ہی ان کے مقابلے میں رکھتے ہیں اور ان کی شرارتوں سے تیری پناہ چاہتے ہیں۔" [ابو داؤد]

اے اللہ!.... اے ضعفاء کے ربّ!.... اے الرحم الراحمین!

قبض وہم اور حقیقت، ایک نیا تناظر

مفروضہ: آپ کو روزانہ رفع حاجت کرنا چاہیے!

یہ 'معمول' ہر شخص میں مختلف ہوتا ہے، کچھ لوگوں کو دن میں تین وقت اجابت ہوتی ہے، جب کہ دوسرے افراد ہفتے میں صرف تین بار رفع حاجت کے لیے بیت الخلاء جاتے ہیں۔ اگرچہ رفع حاجت کا عام معمول دن میں ایک بار ہے۔ اگر ہفتے میں تین بار سے بھی کم حاجت محسوس ہو تو وہ قبض کے زمرے میں آتی ہے۔

مفروضہ: قبض زہریلے مادے اور صحت کے مسائل پیدا کرتا ہے!

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قبض پاخانے میں موجود زہریلے اجزا کے جسم میں انجذاب کا سبب بنتا ہے۔ ان کو یقین ہے کہ یہ عمل بیماریوں مثلاً آرتھرائٹس (نقرس، گٹھیا) دمہ اور قولون کے کینسر کا سبب بنتا ہے لیکن اس بات کا کوئی ثبوت موجود نہیں کہ پاخانہ زہریلے اجزاء پیدا کرتا ہے یا قولون کی صفائی، ملین ادویہ واشیاء یا اینمیا.... کینسر یا دیگر بیماریوں کو روک سکتے ہیں۔

مفروضہ: قبض کا مطلب یہ ہے کہ مجھے مزید ریشے کی ضرورت ہے!

خوراک میں فائبر (ریشے) کا اضافہ اکثر اوقات قبض میں مددگار ثابت ہوتا ہے

لیکن پرانا قبض جسم میں کسی مسئلے کی علامت بھی ہو سکتا ہے۔ یہ تھائی رائیڈ گلینڈ کی ناقص کارکردگی اور ذیابیطس کی نشان دہی کر سکتا ہے۔ یہ پارکنسنز ڈیزیز یا اسٹروک یا ادویہ کے اثراتِ بد کا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ کبھی کبھار یہ بعض بیماریوں مثلاً قولون وریکٹم کے کینسر یا آٹو امیون بیماری کی علامت ہو سکتا ہے۔ اگر قبض مسلسل دو ہفتے سے زیادہ عرصہ تک رہتا ہے یا اجابت میں خون نظر آتا ہے یا رفع حاجت کے وقت شدید درد ہوتا ہے یا بغیر کسی ظاہری سبب کے وزن میں کمی واقع ہو رہی ہے تو اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

! حقیقت: ڈیری (دودھ اور دودھ سے بنی اشیائ) قبض کا سبب بن سکتی ہیں

اگر آپ لیکٹوس کی عدم برداشت رکھتے ہیں تو ڈیری کا استعمال قبض کا سبب بن سکتا ہے۔ لیکٹوس کی عدم برداشت رکھنے والے زیادہ تر لوگ ہر روز کم از کم قلیل مقدار میں ڈیری استعمال کر سکتے ہیں، اگر ڈیری کی کم مقدار بھی آپ کو قبض میں مبتلا کر دے تو اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔؟

! حقیقت: نگلی ہوئی گم پھنس سکتی ہے

یہ سچ ہے لیکن صرف بہت کم کیسز میں اور صرف چھوٹے بچوں میں جو گم نگلنے کے علاوہ کچھ نہیں جانتے، ایسا ہوتا ہے۔ بعض اوقات گم کی بڑی مقدار نگلنے یا مختصر وقت میں اس کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے نگل جانا ہاضمے کی نالی میں بڑی

رکاوٹ پیدا کر سکتا ہے۔ بالخصوص اگر آپ اس کو دیگر ناقابلِ ہضم اشیاء کے ساتھ نگل لیں تو یہ رکاوٹ قبض کا سبب بن سکتی ہے۔ لیکن زیادہ تر لوگوں میں گم کے غیر ہاضم حصے آنتوں کی نالی میں حرکت کرتے رہتے ہیں اور بالآخر دیگر غذاؤں کی طرح جسم میں تحلیل ہو جاتے ہیں۔ اسی لیے اتفاقی طور پر گم کا ٹکڑا نگل جانا بے ضرر ہے۔

! حقیقت: سفر قبض پیدا کر سکتا ہے

سفر آپ کے روزمرہ کے معمولات اور خوراک میں تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ پانی کی کمی کے نتیجے میں ہونے والے قبض سے پانی کے مناسب استعمال کے ذریعے بچیں۔ بالخصوص اس وقت جب آپ بذریعہ طیارہ سفر کر رہے ہوں۔ جب بھی فرصت ملے، چلیں پھریں، مثال کے طور پر جب آپ طیارے کے منتظر ہوں یا ڈرائیونگ کے دوران جب آرام کے لیے رکیں۔ دیگر سفری نسخوں میں ورزش، الکحل کا عدم استعمال اور پھلوں اور سبزیوں کا بکثرت استعمال شامل ہے۔

! حقیقت: مزاج آپ کی باقاعدگی پر اثرانداز ہو سکتا ہے

ڈپریشن قبض کا سبب بن سکتا ہے یا اس میں شدت اور بگاڑ پیدا کر سکتا ہے۔ ذہنی دباؤ کو ادویہ کے استعمال، یوگا، پرسکون رہنے کی تکنیکس کے ذریعے کم کرنا مدد دے سکتا ہے۔ ایکوپریشر یا شیاتسو مساج بھی مدد کر سکتا ہے۔ پیٹ کی

مالش (مساج) ان عضلات کو جو آنتوں کو سہارا دیتے ہیں، پرسکون کرنے اور آپ کی آنتوں میں فضلے کو حرکت دینے میں مدد کر سکتی ہے۔

! مفروضہ: حاجت کو روکنا باعثِ ضرر نہیں

آپ اپنے کام میں اتنے مصروف ہیں کہ آپ کو رفع حاجت کا وقت نہیں مل رہا ہے یا آپ گھر جانے تک حاجت رفع نہیں کرنا چاہتے۔ اس طرح آپ ایک ایسی ضرورت کو نظر انداز کر رہے ہیں جو نہ صرف آپ کو جسمانی طور پر بے چین رکھ سکتی ہے بلکہ یہ .بروقت ملنے والے اشارات کو کمزور کرکے قبض کا سبب بن سکتی ہے یا اس میں شدت پیدا کر سکتی ہے۔ بعض لوگ صرف ناشتے یا دیگر کھانے کے بعد کا وقت رفع حاجت کے لیے مقرر کرتے ہیں لیکن جب بھی فطری طور پر حاجت محسوس ہو، فراغت حاصل کر لینی چاہیے۔

! حقیقت: ادویہ کا استعمال قبض کا سبب بن سکتا ہے

درد، ہائی بلڈ پریشر، ڈپریشن اور پارکنسنز ڈیزیز کی بعض ادویہ قبض پیدا کر سکتی ہیں۔ کیلشیم اور فولاد کا زیادہ استعمال بھی قبض کا باعث بن سکتا ہے۔ کیلشیم سپلیمنٹس بالخصوص اگر کسی دوسرے سپلیمنٹ کے ساتھ لیے جائیں یا ایسی ادویہ جو آنتوں میں فضلات کو روک دیں، اس مسئلے کا سبب بن سکتی ہیں۔ اگر ایسی صورت حال ہے تو اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

! حقیقت: کم ریشے والی خوراک قبض کا سبب بن سکتی ہے

اپنی خوراک میں کافی مقدار میں ریشہ نہ لینا بسا اوقات قبض کا سبب بن جاتا ہے۔ اس سے بچاؤ کے لیے کم سے کم 20 گرام یومیہ ریشہ استعمال کریں۔ اس سے زیادہ کا استعمال اور زیادہ بہتر رہے گا۔ پھل اور سبزیاں زیادہ سے زیادہ استعمال کریں۔ سفید چاول، سفید آٹے کی روٹی، سفید شکر اور پاستا کی جگہ سالم اناج والی غذائیں استعمال کریں۔ لیکن یاد رکھیں کہ گیس اور اپھارے کو روکنے کے لیے ریشے کے استعمال میں بتدریج اضافہ کرنا چاہیے۔ پانی فضلے کو آنتوں سے گزارنے میں ریشے کی مدد کرتا ہے، اس لیے اپنی پیاس کو نظر انداز نہ کریں۔ فوری نتائج کی توقع نہ رکھیں۔ ریشے کے چند روزہ مستقل استعمال کے بعد ہی آپ کو بہتری نظر آنے لگے گی۔

! مفروضہ: تمام ریشے ایک ہی طرح کام کرتے ہیں

ریشے والی خوراک لینے سے آپ کو شکم سیری محسوس ہوتی ہے اور اجابت بھی باقاعدگی سے ہوتی ہے۔ غیر حل پذیر ریشہ قبض کے خاتمے میں آپ کی خصوصی مدد کر سکتا ہے، کیوں کہ یہ غیر ہاضم ہوتا ہے اور پانی میں حل نہیں ہوتا۔ یہ آنتوں میں موجود فضلے کو بھاری کرتا ہے اور آنتوں سے تیزی کے ساتھ گزارنے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ غیر حل پذیر ریشے کے حصول کے اچھے ذرائع سالم (بغیر

صاف کیے ہوئے) اناج کی روٹیاں، سالم اناج اور دلیہ ہیں۔ حل پذیر ریشہ پانی میں حل ہو جاتا ہے۔ غذا کے حصے کے طور پر یہ سیر شدہ چکنائی اور کولیسٹرول کا بہت کم حامل ہوتا ہے۔ یہ دل کی بیماریوں کے خطرات بھی کم کرتا ہے۔ حل پذیر ریشہ پھلیوں کے بیجوں، مٹر اور بعض دیگر اناج، سبزیوں اور پھلوں میں پایا جاتا ہے۔

!حقیقت: آلو بخارا اجابت میں باقاعدگی پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے

یہ چھوٹا، خشک پھل قبض کے 'قدرتی علاج' کی حیثیت سے بہت زیادہ شہرت کا حامل ہے۔ آلو بخارے (جنہیں آلوچے بھی کہا جاتا ہے) قبض کو دور کر سکتے ہیں یا پھر اس میں بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ غیر حل پذیر ریشے سے پر ہوتے ہیں اور ان میں قدرتی ملین اشیاء ساربیٹال اور ڈائی ہائیڈرو فائلیساٹین بھی موجود ہوتی ہیں۔ یہی نہیں بلکہ آلو بخارے میں پائے جانے والے حل پذیر ریشے سے کولیسٹرول بھی کم ہو جاتا ہے اور یہ طویل المدتی قبض کے لیے بھی فائدہ بخش ہوتے ہیں۔ وہ بچے جو آلو بخارے پسند نہیں کرتے، اس کے جوس کے آئس پاپس کھا سکتے ہیں یا آلو بخارے کا جوس ذائقہ بدلنے کے لے انہیں کسی دوسرے جوس کے ساتھ ملا کا دیا جا سکتا ہے۔

!حقیقت: پینے سے مدد مل سکتی ہے

بکثرت پانی پینا ڈی ہائیڈریشن (جسم میں پانی کی کمی) کو روکتا ہے جو قبض کا سبب بن سکتی ہے۔ مائعات قبض سے بچانے کے لیے اجابت کو نرم رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ اپنے ڈاکٹر سے معلوم کریں کہ آپ کے لیے کتنا پانی پینا مناسب ہو گا۔ اس کے علاوہ کیفین آمیز مشروبات مثلاً چائے، کافی اور کولا مشروبات کا استعمال محدود کریں، کیوں کہ ان کا زیادہ استعمال ڈی ہائیڈریشن کا سبب بن سکتا ہے۔

! حقیقت: ورزش آپ کی اجابت میں باقاعدگی لا سکتی ہے

جسمانی سرگرمیوں کا فقدان قبض کا سبب بن سکتا ہے، اس کے بالمقابل ورزش آپ کی اجابت میں باقاعدگی پیدا کر سکتی اور دباؤ دور کر سکتی ہے۔ لیکن کھانا کھانے کے تقریباً ایک گھنٹے بعد ورزش کرنی چاہیے۔ اس کے ساتھ دن میں متعدد بار 10 تا 15 منٹ پیدل چلیں۔ جسم کو کھینچنا اور پھیلانا اور یوگا قبض سے نجات میں آپ کی مدد کر سکتا ہے۔

! مفروضہ: کافی قبض دور کر سکتی ہے

یہ سچ ہے کہ کافی میں موجود کیفین آپ کے نظام ہاضمہ کے عضلات کو متحرک کر سکتی ہے، جس کے نتیجے میں فضلات بھی متحرک ہو جاتے ہیں۔ مگر پھر کافی کی بطور ایک قبض کشا دوا کے سفارش کیوں نہیں کی جاتی؟ درحقیقت کافی فضلات کے

آنتوں سے گزرنے کو مشکل بنادیتی ہے کیوں کہ یہ پیشاب آور بھی ہوتی ہے۔ اس لیے یہ فضلات میں سے پانی کو کھینچ کر انہیں خشک کردیتی ہے۔ اس لیے اگر آپ کو قبض رہتا ہے تو آپ کافی اور دیگر پیشاب آور اشیا مثلاً الکحل اور کیفین والی چائے اور کولا سے پرہیز کریں۔

! مفروضہ: قولون کی صفائی قبض دور کرے گی

اینیما اور قولون کی دھلائی عارضی طور پر جسم کے فضلات دور کرسکتی ہے، لیکن یہ قبض کے علاج یا اس سے نجات کے موثر طریقے نہیں ہیں۔ ان معمر افراد میں جو باقاعدگی سے اینیما لیتے ہیں یہ حقیقتاً قبض کا سبب بنتے ہیں۔ قولون اریگیشن (قولون کی دھلائی) جو قولون کے ماہرینِ صحت اور معالجین کی جانب سے بالعموم کی جاتی ہے قولون کو نقصان پہنچاسکتی اور دیگر مسائل کا سبب بن سکتی ہے۔

! مفروضہ: لیگزیٹیو (ملین ادویہ) فوری کام کرتی ہیں

جو ملین دوا آپ استعمال کرتے ہیں یہ اس پر منحصر ہے کہ وہ فضلے کو متحرک کرنے میں آپ کو چند منٹ کا یا چند دنوں کا انتظار کرائے۔ سپاریٹری ایک گھنٹے کے اندر کام کرسکتی ہے، اس کے بالمقابل آپ کو بھاری ریشے کی مصنوعات کے نتائج کئی دنوں میں دیکھنے کے لیے اس کا روزانہ استعمال کرنا پڑے گا۔

زیادہ تر ملین ادویہ مختصر المدتی استعمال کے لیے ہوتی ہےں۔ ان کا زیادہ استعمال ہاضمے کے دیگر مسائل پیدا کر سکتا ہے۔ قبض بالعموم چند دن میں ختم ہو جاتا ہے اور شاذ و نادر ہی خطرناک صورت اختیار کرتا ہے۔ اگر آپ کو چند ہفتوں سے زیادہ ملین ادویہ لگزیٹیوز) کے استعمال کی ضرورت ہو تو اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔)

! حقیقت: اجابت کو نرم کرنے والی ادویہ، ملین ہوتی ہیں

اجابت کو نرم کرنے والی ادویہ قولون سے پانی کے فضلے میں انجذاب کو بڑھاتی ہیں اور اس طرح فضلے کو سخت ہونے سے بچاتی ہیں۔ نرم فضلے کا جسم سے اخراج آسان تر ہو جاتا ہے۔ دیگر ملینات کی طرح اجابت کو نرم کرنے والی ادویہ کو مختصر المدتی آرام کے لیے لینا چاہیے۔ اجابت کو نرم کرنے والی ادویہ (اسٹول سافٹنر) کے ملین ادویہ اور قبض کے دیگر علاج کے ساتھ استعمال سے قبل اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ بعض کیسوں میں ڈاکٹر اسٹول سافٹنر (اجابت نرم کرنے والی ادویہ) کو جراحی کے مریضوں کے لیے تجویز کرتے ہیں جنہیں دورانِ اجابت کھنچاؤ اور دباؤ سے بچانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض ادویہ میں اسٹول سافٹنر کے ساتھ ملین ادویہ بھی شامل ہوتی ہیں تاکہ اجابت با آسانی ہو سکے۔

! مفروضہ: کیسٹر آئل شافی علاج ہے

کیسٹر آئل ایک طاقت ور لگزیٹیو (ملین) ہے لیکن دیگر ملینات کی طرح اسے طویل عرصے استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ ملینات کا حد سے زیادہ استعمال آپ کے جسم کے غذائی اجزا اور بعض ادویہ کے انجذاب کی صلاحیت کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کیسٹر آئل کا حد سے زیادہ استعمال آنتوں کے عضلات، اعصاب اور ٹشوز کو نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اسے صرف ڈاکٹر کی زیر نگرانی استعمال کیا جانا چاہیے۔

! مفروضہ: قبض صرف معمر افراد کا مسئلہ ہے

معمر افراد میں قبض کا امکان زیادہ ہوتا ہے۔ یہ طبّی حالات نا، قص غذائیت، ادویہ کے زیادہ استعمال یا ناکافی جسمانی سرگرمی کے سبب ہو سکتا ہے لیکن قبض عمر کے دیگر گروپوں میں بھی معدے اور آنتوں کے مسائل میں سب سے زیادہ عام مسئلہ ہے اور حمل یا زچگی یا عملِ جراحی کے بعد کوئی غیر معمولی مسئلہ نہیں ہے۔ یاد رکھیں کہ اگر آپ قبض کو دور کرنے کے لیے کوئی چیز استعمال کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

ماں کی بددعا ایک عبرت انگیز واقعہ

کچھ ایسے واقعات زندگی میں پیش آتے ہیں، جنہیں ہم چاہیں بھی تو بھلا نہیں سکتے ۔ایسا ہی ایک واقعہ ہمارے ایک جاننے والے صاحب کے ساتھ پیش آیا تھا۔ آیئے آپ بھی وہ واقعہ ان کی زبانی سنیں:

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں پاک آرمی سے تقریباً ایک ہفتے کی چھٹی لے کر اپنے بچوں کو ان کی نانی کے ہاں لے کر جارہا تھا۔ بچوں کی چھٹیاں ہوچکی تھیں، اس لیے وہ ضد کررہے تھے کہ ہمیں نانی کے ہاں لے کر چلیں۔ مسئلہ میری چھٹیوں کا تھا، جو مشکل سے ہی ملتی تھی ، خیر اللہ کرکے ہمیں چھٹی ملی اور ہم اپنے بچوں کو کوئٹہ سے منڈی بہاؤالدین لے جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ پلیٹ فارم پر پہنچے تو پتا چلا کہ گاڑی تقریباً آدھا گھنٹہ لیٹ ہے۔آخر کار ریل گاڑی پلیٹ فارم پر پہنچ گئی۔ہمارے ڈبے میں رش زیادہ تھا، سب لوگ باری باری سوار ہونے لگے، ہم بھی سوار ہو گئے۔ بالکل آخر میں ایک میجر صاحب تھے، جو اپنے بچوں کو ریل گاڑی میں سوار کرا ہی رہے تھے کہ ریل آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ میجر صاحب نے اپنے بچوں کو جلدی جلدی گاڑی میں سوار کیا اور خود بھی گاڑی میں سوار ہونے کے لیے ایک آدمی کو ہاتھ دیا کہ اچانک ہی

گاڑی کی رفتار تیز ہو گئی اور میجر صاحب کا ہاتھ اس آدمی کے ہاتھ سے پھسل گیااور وہ نیچے گر پڑے۔ ایک شور اٹھااور ریل گاڑی جھٹکے سے رک گئی۔ تمام مسافر ریل گاڑی سے اترنے لگے اور میجر کے گرد حلقہ بنا کر کھڑے ہو گئے۔ جیسے ہی میں نے میجر کی طرف دیکھا تو دل ہل کر رہ گیا، کیوں کہ ان کی دونوں ٹانگیں جسم سے علیحدہ ہو گئی تھیں اور خون بے تحاشا بہہ رہا تھا۔میجر صاحب آہ و بکا کر رہے تھے لیکن اپنے ہوش میں تھے۔میں کھڑا دل ہی دل میں ان کی ہمت کو داد دے رہا تھاکہ اتنی تکلیف میں بھی وہ بے ہوش نہیں ہوئے تھے۔ پھر اچانک میجر صاحب درد بھری آواز میں چلائے:

”لوگو! آج میں نشانِ عبرت بن گیا ہوں۔ ہاں مجھ سے عبرت حاصل کرو! میں بدبخت نامراد ہوگیا، خدارا کبھی... بھ...ی... بھی اپنے والدین کی نافرمانی نہ کرنا، دیکھو یہ ہے نافرمانی کا انجام، یہ ہے میری بدقسمتی، کہاں ہے میرا عہدہ؟ کہاں ہے؟ جو مجھے ماں کی بددعا سے بچا نہ سکا...“ ہجوم تیزی سے بڑھ رہا تھا، شاید ریلوے پولیس نے ایمبولینس بلوالی تھی مگر ان کی یہ غیر متوقع بات سن کر مجمع کو سانپ سونگھ گیا۔ سب دم بخود ان کے چہرے کو دیکھنے لگے۔ چند ثانیوں کے بعد وہ دوبارہ بولے:

”مجھ پر خدا کی مار ہے، بے شک خدا کی لاٹھی بے آواز ہے، کسی نے مجھے نہ بچایا، کسی میں قدرت نہیں کہ وہ خدا کے عذاب سے کسی کو بچاسکے، ہاں یہ ہے بدنصیبی، یہ میں ہوں جو کل خود کو کچھ زیادہ ہی اونچا گمان کرتا تھا، اتنا

اونچا کہ اس کے آگے اپنے والدین کی بھی کوئی قدر و منزلت نہ تھی، آہ... ہ... ہ وہ بھیانک دن، وہ خوف ناک صبح جب میں نے تنگ آکر اپنے بوڑھے والدین کو خوب مارا اور جب میں مارمار کر تھک گیا تو میری ماں نے صرف یہ کہا: 'اے خدا! اے مالک تو نے اس کی ٹانگیں کیوں نہ توڑ دیں؟'... یہ شکوہ نہیں بلکہ بددعا تھی جس کا نتیجہ آپ سب لوگوں کے سامنے ہے۔''

بس یہ چند جملے تھے، جو میجر نے کہے پھر درد کی شدت کے باعث اس کی زبان بند ہو گئی۔ اتنے میں ایمبولینس آگئی اور کچھ لوگ اسے ہسپتال لے گئے۔ یہ واقعہ سن کر ہمارا دل لرز کر رہ گیا۔ خدایا! کیا واقعی کوئی اپنے والدین کو مار سکتا ہے؟

کم بخت یادیں

کم بخت یادیں (1)

(نوٹ: مندرجہ ذیل تینوں واقعات سچے ہیں۔۔۔مگر انہیں حالات حاضرہ پر منطبق کرنے والا خود ذمہ دار ہے!)

یہ کم بخت یادیں کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتیں۔۔۔اب دیکھ لو بیٹھے بیٹھے 99 یاد آ گیا۔۔۔نہیں نہیں۔۔۔مشرف نہیں یاد آیا۔۔۔کم بخت یادوں کا یہ مطلب نہیں کہ کوئی کم بخت ہی یاد آئے!۔۔۔ہمیں تو اندرون سندھ ٹنڈوآدم میں اپنی گفٹ شاپ یاد آئی۔۔۔کیا بے فکری کے دن تھے اور مزے کی راتیں۔۔۔دکان ایک شاپنگ سینٹر میں تھی۔۔۔اُس سال کا ایک خاص واقعہ اس سینٹر میں ایک بڑی چوری تھی۔۔۔حبیب سینٹر میں بائیس پچیس دکانیں ہیں اور سب خوب چلتی ہوئیں۔۔۔تو ہوا ایک رات یہ کہ حبیب سینٹر میں ایک بڑی دکان میں "بڑی" چوری ہو گئی۔۔۔صبح جب گھر سے نکل سینٹر پہنچا تو باہر رش لگا ہوا تھا۔۔۔سینٹر کے اندر سے تیسری دکان بھائی یوسف کی الٹی پلٹی تھی اور۔۔۔جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔۔۔ایک طرف سینٹر کا چوکیدار چہرہ فق، ہکا بکا بڑی بے چارگی سے کھڑا ہوا تھا۔۔۔میری آمد سے پہلے ہی شاید اس سے پوچھ گچھ ہوئی تھی۔۔۔یوسف بھائی ایک طرف سرنگوں بیٹھے اپنے مقدر کو رو رہے تھے۔۔۔کئی لاکھ کی چوری

تھی !۔۔۔ سب زور زور سے اپنی بونگیاں مار رہے تھے۔۔۔ مگر اب ان "چولوں" کا کیا فائدہ تھا۔۔۔ اچانک یوسف بھائی کا بڑا بیٹا اور ایک دور شتے دار چوکیدار پر پل پڑے۔۔۔ اک شور مچ گیا۔۔۔ چھڑاتے چھڑاتے بھی بے چارے کا حشر نشر ہو گیا تھا۔۔۔ مارنے والے اس پر الزام لگا رہے تھے۔۔۔ تب ہمیں پتہ چلا کہ تالا ٹوٹا ہوا نہیں بلکہ کھلا ہوا پایا گیا۔۔۔ بات مشکوک ہو گئی تھی۔۔۔ وہ بے چارہ روتے ہوئے یہی کہے جا رہا تھا۔۔۔ میری آنکھ لگ گئی تھی۔۔۔

آنکھ لگ گئی تھی یا بھنگ پی کر پروازیں کر رہا تھا؟ !ایک چلایا۔

اور واقعی یہ بات ٹھیک تھی، سب جانتے تھے کہ وہ بھنگ بھی پیتا تھا،چرس کے سٹے بھی لگاتا تھا اور کبھی کبھار کوکین کے نشے میں دم مارو دم بھی کرتا تھا !۔۔۔اندازہ یہی ہو رہا تھا کہ رات کو بھی وہ چرس کے سٹے لگا کر آسمانوں کی سیر کر رہا تھا کہ ڈاکوؤں کو تالا توڑنے کا کشٹ نہیں اٹھانا پڑا اور انھوں نے آرام سے چابی پار کی اور دکان کا مال اور رقم لے اڑے۔۔۔

بہرحال زیادہ کیا ہوتا؟ چوکیدار کو تبدیل کیا گیا اور آیندہ کے لیے سیکورٹی سخت کر کے واقعہ پر مٹی ڈال دی گئی۔

(کم بخت یادیں (2

!اب آیئے ہمارا ہاتھ پکڑیئے اور 99 سے چھلانگ مار کر چلیے 2009 میں اس بار لٹنے کی کہانی خود ہمارے ساتھ ہوئی۔ہم 25000 کا ایک عدد چیک کیش کروانے ایم اے جناح روڈ، سول اسپتال کے پاس ایک بینک میں گئے (بینک کا نام لکھنا شاید مناسب نہیں ہے)۔ کراچی میں رہنے والے احباب جانتے ہیں‌کہ دن میں وہ کتنا مصروف ترین علاقہ ہے! بہرحال ہم نے چیک کیش کروایا۔ بینک کے اندر ہی 500 کے ایک نوٹ کو چھوڑ کر رقم شلوار کی جیب میں رکھی ۔ 500 کا نوٹ سامنے کی جیب میں رکھا اور باہر نکل آئے۔ ڈاؤ سے مڑ کر اردو بازار والے سگنل کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ارادہ تھا کہ کچھ آگے موجود " دلپسند " پوائنٹ سے مزیدار فالودہ کھائیں گے کہ اچانک رانگ سائیڈ سے یعنی لائٹ ہاوس کی طرف سے دو موٹر سائیکلوں پر سوار چار لڑکے ساری ٹریفک کو چیرتے ہوئے ہمارے پاس رکے۔ دونوں پیچھے بیٹھے لڑکوں نے چھلانگ ماری اور ہم سے آ کر چپک گئے۔ اس افتاد پر ہم گھبرا گئے کچھ شرما گئے۔ مگر جب ایک سرد لوہے کی نال اپنی پسلی میں چبھی تو سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں شرماہٹ ختم ہو کر صرف گھبراہٹ رہ گئی۔ پیچھے والے لڑکے نے ہمیں تیز تیز گندی گالیاں دیتے ہوئے دوسرے لڑکے کو کہنا شروع کیا۔ مار اسے مار دے (گویا ہمیں دھمکا رہا تھا کہ کبھی بھولے سے بھی جیمز بانڈ بننے کی کوشش نہ کیجیو۔۔۔ ہمیں جان پیاری

تھی ، اس لیے ہم چپ رہے (کچھ نہ کہا، منظور تھا پردہ اپنا) اور ہم نے میکانکی انداز میں سامنے کی جیب سے پانچ سو کا نوٹ نکالا کہ انہیں تھمادیں کہ بچو ! اور کچھ نہیں ہے۔۔۔ دل میں یہ خیال تھا کہ ازار کی پوشیدہ جیب کا ان لونڈوں کو کیا پتہ ہوگا۔۔۔ مگرانتہائی حیرت انگیز طور پر لڑکے نے فوراً ہی ازار پر ہاتھ مارنا شروع کر دیا۔۔۔جیب کی زپ کا سرااس کے ہاتھ میں آیااور اس کے منہ سے بے اختیار نکلا: مل گئے !

اس نے زپ کھولی ، رقم نکالی اور موٹر سائیکل پر بیٹھ یہ جا وہ جا۔۔۔ اس ساری کارروائی میں مشکل سے ایک منٹ لگا ہوگا۔۔۔ نکتے کی بات یہ تھی کہ وہ اپنی پکی انفارمیشن" میں اتنے یکسو تھے کہ انھوں نے ہمارے ہاتھ کو دیکھا تک نہیں۔۔۔ اور" نتیجتاً جس 500 کے نوٹ کو ہم 24500 پر قربان کرنا چاہ رہے تھے، وہ ہمارے پاس ہی رہ گئے۔

اب یہ توکنفرم تھا کہ بینک کے اندر ان لٹیروں کا بندہ موجود ہے جو انہیں انفارمیشن دیتا ہے۔۔۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ بینک اس حوالے سے کافی بدنام ہے۔۔۔ بالکل اسی طرح ناگن چورنگی یوپی موڑ سے کچھ پہلے بھی ایک بینک اس حوالے سے بدنام ہے کہ وہاں اندر کی " انفارمیشن" پر کئی ڈکیتیاں اسی انداز میں ہو چکی ہیں !

ہم بہت اداس تھے مگر ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب کو اللہ خوش رکھے کہ انہوں نے نقصان پورا کر دیا۔۔۔ مگر اس دن ثابت ہوا کہ اتنی آسان ڈکیتیوں میں ضرور "اندر" والوں کی ملی بھگت ہوتی ہے!

(کم بخت یادیں (3

اب چلیے پھر چھلانگ ماریے اور آیئے 2014ء میں۔۔۔
پچھلے دنوں پھولوں کی ایک مشہور" دکان" (جہاں پھول امانتا رکھے جاتے تھے) لٹ گئی۔۔۔ لوٹنے والے آخری اطلاعات کے مطابق انسان نہ تھے بلکہ ان کے ڈی این اے سے ثابت ہوا کہ بش کی نسل سے تھے۔۔۔ تب ہی انہوں نے لوٹا کم اور پھولوں کو مسلا زیادہ۔۔۔ پھول چونکہ بہت قیمتی تھے۔۔۔ اور مالک بے چارہ جو پہلے بھی کئی بار بیچ بازار لٹ چکا تھا۔۔۔ اس لیے اس نے ایک سیکورٹی کمپنی کی خدمات لے رکھی تھیں، جس نے نہایت "بھاری معاوضے" پر نہ صرف دکان بلکہ چار کلومیٹر کے دائرے ہیں اپنے "بہوووت "سارے چوکیدار پھیلا رکھے تھے۔۔۔ وہ بھی ڈنڈے سوٹے والے نہیں بلکہ ہر طرح کے کھلونوں سے مزین۔۔۔ کمپنی کا پلہ ہر لحاظ سے بھاری تھا، دکان کے اندر بھی اور باہر بھی۔۔۔ مگر ہوا کیا؟۔۔۔ ڈکیت اتنے ہی آرام سے آئے جیسے ہمارے ٹنڈوآدم والے شاپنگ سینٹر میں آئے تھے۔۔۔ بدمست ہاتھی کی طرح خوب وحشت دہشت پھیلائی۔۔۔ انہوں نے گلاب چنبیلی کے

مخصوص" پھولوں کو چن، ایک ایک پنکھڑی توڑ، بے رحمی سے مسل کر رکھ دیا۔۔۔" اس ڈکیتی میں کئی معصوم چوکیدار اپنی جان پر کھیل گئے اور انہوں نے ان ڈاکوؤں کو جہنم رسید کر دیا۔۔۔ مگر خود بھی جیتے نہ رہ سکے اور بالآخر پھولوں کے ساتھ مسلے گئے!

قصہ ختم پیسہ ہضم۔۔۔۔ مگر جاتے جاتے ایک انعامی سوال کا جواب بتاتے چلیں۔۔۔ کہ ان تینوں واقعات میں قصوروار صرف ڈکیت تھے یا کوئی اور بھی قصوروار کہلائے گا؟۔۔۔ پہلے واقعے میں تو چوکیدار ایک ہی تھا، جس کو مار پیٹ کر اور ڈیوٹی کے دوران نشہ کرنے پر تبدیل کر دیا گیا۔۔۔ رہے یوسف بھائی؟۔۔۔ تو ان کی کوئی گل نہیں۔۔۔ انہوں نے اگلے سیزن میں ہی ساری کسر نکال لی۔۔۔ دوسرے واقعہ کو تمام بہنوں اور بھائیوں کے فیصل بھائی پی گئے۔۔۔ مہربان باس نے نقصان جو پورا کر دیا تھا!۔۔۔ مگر۔۔۔ مگر تیسرے واقعے میں ان ڈکیتوں نے جو لوٹا جو پھولوں کو مسلا۔۔۔ وہ نقصان کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔۔۔ پھول اب کبھی دوبارہ نہ کھلیں گے۔۔۔

تو اس کمپنی کو سوچنا نہیں چاہیے کہ چوکیداروں میں سے یا دکان کے عملے میں آخر کون آستین کا سانپ ہے؟۔۔۔ اگر نہیں تو پھر دکان کے مالک کے دیے جانے والے اتنے بھاری معاوضے کس کھاتے میں جائیں گے؟

کیا کہا؟؟۔۔۔ جواب نہیں معلوم !۔۔۔ ہاہاہا۔۔۔ چلو کوئی گل نہیں۔۔۔ لیکن میرے ساتھ ایک کام ہی کرتے جاو پھر۔۔۔ ڈی پی کالی کرتے جاو۔۔۔ عورتوں کی طرح کوسنے دیتے جاو۔۔ آو ان پر لعنت تو کرو۔۔۔

ان پر، ان کے معاونین پر، ان کے حمایتیوں پر قیامت کی صبح تک۔۔۔ اللہ کریم کی لعنت ہو بے شمار۔۔۔ بے شمار!

نوٹ: ایک بار پھر عرض ہے کہ تینوں واقعات سچے ہیں۔ انہیں حالات حاضرہ پر منطبق کرنے والا خود ذمہ دار ہے اور کسی بھی قسم کی مماثلت محض اتفاقیہ ہو گی۔

!کائنات کی بدترین دہشت گردی فیس بک پر

ایک منٹ کے لیے فرض کر لیجیے ۔۔۔ میں ایک پوسٹ ابھی ایسی لکھ کر اپ لوڈ کر دوں، جس میں سانحہ پشاور میں شہید ہونے والے معصوم بچوں اور ان کے والدین کا مذاق اڑایا گیا ہو۔۔۔ جو درندے انہیں مارنے آئے تھے، ان کی پرزور حمایت کی گئی ہو اور ان کی درندگی کو جواز فراہم کیا گیا ہو۔۔۔ ساتھ ہی فوج کا، خفیہ ایجنسیوں کا مضحکہ بھی اڑایا جائے۔۔۔ تو ذرا بتایئے تو کیا ہو گا؟۔۔۔ کیا کسی کو اس امر میں شک ہے کہ مجھے کل کی رات اپنے گھر پر نصیب نہ ہو گی۔۔۔ کیوں؟۔۔۔ کیوں کہ میں نے ظالموں کا ساتھ دیا۔۔۔ میں نے معصوم بچوں کے قاتلوں کی حمایت کی اور۔۔۔اور میں نے اپنی عزت مآب فوج کی شان میں گستاخی کی۔۔۔!

مگر ابھی ابھی میں نے جو دیکھا ہے۔۔۔ دنیا کے غلیظ ترین جملے جو میں نے پڑھے ہیں۔۔۔اس کے بعد حق تو یہ تھا کہ میں زندہ نہ رہتا۔۔۔ لیکن یہ تو غیرت والوں کے کام ہیں، اپنی غیرت تو کب کی مر چکی۔۔۔ جی ہاں ابھی یونہی پھرتا پھراتا میں ایک پیج پر پہنچا تو وہ دین بیزار بلکہ دین کا مضحکہ اڑانے کے لیے بنایا گیا ایک پیج تھا۔۔۔ پہلی ہی پوسٹ وہ نظر پڑی جس میں وجہ کائنات، سیدالبشر، امام الانبیاء، فداہ روحی وامی وابی پیارے نبی حضور

اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں وہ گستاخی پڑھی ہے اور کمنٹس میں وہ الفاظ دیکھے ہیں کہ ۔۔۔ میں گویا سکتے میں آگیا ہوں۔۔۔ کیا ایسا بھی ممکن ہے۔۔۔ نعوذ باللہ ثم نعوذ باللہ ننگی گالیاں معاذ اللہ۔۔۔ مجھے ابھی تک حیرت ہے اپنے اللہ جل شانہ کے حلم پر۔۔۔ کہ ابھی تک نہ زمین پھٹی ہے نہ آسمان گرا ہے۔۔۔ وہ خاکے جو کفار ملعونوں نے بنائے۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس بدترین گستاخی کے سامنے پر کاہ کی حیثیت بھی نہیں رکھتے ہوں گے۔۔۔ اور پھر وہ کفار تو نسلی کافر ہیں۔۔۔ یہ مسلمانوں کے نام والی ایک کتیا ہے جس نے وہ پوسٹ کی ہے۔۔۔ اور نیچے کمنٹس کرنے والے بھی مسلمانوں جیسے نام والے خنزیر ہیں۔۔۔ (یہ بات لکھتے ہوئے میں کتوں اور خنزیروں سے شرمندہ ہوں کہ شیطانوں کو ان سے مشابہت دے رہا ہوں۔۔۔ ورنہ درحقیقت ان بے زبان معصوم جانوروں کی بھی اس میں توہین ہے۔۔۔!)

2013 میں، میں نے روزنامہ اسلام میں ایک قسط وار کالم پاکستانی ملحدین کے بارے میں لکھا تھا، اس کی تحقیق کے دوران بھی مجھے وہ کچھ دیکھنا پڑا تھا کہ اس کا تصور بھی کبھی نہیں کیا تھا۔ اس وقت مجھ پر انکشاف ہوا کہ اردو زبان میں اللہ جل شانہ اور پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کائنات کی جو بدترین گستاخی بلاگز اور سوشل میڈیا پر ہو رہی ہے، وہ دنیا میں کہیں نہیں ہو رہی۔۔۔ یہاں نیٹ کے محفوظ قلعے میں بیٹھے کائنات کے بدبخت ترین

گستاخ رسول الحاد و زندقہ پھیلا کر سادہ لوح اور کم علم نوجوانوں کے ایمان پر جس طرح شبِ خون مار رہے ہیں، اس کا عام علماء کرام تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مغرب اور کفار گستاخی میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں۔ اور یہ سب کہاں ہو رہا ہے، اسی پاکستان میں جہاں دعوے کیے جا رہے کہ "مذہبی دہشت گردوں" کے اب دن گنے جا چکے ہیں ۔۔۔ مگر اے دوستو! کیا حضور کی شان میں گستاخی بدترین مذہبی دہشت گردی نہیں ہے؟۔۔۔ جس پیج پر میں نے ابھی وہ غلیظ پوسٹس دیکھی ہیں، ان کو اپ لوڈ کرنے والوں کی وال پر جا کر دیکھا تو وہاں ان کے شہر بھی مینشن ہیں، ایک خبیث شیطان لاہور سے تعلق رکھتا ہے۔ معمولی سی تگ و دو سے سائبر کرائم والے ان خبیثوں کے گھر تک پہنچ سکتے ہیں۔۔۔ مگر نہیں ۔۔۔ شاید یہ کسی کی بھی ترجیح میں شامل نہیں ہے!۔۔۔ شیطان کے پجاری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی، آپ کی بیویوں اور صحابہ کی ناموس پر حملے کرے، تو صبر کی تلقین۔۔۔ مگر جب ایک مسلمان اضطراری حالت میں قانون کو ہاتھ میں لے تو۔۔۔۔ مذہبی دہشت گرد!

یہ چند جملے میں نے اس لیے لکھے کہ کوئی ساتھی بتائے گا کہ سائبر کرائم والوں کو اس طرف کیسے متوجہ کیا جا سکتا ہے؟۔۔۔ کیوں کہ خود سے یہ لوگ نہ ان بلاگز کو بند کریں گے نہ فیس بک پیجز کو۔۔۔ کیا کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے۔۔۔ کہ ہم سب مل کر کچھ کر سکیں۔۔۔ فوجی عدالتوں اور ایجنسیوں تک

کائنات کی یہ بدترین دہشت گردی پہنچا سکیں؟؟؟
اس کے ساتھ جیسا کہ میں نے کچھ دن پہلے دوستوں سے عرض کیا تھا کہ پندرہ بیس دن
کے لیے فیس بک سے چھٹی لے

سنپولیے

کیا آپ نے کبھی دیکھا یا سنا کہ بچھو نے ڈنک مارنا یا سانپ نے زہر اگلنا چھوڑ دیا ہو؟ آپ بھوکے سانپ کو کتنا ہی دودھ پلایئے، اس کی سیوا کیجیے مگر وہ بدلے میں آپ کو ڈسے گا ہی!...اور اس میں تعجب کی کوئی بات ہے بھی نہیں، کیوں کہ سانپ کے پاس آپ کو دینے کے لیے زہر ہی ہے...زہر اگلنا اور دودھ پلانے والے کو ڈسنا اس کی فطرت میں ہے... بالکل اسی طرح انبیاء کرام کے ازلی دشمن اگر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اپنے دل کا بغض نکالیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں، کیوں کہ شیطان کو اور اس کے چیلوں کو اس کائنات میں سب سے زیادہ عداوت اور بغض آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی ہے۔ بھلا جن بد بختوں نے ایک دن میں ستر ستر انبیاء کرام کو شہید کیا ہو، اور جن کم بختوں نے اپنے نبی کی زندگی میں اور ان کے بعد بھی ان کی خوب توہین کی ہو... وہ رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم جو نبیوں کے سردار ہیں، سے کیوں نہ بغض رکھیں گے؟!

یہ کائنات کا سب سے غلیظ جرم جو پچھلے کئی برس سے مسلمان دیکھ رہے اور ان کے دل پارہ پارہ ہورہے... یہ جرم کوئی پہلی بار تو نہیں ہو رہا... خصوصاً اسی فرانس اور اسپین کا یہ منحوس خطہ (جہاں نعوذ باللہ سید البشر، محبوب خدا

فداہ امی و ابی کی شان میں بدترین گستاخی کی جا رہی ہے) اس حوالے سے نہایت مکروہ تاریخ رکھتا ہے کہ یہاں یہ جرم پہلی بار نہیں ہو رہا، بلکہ یہ وہ منحوس جگہ ہے جہاں پر توہین رسالت کی مہم مغربی تاریخ میں ایک تحریک کے طور پر سب سے پہلے شروع کی گئی۔ مغرب کی عیسائی تاریخ میں شاید سب سے زیادہ 'ولی' اسی خطے سے پائے جاتے ہیں اور ان سب کی وجہ شہرت یہی ہے کہ انہوں نے معاذ اللہ توہین رسالت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جی ہاں! نویں صدی عیسوی کی چھٹی دہائی میں اندلس میں مسیحی مذہبی رہنما سینٹ یولوجیس ملعون نے اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کر کے یقینی ولایت حاصل کرنے اور 'شہادت' کا مرتبہ پانے کی ایک باقاعدہ تحریک چلائی تھی۔ اس وقت اندلس (موجودہ اسپین) پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ عیسائی مرد وزن کے گروہ کے گروہ مذہبی جذبے سے سرشار ہو کر آتے اور رسول اللہ کی توہین کرتے۔ اس میں ہر عمر کے افراد شامل تھے۔ بارہ سال کے بچوں سے لے کر بوڑھوں تک۔ یہاں تک کہ تاریخ دان لکھتا ہے: ''عیسائیوں کے گروہ در گروہ قضا کی عدالتوں کے سامنے آتے اور ببانگ دہل توہین رسالت کرتے، دربان ان کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے تھک جاتے اور اہلکار جان بوجھ کر کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے، تاکہ ان کی آوازیں نہ سننی پڑیں۔ اس وقت کئی مسیحیوں کو اس جرم کی پاداش میں موت کے گھاٹ اتارا گیا، جو بعد میں عیسائی تاریخ کے 'ولی' کہلائے جن میں 48 تو بہت مشہور ہیں۔

خدا کی پناہ... وہ جو رحمۃ اللعالمین بنا کر بھیجے گئے، وہ جن کی بشارت خود حضرت مسیح علیہ السلام بارہا سنا گئے، وہ جن کے لائے دین کی برکت سے یہ زمین آسمان قائم ہیں، ان کی شان میں گستاخی 'ولایت' کی شرط قرار پائے؟ یاللعجب!

جی ہاں! یہ ولایت تو ہے مگر ولایت الٰہی نہیں بلکہ ولایت شیطان ہے۔ انصاف پسند معتدل مزاج عیسائی دانشوروں اور مذہبی رہنماؤں نے خود ہمیشہ اس خبیث سوچ کی مخالفت کی، مگر بدبخت سنپولیے زہر اگلنے سے باز نہیں آتے۔ گاہے بگاہے وہ آزادی اظہار رائے کے نام پر سیدالانبیاء کی شان میں گستاخی کرکے گویا چاند پر تھوکنے کی کوشش کرتے ہیں جو بالآخر انہی کے منہ پر آگرتا ہے... کیوں کہ نبی پاک علیہ السلام کی شانِ اقدس پر اس شیطنت سے کچھ فرق نہیں آتا... ہمارا ایمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں کوئی گستاخی کر ہی نہیں سکتا... ایک نالی کا کیڑا آسمان کی شان میں کیا بکواس کرتا ہے یا کتے کے پلے چاند پر کیا بھونک سکتے ہیں؟ لیکن یہ ضرور ہے کہ یہ توہین دنیا کے ہر مسلمان کے ایمان کو گالی ضرور ہے... اور اس بار یہ گالی ڈنکے کی چوٹ پر دی گئی ہے... پہلے کبھی بھی گستاخی کرنے والوں کے ساتھ وہ اظہار یکجہتی نہیں ہوا، جس کا مظاہرہ دنیائے کفر نے اس بار کیا ہے... اب گستاخوں کے ساتھ گویا

ساری دنیائے کفر خم ٹھونک کر کھڑی ہو گئی ہے!... اور کس بات پر؟... فرانس میں گستاخی کرنے والے اخبار کے دفتر پر ہونے والے حملے کے بعد جہنم رسید ہونے والے افراد کے غم میں ...لاکھ دو لاکھ نہیں، 16 لاکھ افراد کی ریلی نکالی گئی ...اوراس ریلی میں دنیاکے 40 ممالک کے حکمران ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر شریک ہوئے ... مگر جیسا کہ عرض کیا یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، انتہائی تعجب کی بات تو یہ ہے کہ اس ریلی میں جس میں کئی شرکاء نے ہاتھوں میں ان خاکوں کو اٹھایا ہوا تھا، چند نام نہاد مسلمان حکمران بھی کفار کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر شامل ہوئے!... اس سے گستاخان رسول کو ایسی شہہ ملی کہ انہوں نے دوبارہ گستاخانہ خاکے والے میگزین شایع کیے اور وہ بھی ریکارڈ تعداد یعنی 30 لاکھ کاپیاں چھاپی گئیں۔

صرف یہ حکمران ہی نہیں، ہمارے ملک کے وہ لوگ جو خود کو فخر سے لبرل اور سیکولر کہتے ہیں، ان پر بھی گویا غموں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ...گستاخانِ رسول کے قتل پر موم بتیاں جلا کرخاموشی اختیار کی جارہی ہے اور انسانیت کی دہائی دے دے کر ان کے حق میں مضامین لکھے جارہے ہیں۔ نجانے اس وقت ان کا انسانیت کا بھاشن کہاں چلا جاتا ہے؟ جب دنیا بھر میں مظلوم مسلمانوں پر کفار بھوکے بھیڑیوں کی طرح یلغار کرتے ہیں...یہ وسطی افریقہ کے مسلمان کیا انسان نہیں ہیں؟... جنہیں سرعام سڑکوں پر بے دردی سے گاجر مولی کی طرح کاٹا جارہا ہے...

نفرت کا یہ عالم ہے کہ ان مظلوم شہداء کو مرنے کے بعد بھی بخشا نہیں جاتا، بلکہ ان کی نعشوں کو پیٹرول چھڑک کر جلا دیا جاتا ہے ...سب جانتے ہیں کہ یہ جنونی قاتل عیسائی مسلح ملیشیا کے لوگ ہیں، اور یہ بھی سب جانتے ہیں کہ فرانس کے فوجی اس گھناؤنے عمل میں قاتلوں کے پشتیبان بنے ہوئے ہیں ...لیکن کسی کے پاس ان ہزاروں مظلوم مسلمانوں کے لیے ہمدردی کا ایک لفظ نہیں ہے۔اس وقت کسی کو انسانیت یاد نہیں آتی، کوئی ان مظلوموں کے لیے ایک شمع نہیں جلاتا... کیا اس وجہ سے کہ ان کا رنگ سفید نہیں کالا ہے؟ یا اس لیے کہ وہ ایک اللہ اور اس کے آخری رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نام لیوا ہیں؟!

آیئے گدھوں کے رینکنے پر لعنت بھیجئے اور انجم عباسی کی کہی اس نعت رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنے دل کو منور کیجیے

جلوے رخشندہ جہاں احمدِ مختار کے ہیں
ہم تو دیوانے اُسی شہرِ ضیاء بار کے ہیں
گلشنِ دہر ہے کیا باغِ اِرم کیا شئے ہے؟
کچھ مناظر ہی الگ کوچہَ دلدار کے ہیں
ضبط کی تاب نہیں، طاقتِ گفتار نہیں
زخم رسوا سرِ محفل، ترے بیمار کے ہیں
دل کے یوں داغ فروزاں ہوں کہ دنیا کہہ دے
یہ تو سودائی فقط احمدِ مختار کے ہیں

دیکھنے والو! با حیرت نہ انہیں تم دیکھو
داغ دامن پہ میرے دیدۂ خونبار کے ہیں
حوضِ کوثر سے غرض ہم کو نہیں ہے انجم
ہم طلبگار فقط شربتِ دیدار کے ہیں

خوف و دہشت کا ایک تاریخی کردار

خوف و دہشت کا ایک تاریخی کردار۔۔۔ ایوان چہارم

کل سے ابن کبیر کی لکھی روس کے سب سے پہلے زار ایوان چہارم کی روداد پڑھ رہا ہوں اور حیران ہوں کہ تاریخ کے جھروکوں میں جھانکنے سے کیسے کیسے کردار سامنے آتے ہیں۔ اس خونخوار مکروہ بھیڑیے کو آج بھی دنیا" خونخوار ایوان" (Ivan the Terrible) کے نام سے جانتی ہے۔۔۔ تاریخ داں اسے " جہنمی عفریت" کہہ کر بھی پکارتے ہیں، اس کی سب سے بڑی انفرادی خاصیت اس کی سفاکیت تھی، جس کے قصے پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں! آج ماہرین متفق ہیں کہ اس وقت دنیا میں جتنے ظلمو وحشت کے طریقے رائج ہیں۔۔۔ان میں سے بیشتر ایوان چہارم کے خبیث ترین دماغ نے سوچے۔

1570ء کا سال تھا۔۔۔ یہ سال روس کے شہر نووگوراڈ کے لیے ایسی بدنصیبی لے کر آیا کہ آج تک اس دن کی روداد سننے والے انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں۔ اس دن مکروہ خونخوار بھیڑیا اس شہر کے مردوں عورتوں اور بچوں کے لیے قہر بن کر

نازل ہوا۔

اس دن نووگوراڈ میں گھستے ہی ایوان کے فوجی وہاں کی عورتوں پر جھپٹ پڑے۔ ان سے بچے چھین کر زمین پر پٹخ دیے۔ ان کے کپڑے تار تار کر دیے اور ان کے ساتھ اجتماعی آبرو ریزی کے بعد انہیں بے دردی سے قتل کر دیا گیا۔ انھوں نے بوڑھوں کو سڑکوں پر گھسیٹا، پھر ان کے سر قلم کر دیے۔ شہر کے شرفاء اور رئیسوں کو برہنہ کرکے بازاروں میں گھمایا گیا، ان پر کوڑے برسائے گئے پھر نہایت ہی وحشیانہ طریقے سے ان کو قتل کیا گیا۔ اس دن مورخین کے مطابق تقریباً تیس ہزار افراد کو نہایت بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ لاشوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ پورے ایک ماہ گدھ اس تباہ حال بستی پر منڈلاتے رہے۔ وہ گوشت نوچ نوچ کر تھک گئے اور کئی کے پیٹ تو اتنا بھر گئے کہ پھر وہ اڑ ہی نہ سکے۔ بعد میں اس شہر کو دوبارہ آباد کرنے میں برسوں لگ گئے مگر تعفن اتنا تھا کہ کئی سال تک لاکھوں روبل خرچ کرنے کے باوجود یہ بدبو کسی آسیب کی طرح اس شہر میں بسی رہی۔

سفاکیت کا یہ مظاہرہ تو عمومی طور پر فوجیوں نے کیا۔ مگر ایوان چہارم کی جبلت اس سے کہاں تسکین پا سکتی تھی۔ اس نے وہاں سے واپسی میں ماسکو میں اپنے مخالفین کو گرفتار کروایا۔ اور ان کی سزاوں کے لیے ایک میدان میں پنڈال

سجایا گیا۔ اس سے پہلے دو دن تک صرف نت نئی وحشیانہ سزاوں کو سوچا گیا۔ جو درباری ایسی سزا سوچتا جس میں زیادہ سے زیادہ شقاوت ہو، اس کو خصوصی اعزاز دیا جاتا۔

ایک نواب کو کپڑے اتار کر الٹا لٹکا دیا گیا۔ پہلے جسم کے نازک حصے کاٹے گئے، مگر اس دوران اس بات کا خاص اہتمام رکھا گیا کہ خون زیادہ نہ بہے کیوں کہ اگر شکار جلدی دم توڑ دیتا تو ظالم شکاری کے مکروہ جذبات کی تسکین کس طرح ہوتی! دھیرے دھیرے اس کے جسم کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے گئے۔ اس دوران شاہی طبیب مسلسل نگرانی کرتے رہے، پھر ابھی جان باقی تھی کہ اس کی کھال اتارنا شروع کی گئی۔ اور آخر کار اسے جلا دیا گیا۔ ایک سپہ سالار کو کھولتے ہوئے پانی میں ڈال دیا گیا۔ ایک نامور ادیب کے جسم کے نچلے حصے سے بانس داخل کیا گیا اور بانس کو سیدھا کھڑا کر دیا گیا۔ وہ شخص دھیرے دھیرے مرتا رہا۔ پرنس بورس نامی ایک شخص کے جسم میں میخیں گاڑ دی گئیں۔ اسے مصلوب کر دیا گیا اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے گھر کی عورتوں کی اجتماعی عصمت دری کی گئی۔ شاہی خزانچی بھی اس کے عتاب کا شکار بنا۔ اس کے جسم پر پہلے یخ بستہ پانی ڈالا جاتا اور پھر اسے سخت گرم پانی کے ٹب میں اتار دیا جاتا۔

اس گرم دوپہر ماسکو کے مرکزی میدان میں سو سے زاید انسانوں کو ایسے وحشت ناک انداز میں قتل کیا گیا کہ آسمان پر سیاہ کہرا چھا گیا اور زمین تھرانے لگی، مگر اس پورے عمل کے دوران میں ایوان کے مکروہ چہرے پر ایک خونخوار مگر آسودہ مسکراہٹ سجی رہی۔

ایوان کی خونخواری بچپن سے ہی ظاہر ہو گئی تھی۔ وہ کبوتروں کی گردن مروڑتا، زندہ مچھلیوں کو پیروں سے مسلتا، اپنے جانوروں، خرگوش، بھیڑوں، کتوں اور بلیوں کو محل کے سب سے بلند مینار سے پھینکتا اور جب وہ گولی کی رفتار سے زمین سے ٹکراتے تو ان کی ہڈیوں کے ٹوٹنے کی آواز اسے کئی گھنٹوں تک کے لیے مسرور کر دیتی۔

اس بھیڑیے کی ساری زندگی انہی مکروہ مشاغل میں گزری۔ بلا مبالغہ لاکھوں انسان اس کی درندگی اور وحشت کی بھینٹ چڑھے۔ اس کے تشدد کے اختیار کرنے والے طریقے آج با قاعدہ مختلف اصطلاحات کے ساتھ ایک قبیح فن کے طور پر پڑھائے جاتے ہیں۔ ایوان چہارم کو 18 مارچ 1584ء میں زہر دے دیا گیا۔ یوں زمین ایک عفریت کے بوجھ سے آزاد ہوئی۔

تو دوستو! یہ ہے تاریخ انسانی کا ظالم ترین مذہبی شخص۔۔۔ کیوں کہ یہ بڑا

راسخ العقیدہ عیسائی تھا۔ اس کو پڑھتے ہوئے مجھے اپنے ڈکٹیٹر پرویز کا خیال آگیا کہ گویا پرویز بھی رعونت اور سفاکیت میں اس کا روحانی شاگرد تھا، خیر یہ تو ہوئی ایک شخص کی بات جو بدترین ڈکٹیٹر تھا۔ مگر یہ بات دھیان میں رہے کہ میری رائے میں بطور ریاست دنیا کی ظالم ترین حکومت امریکا اور پھر اسرائیل ہے، جب کہ ظالم ترین گروہ یہود یہ دراصل ایک ہی بات ہے، کیوں کہ امریکا اور اسرائیل پر صیہونی ہی حکومت کرتے) ہیں) ، دنیا کی ظالم ترین خفیہ تنظیمیں را، موساد، سی آئی اے اور ٹی پی ہیں،اور ظالم ترین ادارہ پنجاب اور سندھ پولیس ہے۔۔۔ آپ کیا کہتے ہیں؟